سالگرہ نمبر
Checked 1978
ہمایوں
بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر
حامد علی خاں۔ بی۔ اے
منصور احمد
جائنٹ ایڈیٹر

حضرتِ ہمایوںؒ (مرحوم) کی یاد میں

دُنیائے شجاعت کے رہبر اے روحِ ہمایوں اے شہِ دیں! دریائے صداقت کے گوہر اے آبِ فلک اے تا[illegible]

ایثار کا تُو مہ پارہ ہے ظلمت کی فضا کا شرارہ ہے تُو بامِ فلک کا تارا ہے ظاہر میں ہے گو تُو زیرِ زمیں

دنیا میں جو تیری ہستی تھی اک علم و عمل کی بستی تھی مے خانۂ حق کی مستی تھی یا نعرۂ روحِ عرش نشیں

دُنیا نہیں کچھ آرام کی جا دنیا ہے فقط اک کام کی جا دنیا میں یہ دی تُو نے ہی صدا محنت ہے دنیا [illegible]

تصویرِ قضا ہے قلبِ بشر ایوانِ خدا ہے قلبِ بشر ملتی ہے جزائے خیر و شر جنت ہے یہیں دوزخ [illegible]

دل وقف تھا تیرا اُن کے لئے جو خلقِ خدا کے رہبر ہیں جو حُسنِ عمل کا مظہر ہیں نظروں میں وہی ہیں تیری [illegible]

اک دن نہ کبھی آرام کیا، آفاق میں پیدا نام کیا قوت سے جہاں کو رام کیا جذبات کو کر کے [illegible]

مدہوشِ عمل تھا ہوش ترا خاموش ہمیشہ جوش ترا تحصیل پہ مائل گوش ترا تھا رخ پہ نہ داغِ چیں

تقدیر کی ظلمت کو تُو نے تدبیرِ خرد سے دور کیا پُرنور ہوئی تاریکیِ دل تابش سے تری اے ما[illegible]!

دریائے وطن کے سینے میں ہو کیوں نہ بپا طوفانِ جفا چھایا ہے اندھیرا سا ہر سُو کھویا تجھے جب سے دُنیا[illegible]!

ہے حرص و ہوا کے شعلے میں بے تاب بشیرِ زار و نزار
ٹھنڈی سی ہوائیں بھیج کبھی دنیا میں بھی اے جنت کے مکیں

سوداؔ کی ہجویہ نظمیں

دنیا کی ہر زبان میں جس میں ادب ہے، ہجویہ نظمیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح مدحیہ نظمیں بھی۔ تعریف اور مذمت کی موجبات انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ مثلاً اگر زید عمرو کے ساتھ احسان سے پیش آئے تو ضروری ہے کہ عمرو زید کے احسان کا شکریہ ادا کرے۔ اور اس کی تعریف کرے۔ برخلاف اس کے اگر عمرو کو زید کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو بالضرور عمرو زید کو غصّے کی نظر سے دیکھے گا۔ اور زبان سے اس کی برائی ظاہر کرے گا۔ ایسے نیک نفس انسان دنیا میں بہت کم ہیں۔ اور وہ صرف صوفیہ میں ہیں کہ دنیا کے لوگ ان کو کیسی ہی ایذا پہنچائیں وہ کبھی ٹس سے مس نہ ہوں۔ اور انتقام کا جوش ان کے دل میں پیدا نہ ہو۔

ہجو و مذمت کے نفسیاتی محرکات بہت سے ہیں۔ مگر حسبِ ذیل محرکات زیادہ اہم ہیں۔

(۱) حسد۔

(۲) حد سے زیادہ کنجوسی۔

(۳) حد سے زیادہ حرص

(۴) مذہبی اختلاف۔

(۵) اظہارِ فخر۔

(۶) ریا و نفاق۔

(۷) جوشِ انتقام۔

(۸) ایذا رسانی

جب ایک شخص اپنے اقران و امثال سے علم و فضل میں یا دولت و ثروت میں یا عزت و حشمت میں بڑھ جاتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے رتبے کو حاصل نہیں کر سکتے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کی نسبت بدگوئیاں کرتے ہیں۔ ایسی کمزور فطرت کے انسان ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔

حد سے زیادہ کنجوسی اور حد سے زیادہ حرص بھی لوگوں کو مخالفت اور بدگوئی پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ریا اور نفاق بھی اُن اخلاقِ ذمیمہ میں سے ہیں جن کو ابنائے زمانہ نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اپنے تئیں مقدس اور نیک ظاہر کرتے ہیں

مگر اُن کے باطنی اخلاق اُن کے دکھاوے کے مطابق نہیں ہوتے ہمیشہ شاعروں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔

جب ایک شخص دوسرے شخص کے مقابلے میں یا ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں فخر کا اظہار کرتی ہے تو اس شخص یا قوم کے عیوب تلاش کئے جاتے ہیں۔ اور اس غرض سے کہ وہ شخص یا قوم نظروں سے گر جائے۔ اس کے عیوب کا اعلان کیا جاتا ہے۔ عرب جاہلیت کی شاعری میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

مذہبی اختلاف کی صُورت میں ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ تعصب کا اظہار کرتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی بدگوئی پر کمر باندھ لیتے ہیں۔ مذہبی مباحثوں میں ایسی نظمیں یا نثریں بار بار لکھی گئی ہیں۔

انتقام تو ایک فطری جذبہ ہے جو ہر انسان کی طبیعت میں موجزن ہوتا ہے۔ اگر زبان یا ہاتھ سے ایک شخص دوسرے شخص کو ضرر پہنچائے تو وہ اس سے انتقام لینے پر مائل ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی مادّی ضرر اُس کو نہ پہنچا سکے تو کم سے کم زبان سے تو اس کی بدگوئی ضرور کرتا ہے۔

ایک شخص جو دولت یا حکومت رکھتا ہے اگر اُس کے ہاتھ سے لوگ تنگ ہوں اور لوگوں کو اُس کی طرف سے تکلیفیں پہنچتی رہتی ہوں تو کوئی نہ کوئی شخص علی الاعلان اُس کی ہجو و مذمت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ گو کہ اُس خاص شخص کو اس کے ہاتھ سے کوئی ضرر نہ پہنچا ہو۔

شاعر بھی ایک انسان ہے۔ اس کے دل میں بھی وہی جذبات ہیں جو تمام انسانوں کے دل میں ہیں۔ جب کوئی ایسا محرک اس کی طبیعت میں پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی اپنی زبان و قلم سے کام لیتا ہے۔ مگر شاعر کے انداز بدگوئی اور عام انسانوں کے اندازِ بدگوئی میں فرق ہونا چاہئے۔ اگر شاعر عام انسانوں کی طرح گالی گلوج بکنے لگے تو نثر اور نظم کے سوا دونوں میں کوئی امتیاز نہ ہوگا۔ شاعر کے لئے حسبِ ذیل شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا اُس کے لئے ضروری ہے۔

(۱) شوخی اور ظرافت ہو۔ مگر فحش و دشنام سے زبان آلودہ نہ کی جائے۔

(۲) جسمانی اور پیدائشی عیب بیان نہ کئے جائیں۔

(۳) صرف وہ اخلاقی عیوب بیان کئے جائیں جن کو دنیا جانتی ہو اور گرد و پیش کے لوگ اُن کا انکار نہ کر سکیں بلکہ اُن کی تصدیق کریں۔

(۴) ہر برائی جہاں تک ممکن ہو تعریض و کنایہ کے پیرائے میں بیان کی جائے۔ تصریح و تفصیل سے کام نہ لیا جائے۔

(۵) اگر قوتِ متخیلہ سے کام لیکر بیان کے نئے نئے پہلو پیدا کئے جائیں تو ایسی ہجو بلاغت کا درجہ حاصل کرلیتی ہے۔

(۶) مبالغہ جو دائرۂ فطرت سے خارج ہو عام طور پر شاعری میں نامقبول ہے مگر ہجو یہ نظموں میں اسکی اجازت ہے اور ایسے مبالغہ پر لوگوں کو ہنسنے ہنسانے کا موقع ملتا ہے۔

اردو شاعری میں ناجی۔ ضاحک۔ فدوی۔ بقا۔ انشا اور مصحفی نے ہجو یہ نظمیں لکھی ہیں۔ مگر سودا کے برابر کسی کی شہرت نہیں ہوئی۔ سودا نے جس طرح قصیدوں میں مدح کا کمال دکھایا ہے۔ اسی طرح وہ ہجو گوئی میں بھی طاق ہے۔ مدح اور قدح دونوں میں اُن کی لیاقت مسلّم ہے مگر ہجو گوئی کی جو شرطیں بیان کی گئی ہیں اُن کے معیار پر سودا کا کلام پورا نہیں اترتا۔ تاہم اُن کی ہجو یہ نظموں میں جو شوخی اور لطافت جابجا پائی جاتی ہے۔ اسکے لحاظ سے اُن کی خاص ہجو یہ نظمیں یا بعض نظموں کے حصّے آج بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں سودا کی ہجو یہ نظموں کا خلاصہ وضاحت کی غرض سے نثر میں پیش کروں گا۔ سودا کا دیوان ہر جگہ ملتا ہے۔ ان نظموں کو سب لوگ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

قصائد میں ایک متعصّب شخص کی ہجو پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ جس کے قافیے درخشانی نورانی وغیرہ ہیں۔ اس سے متصل مولوی ساجد کی ہجو ہے۔ جس کے قافیے الحاد اور فولاد ہیں۔ ان دونوں نظموں میں مذہبی تعصب کی جھلک ہے اس لئے وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔

تیسری ہجو گھوڑے کی ہے جس کے قافیے ہیں سوار اور شمار۔ سودا نے اپنے اس قصیدہ کا نام تضحیک روزگار رکھا ہے۔ یہ قصیدہ اپنی شوخی اور لطافت ہی کی وجہ سے اہم نہیں ہے۔ بلکہ سودا نے اس میں اپنے زمانے کے فوجی نظام کی خرابی بھی ضمناً بیان کی ہے اِس لحاظ سے بھی اس قصیدہ کو اہمیّت حاصل ہے۔

تمہید سودا نے یوں اٹھائی ہے کہ آج کل زمانے کی حالت بدلی ہوئی ہے جن لوگوں کے طویلے میں عراقی اور عربی گھوڑے بندھے رہتے تھے آج کل وہ اس قدر مفلس ہوگئے ہیں کہ موچی سے اپنی جوتی ادھار کے طریقے پر گٹھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی ہیں جو مفلس تو نہیں ہیں مگر کنجوسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ایسے ہی ایک دوست ہمارے ہیں (نام نہیں لیا) وہ اس قدر بخیل ہیں کہ اگر کوئی شخص نہار منہ اُن کا نام لے تو شاید دن بھر اُسے کھانا نہ ملے۔ سو روپیہ اُن کی تنخواہ ہے۔ مگر گھوڑا جو اُن کے پاس ہے دانہ گھاس سے محروم ہے۔ اُسکی خبر گیری کے لئے کوئی سائیس بھی نہیں رکھا۔ یہ گھوڑا مٹی کا کھلونا ہے جو شیر خوار بچّوں کے ہاتھ میں دیکھا جاتا ہے۔ فاقوں

سے اُس کے ضعف کا یہ حال ہے کہ اگر وہ زمین پر بیٹھ جائے تو پھر اپنی نعل کے نقش کی طرح زمین سے بغیر مٹائے نہیں اٹھ سکتا۔ اگر اُس کا سوار کبھی بازار جا نکلتا ہے تو قصاب پوچھتے ہیں کہ آپ ہمیں کب یاد کریں گے۔ اور اُدھر چمار کہتے ہیں جناب! ہم بھی امیدوار ہیں۔ آگے شاعرانہ انداز سے کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا رات کے وقت تاروں کو دانے سمجھ کر بے قراری کے ساتھ آسمان کو دیکھتا ہے۔ اور دن کے وقت سورج کی شعاعوں کو گھاس کا مٹھا سمجھ کر بار بار زمین پر سر پٹکتا ہے۔ وہ اس قدر ضعیف ہے کہ اگر اُس کے تھان کی میخیں مضبوط نہ ہوں تو عجب نہیں کہ ہوا کے جھونکے سے اڑ جائے۔ اُس کے جسم میں نہ ہڈی ہے نہ گوشت۔ سانس اُس کے نتھنوں سے اِس طرح نکلتا ہے گویا کوئی لہار اپنی دھونکنی دھونک رہا ہے۔ خارش کے سبب سے اس کے بدن پر زخم ہیں۔ اِس لئے کوئی نہیں پہچان سکتا کہ وہ ابلق ہے یا سبز رنگ ہے۔ زخموں پر جو مکھیاں کثرت سے بیٹھتی رہتی ہیں اس لحاظ سے لوگوں نے اُس کا رنگ مگسی قرار دیا ہے۔

مجھے ایک دن کسی ضرورت سے کہیں جانا تھا۔ یہ دوست میرے ہمسائے میں رہتے ہیں۔ میں نے گھوڑا اُن سے مستعار لینا چاہا۔ انہوں نے فرمایا کہ ایسے ہزار گھوڑے تم پر نثار ہیں، مگر یہ اس قابل نہیں کہ کوئی اس پر سوار ہو سکے۔ یہ تو تھان پر لاتیں مارتا رہتا ہے۔ یہ حشری گھوڑا اس قابل البتہ ہے کہ اگر دجال قیامت کے قریب نمایاں ہو تو اسے گدھا جان کر اس پر سوار ہو۔ ہر وقت زمین پر سر جھکائے رہتا ہے۔ اپنی ہی ٹھوکروں سے اس کے سب دانت جھڑ گئے ہیں۔ اس بڈھے گھوڑے کی عمر وہی شخص بتا سکتا ہے جو بیابان میں ریت کے ذروں کو گن سکے۔ تاریخ کی رو سے البتہ میں کہہ سکتا ہوں کہ شیطان اسی پر سوار ہو کر جنت سے نکلا تھا۔

اس کی چال کی سستی کا بیان مالک کی زبان سے سودا نے اس طرح کیا ہے۔

کم رَو ہے اسقدر کہ اگر اس کی نعل کا ۔۔۔ لوہا گلا کے تیغ بنائے کوئی لُہار

ہے مجھ کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ ۔۔۔ رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں ۔۔۔ جز دستِ غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

ایک دن یہ گھوڑا ایک برات میں مستعار لیا گیا تھا دولہا جو اُس پر سوار ہو کر دلہن کے گھر کی طرف چلا نوجوان تھا۔ مگر دلہن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے بوڑھا ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے جو سننے کے قابل ہے۔ جب مرہٹوں کی فوج دہلی پر حملہ آور ہوئی تو شاہی نقیب دیگر سواروں کی طرح میرے پاس بھی آیا۔ اور اس نے کہا۔ مدت سے گھر بیٹھے مفت تنخواہ لے

رہے ہو۔ اب کام کا وقت آیا ہے۔ اس پر سوار ہو کر میدانِ جنگ کو جاؤ۔ مجبورًا میں نے اُس کی پشت پر زین رکھا اور ہتھیار باندھ کر سوار ہوا۔ مگر اُس دن کی کیا حالت بیان کروں۔ خدا دشمن کو بھی ایسا ذلیل نہ کرے۔ میرے دونوں ہاتھ میں چابک تھے۔ منہ میں باگ تھی۔ ایڑیاں ٹک ٹک کرنے سے زخمی ہوگئی تھیں۔ آگے سے سائیس تو بر ادکھاتا تھا۔ پیچھے سے نقیب لکڑی مارتا تھا۔ مگر وہ نہ ہلتا تھا نہ چلتا تھا۔ عام لوگ اس تماشے کو دیکھ کر جمع ہوگئے۔ کوئی کہتا تھا۔ میاں پہیے لگاؤ پہیے۔ کوئی کہتا تھا اگر ناؤ کی طرح بادبان لگا کر چھوڑ دو تو ہوا کے زور سے یہ آپ چل پڑے گا۔ کوئی اُسے پہاڑی بکری بناتا تھا کوئی ولایتی گدھا قرار دیتا تھا۔ کوئی کہتا تھا میاں تم سے کیا گناہ ہوا ہے۔ جو کوتوال نے تمہیں اس گدھے پر سوار کیا ہے۔ طرفہ یہ کہ اُس روز اتفاق سے ایک دھوبی اور ایک کمہار کا گدھا کھویا گیا تھا۔ دونوں وہاں آنکلے ہر ایک نے اُس کو اپنا گدھا خیال کیا۔ دھوبی کان پکڑتا تھا اور کمہار اُس کی دم کھینچتا تھا۔ بازار کے لڑکے اُسے ریچھ سمجھ کر تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہوگئے۔ ایک شریر لڑکے نے کہا کہ تو اگر مجھے بھی اس پر چڑھا دے تو میں تجھے ایک ٹکا دوں گا۔ کتے اُس کے گرد و پیش جُدا بھونک رہے تھے۔ میں اپنی مصیبت پر رو پڑا۔ خدا سے کہا کہ اب میں دھوبی اور کمہار سے جھگڑوں یا لڑکوں کو جواب دوں۔ کتوں سے لڑوں یا اپنا سر پیٹوں۔ خدایا میری اس حالت پر رحم کر۔ بارے میری دعا قبول ہوئی اور میں کسی نہ کسی طرح میدانِ جنگ میں جا پہنچا۔ میں نے اُس وقت دعا کی کہ الٰہی جو گولہ پہلے میدان میں چلے وہ اس گھوڑے کے آلگے اور اس کا کام تمام کر دے۔ میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک مرہٹہ سپاہی میرے مقابلے میں آپہنچا۔ گھوڑا تو پہلے ہی بے کار تھا جب میں حریف پر ڈپٹ کر حملہ کرتا تھا تو مجھے اپنے پاؤں ہی سے دوڑنا پڑتا تھا۔ جس طرح کوئی لڑکا جو لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو خود ہی کودتا اچھلتا ہے۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو ناچار جوتیاں ہاتھ میں لیں اور گھوڑا بغل میں مار وہاں سے بھاگ نکلا۔

مثنویوں میں چند ہجویہ ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی میں شیدی فولاد خاں کی ہجو ہے۔ جو دہلی کا کوتوال ہو گیا تھا۔ یہ رشوت خوار تھا۔ اس کے زمانے میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ سودا کہتے ہیں کہ آجکل شہر میں چور ٹھگ اور اچکے دکھائی دیتے ہیں۔ چاوڑی بازار کی جو حالت آج کل ہے اُس کے سامنے تراوڑی کی رہزنی بات ہے۔ خاص بازار والوں نے تو نزدیک والوں کے بھی کان کاٹ لئے ہیں۔ اگر کوئی دمڑی کا سودا لینے بازار جاتا ہے تو پگڑی کھو کر سر پیٹتا آتا ہے۔ چور۔ اچکے۔ ٹھگ۔ سب کوتوال سے ملے ہوئے ہیں۔ رات کو جب وہ گشت کے لئے نکلتا ہے تو نرسنگا بجانے والا گویا چوروں سے کہتا ہے کہ صبح کو کوتوال کا حصہ پہنچا دینا۔ ایک دن کوتوال نے طنز کے طور پر بدمعاشوں سے کہا کہ تم میری چیزیں بھی لے جاتے ہو۔ اور بازار میں اُن کو بیچ ڈالتے ہو۔ آیندہ ایسا کرو کہ میری چیز کی جو قیمت بازار

میں لگے وہ چیز اسی قیمت پر میرے ہاتھ بیچ دیا کرو۔ یہ سُن کر ایک نے کہا کہ آپ کے سر پر جو پگڑی ہے مجھے اس کے دس روپیہ ملتے ہیں۔ آپ اُس کی کیا قیمت لگاتے ہیں۔ دوسرے نے کہا میں آپ کا دوشالہ چرانے کے لئے رات بھر جاگا ہوں۔ میری محنت پر نظر کر کے جو کچھ مناسب سمجھیں آپ دے ڈالیں۔ غرضکہ اس کوتوال کے سبب سے شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ رات کو نرسنگا کیا پھکتا ہے گویا صورِ اسرافیل ہے۔ مردے بھی خواب عدم سے چونکتے ہیں۔ چوروں کے ڈر سے فتنہ بھی جاگتا رہتا ہے۔ چاند کی آنکھ بھی رات بھر کھلی رہتی ہے شام کے وقت شمع سے بھی چور آلگتا ہے (شمع کے ایک طرف سے گھل جانے کو چور کہتے ہیں) شمع کے طرہ کا ذکر ایک طرف۔ آفتاب کی دستار بھی رات کے وقت گم ہو جاتی ہے۔ شبنم جو صبح کے وقت پھول پر ہوتی ہے وہ بھی غنچے کے بقچے کو روتی ہے۔ جو گم ہو گیا ہے آئینہ بھی اپنے گھر کی چوکیداری کرتا ہے۔ خطرہ سے کوئی خالی نہیں ہے۔ اس لئے میخانے میں بھی ہائے وہو کا شور سنائی دیتا ہے۔ شیخ جی رات کو جاگتے رہتے ہیں۔ عبادت کے لئے نہیں بلکہ چوروں کے ڈر سے۔ اگر کوئی کوتوال سے چوروں کی شکایت کرتا ہے تو وہ ہنسکر کہتا ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔ چور سے کوئی جگہ خالی نہیں۔ کیا امیروں کے گھر میں چور محل نہیں ہے (داشتہ عورت جو منکوحہ نہ ہو اس کو چور محل کہتے ہیں) معشوقوں کے ہاتھ میں بھی مہندی کا چور ہے۔ (مہندی لگانے کے وقت جو سفیدی رہ جاتی ہے اس کو مہندی کا چور یا زردِ حنا کہتے ہیں) میں خود بھی جب مسندوں پر چڑھ کر جاتا ہوں تو وقت پر جی چراتا ہوں۔ کسی کی کوئی چیز اب کیونکر بچ سکتی ہے جب خدا کا گھر بھی چور سے خالی نہیں دیکھو مسجد کا ملا بھی صبح خیزیا ہے (وہ چور جو صبح کے وقت جنگل میں مسافروں کے جاگنے سے پہلے اُن کا مال و اسباب لے جاتا ہے صبح خیزیا کہلاتا ہے) چوری کا رتبہ آج کل اس قدر بلند ہے کہ آسمان کی چھت پر بھی کہکشاں کی کمند پھینکی گئی ہے۔

ایک مثنوی میں راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو کی ہے اس کی تمہید بھی دلچسپ ہے اور خاتمہ بھی معنی خیز ہے تمہید میں اپنے شاعرانہ سخن کو فیل معنی بتایا ہے فرماتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہمیشہ میرے ہاں بندھا رہتا ہے۔ سخن فہموں کا دماغ اس کے لئے گشت کا میدان ہے۔ وہ اس قدر پاک طینت ہے کہ خاک پر پاؤں نہیں رکھتا۔ سبک رفتاری کا یہ حال ہے کہ کاغذ پر جہاں تک دوڑاؤ دوڑتا چلا جاتا ہے۔ لوگ جو آفرین کرتے ہیں یہ اُس کے دئے آوازدار ہے۔ جلالتِ شان کے سبب وہ اپنی مستک پر سیندور کبھی نہیں لگواتا۔ قدوقامت میں وہ عرش سے بھی اونچا ہے۔ دل اس کے لئے مہاوت ہے۔ نالہ بھالہ بردار کا کام دیتا ہے۔ آہِ شرربار اس کے لئے آتشبازی کی چرخی ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ اور کسی کو نظر بھی نہیں آتا۔ اگر خدا کسی کو ہاتھی دے تو ایسا۔ نہ کہ راجہ نرپت کے ہاتھی جیسا۔ دیکھو یہ ہے اور کیسی

دلچسپ گریز ہے) راجہ کا ہاتھی نہایت شریر ہے۔ سرخ کلاوہ اس کے گلے میں نہیں ہے۔ بلکہ بہ خلقت کا خون ہے۔ جو اس کی گردن پر ہے۔ لڑائی کے دن وہ نیل کا داغ (یعنی کلنک کا ٹیکا) ہے۔ زنجیر سونڈ میں پکڑ کر اپنی ہی فوج پر پل پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی ہتیائی پر آجائے تو پھر بھالا بردار کتنے ہی برچھے چلائیں اور آتشبازی کی کتنی ہی چرخیاں چھوڑی جائیں وہ اپنی شرارت اور سرکشی سے باز نہیں آتا۔ آدمیوں کے سروں کو وہ اپنے قدموں کے تلے چنوں کی طرح دل ڈالتا ہے۔ خدا کو شاید اہلِ زمین کا زندہ رکھنا منظور تھا کہ اس ہاتھی کا مالک مفلس ہوگیا۔ اب اس کے لئے چارہ کہاں۔ فاقہ مستیاں کرتا ہے۔ بدن کی کھال اس طرح سکڑ گئی ہے۔ جیسے کسی خیمے کی رسیاں ڈھیلی پڑ جائیں ہڈیاں نمودار ہیں۔ ہر پسلی نردبان کی طرح نظر آتی ہے اب اُس کا مٹا پا جاتا رہا ہے۔ وہی مثل ہے کہ ہاتھی نکل گیا اور دم رہ گئی۔ تاہم اب بھی وہ اس قدر شریر ہے کہ اگر چھوٹ جائے تو معلوم نہیں کہ آتشبازی کے ہاتھی کی طرح کس کس کے گھر کو آگ لگائے۔ میں نے ایک دن اُس کے مہاوت سے کہا کہ اگر اُس کو بیچ کر ایک گدھا بھی خرید لیا جائے تو اس سے کہیں بہتر ہے۔ اس نے کہا اسے کون خرید سکتا ہے۔ اُس کی پیٹھ بلند ہے مگر پیٹ کا واک ہے۔ ہاتھی ہو تو کوئی اُس کو ہے یہ تو بے ایمان کی مسجد کی محراب ہے۔ اُسے تم ایک بوسیدہ او ویرانی چھت سمجھو چار پاؤں گویا چار ستون ہیں اور سونڈ گویا اژدہا ہے جو چھت کے سنبھالنے کے لئے کھڑی کردی گئی ہے۔ اگر یہ بیٹھ جائے تو بغیر راج مزدور کی مدد کے نہیں اُٹھ سکتا۔ یہ ہر بار کانوں کو اس طرح ہلاتا ہے گویا کوئلوں کا ایک انبار ہے۔ جسے پنکھوں سے دھونک رہے ہیں۔ کھانے کے وقت یہ اپنے تئیں ہاتھی بتاتا ہے اور من بھر ملیدہ روز آ طلب کرتا ہے مگر سواری کے وقت اپنے آپ کو فیل مرغ بتاتا ہے۔ منحوس اس قدر ہے کہ سنیچر (زحل ستارہ جو منحوس ہے) بھی اس کے قدم چومتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی پیٹھ پر سوار ہو تو گویا اُس کو بارود کے ڈھیر پر اڑانے کیلئے بٹھادیا ہے۔ خدا کرے یہ مرے یا مارا جائے۔ مہاوت کی یہ باتیں سُن کر ایک شخص کی حالت یکا یک متغیّر ہوگئی سبب پوچھا گیا تو اس نے کہا یہ ہاتھی شریر ہے۔ فیلبان کی روزی کا مدار اُس کے زندہ رہنے پر ہے۔ تاہم وہ اس کا مرنا چاہتا ہے میرا نفس بھی اس ہاتھی کی طرح ظالم اور شریر ہے۔ مگر جتنا کہ فیلبان اس شریر ہاتھی کی ہلاکت کے درپے ہے اتنا ہی میں اپنے نفس کی پرورش کے درپے ہوں۔ گویا میری ہمت اس فیلبان کی ہمت سے بھی گئی گزری۔ (یہ مثنوی کا خاتمہ ہے۔ اور کیسا سبق آموز خاتمہ ہے)

ایک مثنوی ہے جس میں سودا نے ایک بخیل دولتمند کی ہجو کی ہے اس کی تمہید بھی دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ آسمان کا تنور خدا کے نور سے روشن ہے۔ اگر وہ چاہے تو سورج اور چاند کو روٹی اور پنیر کی شکل میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس

نے آسمان کے دستر خوان پرستاروں کے نُقل چن دیئے ہیں۔ اُس نے ہزاروں نعمتیں انسان کو عطا کیں جن کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ اُس کے فضل سے کسی نعمت کی کمی نہیں۔ مگر ہماری ہی طبیعت خسیس اور دنی ہو تو اسکا کیا علاج ہے۔ یہ کہہ کر سودا نے یہ نقل بیان کی ہے کہ میرے ایک دوست اتفاقاً ایک امیر کے ڈیرے پر جا نکلے تھے۔ ان کے پہنچتے ہی یکایک آسمان پر چاروں طرف سے بادل امنڈ آئے۔ امیر نے پہلا سوال یہ کیا کہ تمہارے ساتھ ٹٹو یا بارانی نہیں ہے؟ گھر سے چلتے وقت اس کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ میرے دوست نے کہا مجھے مینہ کا حال معلوم نہ تھا۔ ورنہ بارانی ضرور لاتا۔ یکایک مینہ برسنے لگا۔ امیر نے بارانی سامنے لارکھی۔ پھر کہا۔ یہ ہماری تقدیر کی خوبی ہے کہ حسنِ اتفاق سے ایک دوست مدت کے بعد ہمارے مکان پر آئے۔ اور اسی وقت مینہ برسنے لگا۔ اور اُس کو اپنے مکان پر بھیگتا جانا پڑے۔ میرے دوست اب بھی اس گفتگو کی رمز کو نہیں سمجھے اور سادگی سے کہنے لگے۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے مکان پر بھیگتا جاؤں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اگر مینہ نہ کھلا تو میں رات کو آپ ہی کے مکان پر رہ جاؤں گا۔ یہ بات سن کر بخیل امیر کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ بارش کا سماں دیکھ کر گھبرا گیا اور کہنے لگا۔ یارو تیل چلاؤ (یہ بارش تھمانے کا ٹوٹکا ہے۔ بارش کے پانی پر تیل ڈال کر بہاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس طرح پانی تیل پر پھیل کر پھٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اس ٹوٹکے سے بادل پھٹ جاتے ہیں) یا شیخ ڈونڈو بناؤ (یہ بھی بارش تھمانے کا ٹوٹکا ہے۔ کپڑے کا ایک مسافر بناتے اور اس کی کمر سے ایک گٹھڑی باندھ کر بارش کے پانی میں لکڑی کے ذریعہ سے کھڑا کر دیتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے سے بارش تھم جاتی ہے) کبھی کہتا تھا۔ دیکھو تو کہیں سے آسمان بھی نظر آتا ہے۔ اگر سورج نکل آئے تو ہمارے گھر میں تو عید ہو جائے۔ ایک نوکر نے آقا کے خوش کرنے کو کہا۔ ہاں آسمان ایک جگہ سے تو خالی نظر آتا ہے۔ امیر نے کہا۔ خدا تیری زبان مبارک کرے۔ مگر جب پرنالے چلنے لگے تو جھنجھلا کر کہنے لگا مینہ تو کمبخت ایسا برستا ہے کہ اگر درخت اور پہاڑ بھی ڈوب جائیں تو کچھ عجب نہیں۔

غرض کہ رات آگئی۔ مگر مینہ نہ تھما۔ کھانے کا وقت آیا تو بہانہ کر کے اُٹھا اور ایک نوکر سے کہا۔ جا ضروریں آفتابہ رکھو۔ مہمان کے کان میں چلتے وقت کہہ گیا کہ اگر بھوک لگے تو بکاول کو حکم دے کر کچھ پکوا لینا۔ میرے دوست نے بکاول کو بلا کر پوچھا کھانے کو کچھ تیار ہے یا نہیں۔ کہا کچھ تیار نہیں۔ میرے دوست نے کہا۔ مودی سے جنس منگواؤ اور کچھ کھانا میرے لئے پکواؤ۔ کہا مودی میری بات کب مانتا ہے۔ جب کبھی اس کا حساب ہوتا ہے اس کو ہمیشہ جھینکنا پڑتا ہے۔ قصاب جدا مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ ترکاری والا جدا۔ باورچی۔ رکابدار اور کبابی کا بھی یہی حال ہے۔ باورچیخانہ ہمیشہ ٹھنڈا پڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سردی سے باورچیوں کی ناک بہتی رہتی ہے۔ لکڑیاں اسی غم سے

جلتی ہیں۔ دیگوں کے سینے جوش مارتے ہیں۔ سرپوش منہ ڈھانپ کر رویا کرتے ہیں۔ باورچی کہتے ہیں کہ ہم یہاں رہ کر اپنا فن بھول جائیں گے تو آپ کے بعد کیا کرکے کھائیں گے۔ تمام دیگچے چولہوں پر سرنگوں پڑے رہتے ہیں۔ دیگچوں کی جدائی کے سبب کفگیروں کے سینے چھلنی ہو رہے ہیں۔ دنیا میں سو عیدیں ہوں مگر ان کے گھر سے رمضان کا مہینا کبھی نہیں ٹلتا۔ غرض کہ اس گھر کا باورچی خانہ گویا آبدار خانہ ہے جس تنور سے نوح کا طوفان نمودار ہوا تھا۔ شاید ہمارے آقا کی نانی کا تنور تھا۔ میاں کے صاحبزادے نے ایک دن اپنے دوست کی دعوت کر دی۔ طرح طرح کے کھانے تو کیا کھلاتے۔ سالن کی ایک رکابی اور روٹی سامنے لا رکھی۔ اس پر ہمارے آقا ایسے خفا ہوئے کہ اُس کو عاق کرنے اور اس کی ماں کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ غصے میں کہا۔ اس کی ماں اس کی جگہ اگر پتھر جنتی تو اچھا تھا۔ میرا بیٹا ہو کر اس قدر ابتر نکلے۔ اس کا جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس کا دادا بھی اگرچہ عیاش تھا مگر وہ پھر بھی ایک سلیقے سے زندگی بسر کرتا تھا۔ گھر میں ایک نوکر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کو حکم تھا کہ رات کو گھر گھر پھر کر بھیک مانگے۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتا تھا اور جو ٹکڑے گھروں سے بھیک مانگ کر جمع کرتا۔ آقا کے سامنے لا رکھتا تھا۔ وہ اُن میں سے اچھے چن چن کر آپ کھاتے تھے اور برے نوکر کی تنخواہ میں لگاتے تھے۔ اس سلیقے سے دادا پردادا نے جو کچھ کمایا تھا یہ ناخلف اب اس کو برباد کر ڈالے گا۔ میں تو اپنے تئیں ہی فضول سمجھتا تھا۔ مگر یہ تو مجھ سے بھی زیادہ نامعقول نکلا۔ یہ گڑے پیسے سب اڑا دے گا۔ اور گھر کی اینٹیں تک بیچ کھائے گا۔ اس لڑکے کے پردادا کا یہ حال تھا کہ اُن کا ایک دوست ایک دن شراکت میں کھچڑی پکوا لایا۔ جب کھانے بیٹھے تو ان کے دوست نے ایک دو نوالے ذرا بڑے کھائے۔ اس پر وہ خفا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے، یہ شراکت کیسی۔ میرے سو نوالے اور تمہارا ایک نوالہ۔ غرض کہ ہمارے بزرگوں کا تو یہ چلن تھا۔ یہ لڑکا لوگوں کی فضول ضیافتیں کرتا ہے۔ خیر اس وقت کی ضیافت میں جو کچھ خرچ ہوا ہے وہ اس لڑکے کے اتالیق کی تنخواہ میں سے کاٹ لینا چاہئے۔ یہ کہہ کر بکاول نے کہا۔ یہاں کا حال تو آپ نے سُن لیا۔ اب آپ اگر میرے غریب خانے پر چلیں تو البتہ میں سب کچھ مہیّا کر سکتا ہوں۔

جس طرح بخیل کی ہجو میں سودا نے تخیل کی قوت سے کام لیکر مذمت کے نئے نئے پہلو نکالے ہیں۔ اسی طرح میر ضاحک کی ہجو میں اپنی قوتِ متخیلہ کا کمال دکھایا ہے۔ میر صاحب کو اکول یعنی پیٹو یا بسیار خوار قرار دیا ہے۔ اس مثنوی کے شروع میں فرماتے ہیں کہ زمانے نے ایک بار میر صاحب کی ضیافت کرکے اُس کے سامنے ایک لمبا دسترخوان بچھایا جو مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اور اس پر تمام دنیا کی نعمتیں چن دی گئی تھیں۔ مگر کسی بات پر زمانے سے

اُس کی اَن بن ہوگئی۔ زمانے نے گردن پکڑ کر دسترخوان سے اٹھادیا۔ ابھی وہ اس دسترخوان کی نعمتوں پر ہاتھ ڈالنے بھی نہ پایا تھا کہ ہونٹ چاٹتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب زمانہ اس سے پھر گیا ہے۔ کھانے کو گھر میں کچھ نہیں ملتا۔ مرغیوں کی طرح اب کنکریاں چننے پہ مدار ہے۔ آدھ سیر آٹے کا تو خدا بھی کفیل ہوسکتا ہے مگر اس کا پیٹ تو عمروعیار کی زنبیل ہے۔ اگر کسی گھر سے دیگچی کھڑکنے کی آواز آتی ہے تو وہ اس کے دروازہ پر اس طرح اڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ رستم بھی اُسے اٹھا نہیں سکتا۔ اگر کسی جگہ کھانے کی بو پاتا ہے تو مکھی کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگے اور دھواں اٹھتا نظر آئے تو لوگ تو آگ بجھانے کو دوڑتے ہیں۔ مگر یہ رکابی ہاتھ میں لے کر کھانا مانگنے کو دوڑتا ہے۔ بنیے کی دکان پہ جاتا ہے تو اُسے باتوں میں لگا لیتا ہے اور آنکھ بچا کر بندر کی طرح اپنے کلّے بھر لیتا ہے۔ اگر کسی شادی میں جاتا ہے تو لوگ ناچ رنگ سے جی بہلاتے ہیں۔ مگر وہ بار بار کھانے کے متعلق سوال کرتا ہے۔ محلے کا نان بائی شکایت کرتا ہے کہ ضاحک چوری سے میرے رفیدہ کو چاٹ جاتا ہے۔ اگر کسی جگہ دعوت میں بلایا جاتا ہے اور کھانے میں ذرا دیر ہوتی ہے تو میزبان سے کہتا ہے۔ میرے پیٹ کی بھی تمہیں کچھ فکر ہے آجکل میری بھوک ذرا کم ہوگئی ہے۔ مگر خیر تم بالفعل سو پچاس آدھ سیری روٹیاں تنور سے منگوا دو کیونکہ ابھی کھانا پکنے میں دیر ہے۔ کھانے پر بیٹھتا ہے تو اس طرح نوالے مارتا ہے۔ جیسے کوئی پٹے باز پٹے کے ہاتھ جھاڑتا ہو۔ جب تک دیگچی نہ چاٹ لے کھانے سے منہ نہیں موڑتا۔ ایک دفعہ ایک دوست نے شادی میں بلایا، لوگ تو تفریح میں مشغول تھے مگر وہ کبھی چونکتا تھا۔ کبھی اونگھنے لگتا تھا۔ کبھی باورچی خانے کی بُو سونگھتا تھا۔ اسی حال میں اس کی آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ کھانے کا دسترخوان اُس کے سامنے بچھا ہے۔ اتفاق سے ایک اور آدمی بھی کھانے پر آبیٹھا۔ ضاحک کو غصہ آیا اور اس پر حملہ آور ہوا۔ نیند میں جو ہاتھ مارا تو ایک شخص جو ضاحک کے قریب بیٹھا تھا اس کے سر پہ دھول پڑی اور اس کی پگڑی دور جا پڑی۔ یہ حرکت دیکھ کر وہ نہایت برہم ہوا۔ قریب تھا کہ کشت و خون ہو جائے۔ مگر صاحب خانہ نے کہا۔ ذرا صبر کرو۔ پھر ضاحک سے اس کی حرکت کی وجہ دریافت کی۔ اُس نے اپنا خواب بیان کیا۔ اس پر سب ہنسنے لگے اور معاف کردیا۔

ایک مثنوی میں حکیم غوث کی ہجو کی ہے۔ یہ بھی نہایت دلچسپ اور لطیف ہے۔ کہتے ہیں کہ صدر بازار میں ایک طبیب غوث نامی ہے جو دنیا میں ہلاکو کا قایم مقام ہے۔ یہ شخص روم کا باشندہ ہے۔ جب سے اس نے طبابت میں قدم رکھا ہے۔ روم سے شام تک تمام ملکوں کو بے چراغ کردیا ہے۔ ہندوستان میں اس کا نام ملک الموت مشہور ہے۔ اس کا قلم خنجرِ براں کا کام کرتا ہے۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو برابر قتل کرتا ہے۔ اگر وہ نسخہ لکھنے کا پیشہ اختیار

نہ کرتا تو بہشت اور دوزخ انسانوں سے نہ بھرتے۔ جب سے اس نے لوگوں کو دوا دینی شروع کی ہے موت اپنے کام میں مشغول ہے اور شفا معطل ہوگئی ہے۔ اسی کے بھروسے پر گورکن قرض لیتے ہیں۔ اگر وہ کبھی بیمار ہوتا ہے اور اپنا علاج آپ کرتا ہے تو گورکن مردہ شو اور تابوت گر اس کا گھر گھیر لیتے ہیں اور دہائی دے کر کہتے ہیں کہ تو اپنی دوا آپ نہ کر۔ اگر تو مرگیا تو ہمارا روزگار بند ہو جائے گا۔ یا کوئی اپنے جیسا طبیب بتا کہ ہم اپنی روزی کی طرف سے مطمئن ہو کر تیری قبر پر چراغ جلایا کریں اور پھول چڑھایا کریں۔

اس کی تشخیص عجیب ہے۔ ایک شخص کو نزلہ تھا۔ نبض دیکھ کر اس نے دق تجویز کی اور نسخہ لکھ دیا۔ مریض نسخہ کو لے کر عطار کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا تمہیں کیا بیماری ہے۔ کہا طبیب نے دق بتائی ہے۔ عطار نے کہا اس نسخہ میں تو معجون زرنباد ہے۔ ذرا اس طبیب کا نام و نشان تو بتا۔ مریض نے اس کا پتا دیا۔ عطار نے کہا وہ تو ہلاکو ہے۔ طبیب کا ہیکو ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا کہ چل تجھے غوث سے ملادوں۔ اگر اس کے نسخے تیری دکان پر آیا کریں گے تو تیری دکان خوب چمک جائیگی۔ چنانچہ وہ دوست مجھے اس کے پاس لے گیا۔ میں نے اس کے گرد بہت سے بیماروں کا ہجوم دیکھا ایک بیمار کی نبض دیکھ کر اس نے قبض بتایا اور سفوف حجرالیہود پھانکنے کی صلاح دی۔ غذا یہ بتائی کہ ماش کے آٹے کی روٹی پکاؤ اور پوست خشخاش کی ترکاری سے کھایا کرو۔ ایک مریض کو پیچش بتائی اور کرٹول دوا تجویز کی۔ ایک اور مریض کی بیماری ہیضہ تشخیص کی اور اسبغول نسخہ میں لکھا۔ جنون کے کے ایک مریض کے لئے اونٹ کا دودھ بتایا۔ ایک مریض کو استسقا (جلندھر) کی بیماری بتائی اور کہا تم اپنی فصد کراؤ اور گلقند دہی ملا کر کھایا کرو۔ دنبل کا علاج بتایا کہ اس کے زخم کو رفو کراؤ۔ ان سب بیماروں سے فارغ ہو کر ایک ڈولی کے پاس جا بیٹھا۔ اور مریضہ کی نبض دیکھ کر اس کی خادمہ سے کہا یا تو اس کو درد سر ہے یا درد کمر ہے۔ مگر مجھے زیادہ تر نقرس کا اندیشہ ہے۔ آخر کار اس نے مریضہ کا مرض صرع بتایا۔ اور ماءالقرع (آب کدو) دوا تجویز کی۔ پھر کہا کہ آش جو کے سوا کھانے کو اور کچھ نہ دینا۔ خادمہ نے کہا اس کے لئے تو یہ دوا زہر ہے۔ اس کو تو لقوہ اور فالج کی بیماری ہے۔ غوث نے خفا ہو کر کہا تو نے نہ سدیدی پڑھی نہ شیخ کا قانون پڑھا اس پر حکیموں سے بحث کرتی ہے۔ تو پانچ روپیہ کی کنیز تجھے دوا اور بیماری کی کیا تمیز۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔ حکیم جی کا کیا گناہ۔ مریضہ پردہ میں ہے۔ اس کی بیماری کا حال کیونکر معلوم ہو۔ اس طنز کو حکیم جی سمجھ گئے اور دونوں میں خوب جھڑپ ہوئی۔ یہ کہہ کر عطار نے مریض سے کہا خبردار ایسے حکیموں کی دوا استعمال نہ کرنا۔

باقی مثنویوں میں ایک میاں فوقی کی ہجو میں ہے۔ ایک فدوی کی ہجو میں اور ایک میں مرزا فیضو کی چینک

کا مرثیہ ہے۔ ان میں سے کوئی مثنوی اہم نہیں۔

غزلوں میں سے ایک غزل میں میاں حسرت عطار کا خاکہ اڑایا ہے۔ ترجیع بندوں میں سے ایک میں ضاحک کی ہجو ہے۔ ایک میں فدوی کی اور ایک میں مولوی ندرت کشمیری کی دختر کی۔ بارہ مخمس ہیں جن میں ضاحک۔ میر علی ہاتف۔ ندرت کشمیری اور مرزا علی وغیرہ کی ہجو کی گئی ہے۔ مگر ان سب میں سے کوئی نظم بھی ایسی نہیں ہے جو قابل ذکر ہو۔ صرف وہی نظمیں زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ جن کا ذکر کیا گیا ہے ان میں بھی جہاں کہیں فحش ہے خلاصہ میں ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

سلیم

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں۔ مصیبت میرے سر پر ٹوٹ پڑی۔ طبل ہتک بج چکا۔ میرا مرتبہ خاک میں مل گیا۔ اب میرے رستے میرے سامنے کھلے ہیں۔ میرے پر پرواز آسمان کی تمنا سے بھر رہے ہیں۔ میں نیم شب کے ٹوٹنے والے تاروں کے ساتھ سایۂ عمیق میں غوطہ زن ہونے کو جا رہا ہوں۔ میں موسم گرما کے اُس طوفان زدہ بادل کی مانند ہوں جو اپنا زرّیں تاج پھینک کر ایک برقی زنجیر پر بجلی کی تلوار آویزاں کئے ہوئے ہو۔

اک پر وحشت مسرت میں مَیں حقیر لوگوں کی گرد آلود راہ پر دوڑتا ہوں اور تیرے آخریں خیر مقدم کے زیادہ قریب ہوا جاتا ہوں۔ بچہ اپنی ماں کو پا لیتا ہے جب وہ اپنی ماں کے بطن کو چھوڑے۔ جب میں تجھ سے جدا ہوتا ہوں۔ جب میں تیرے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہوں۔ تو آزاد ہو کر میں تیرا پیارا چہرہ دیکھ سکتا ہوں۔

"گلچیں"

سُروں کے رنگ

ہندی سنگیت میں سُروں کے رنگ بیان کئے گئے ہیں۔ اور اب تو ایک مشین بھی اس قسم کی ایجاد ہوئی ہے جس سے آواز کے رنگ دکھائے جاتے ہیں۔ چند سال ہوئے لاہور میں ایک سائنٹیفک کانفرنس ہوئی تھی۔ ایک پروفیسر سے ہم نے درخواست کی کہ میں گاتا ہوں آپ مشین لگائیں اور میرے گانے کے رنگ دکھائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں مشکور فرمایا اور پیلو راگنی کے رنگ دکھائے۔ اس سرعت سے رنگ پے در پے نظر آتے گئے کہ سارے رنگ میں نہ یاد رکھ سکتا تھا، نہ قلمبند کر سکتا تھا لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ واقعی ہر ایک سُر کا رنگ جداگانہ ہے۔

ہندوستان کے زمانۂ قدیم میں ایسے سامان نہیں تھے جو حال کے زمانہ میں ایجاد و اختراع ہوئے۔ ہمیں تعجب ہے کہ کس طرح سے رشیوں نے یہ بات دریافت کی کہ ہر ایک سُر کا رنگ ہے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ امر انہیں معلوم تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر ایک سُر کا رنگ اُنہوں نے کس طرح دریافت کیا۔ کیا اُن میں کوئی باطنی قوتیں ہوتی تھیں جو اب مفقود ہو گئی ہیں۔

یورپ کے سفر میں ہم کو ایک دوست نے بتایا کہ ایک کمپنی آواز کے رنگ بنا دیتی ہے اور رنگ سے پھر وہی آواز پیدا کر دیتی ہے۔ افسوس ہم کو اس تماشے کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔

اب اگر کبھی موقع ملے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا جو رنگ سُروں کے ہندوؤں نے لکھے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط۔ اِس میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ سُر صحیح ہوں۔ ہارمونیم کے سُر مسئلہ طور پر عمداً صحیح نہیں رکھے گئے۔ البتہ ستار پر ہندی سُر درست ظاہر ہو سکتے ہیں۔

(۱) سر (کھرج) گلابی
(۲) رکھب۔ ہرا زردی مائل۔
(۳) گندھار۔ سنتری (نارنجی)
(۴) مدھم۔ گلابی زردی مائل۔
(۵) پنچم۔ سرخ
(۶) دھیوت۔ زرد
(۷) نکھاد (نشادہ) سیاہ

شمیم

خاتونِ نغمہ ساز سے

اے نوا پرداز اے شکر فروشِ نغمہ ساز — کاشفِ رازِ نیاز و ناز اے جدت طراز

راگنی وہ چھیڑ جس سے دل ہوں سینوں میں گداز — دُور ہو آئینۂ فطرت سے زنگِ حرص و آز

مردہ دل جی اُٹھیں سن کر نعرۂ ہنگامہ خیز

عیش و عشرت رنگ رلیوں میں ہوں اپنی اشک ریز

ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں محوِ غفلت ہے بشر — برسرِ پیکار ہیں ہر سُو قوائے خیر و شر

جلوہ گر ہے ہر کہیں آزادیٔ وحشت اثر — کانپتی ہے روحِ عفّت یہ مناظر دیکھ کر

حقّ و باطل کے حقائق سے ہے گو ناآشنا

بَن رہا ہے ناخدائے خود نما خود ہی خدا

روز و شب کی جستجو ہے منتہائے زندگی — شاہدِ قدرت کا جلوہ مدعائے زندگی

تیرے سینے میں جو پنہاں ہے صدائے زندگی — وہ ہے دنیا کے لئے قبلہ نمائے زندگی

جذبۂ حسنِ عمل کو دہر میں بیدار کر

مے پرستوں کو مئے ایثار سے سرشار کر

گنگری میں اپنی استغفار کا رستہ دکھا — خود غرض کو ہستیٔ خوددار کا رستہ دکھا

خودسری کے عاشقوں کو پیار کا رستہ دکھا — اہلِ دل کو گلشنِ بے خار کا رستہ دکھا

خلدِ امن و حسن میں اے رہنما لے چل ذرا

کچھ نہ کچھ پائیں جہاں اس آج کل سے کل ذرا

با

نورِ فطرت

دُور افق پہ چوٹیاں برف سے ہیں ڈھکی ہوئی
گُم ہیں پہاڑ وادیاں ابر میں ہیں چھپی ہوئی

شاخیں ہوائے شوق سے کوہ پہ محوِ رقص اُدھر
گُل کی پیالیاں اِدھر اوس سے ہیں بھری ہوئی

آبِ رواں کا شور ہے بادِ وزاں کا زور ہے
صحنِ چمن میں آج ہے بزمِ طرب جمی ہوئی

نقشۂ حسن و عشق ہے راز و نیازِ شاخ و گُل
ناز سے یہ کھڑا ہوا شرم سے وہ جھکی ہوئی

آئی ہے رُت بہار کی چلد ئیے اب خزاں کے دن
دل میں جو آرزو کی تھی شاخ وہ پھر ہری ہوئی

چھاؤں گھنی گھنی کہیں دھوپ چھنی چھنی کہیں
تیرہ و تار روح میں علم کی روشنی ہوئی

نفس خموش ہو گیا خوابِ خودی میں کھو گیا
حق کے حضور زندگی روح کی راگنی ہوئی

کُلفت و یاس کس لئے خوف و ہراس کس لئے؟
غم سے جو پائمال ہو کیسی وہ زندگی ہوئی؟

غم ہو کہ ہو خوشی یہاں کھوئیے کیوں سکونِ دل
غم اُسے غم نہیں جسے غم میں نہ بے کلی ہوئی

شکرِ خدا، خدا نے دیں تجھ کو یہ دونوں نعمتیں
زارِ خوشی بھی پا لیا غم سے بھی آگہی ہوئی

باغ میں صبح ہو گئی شاخ پہ پھول کھل چکا
جاتی ہے گلستاں سے اب نکہتِ گل اُڑی ہوئی

ب۔ا

ناہید

پیارے دوست! کیوں مجھ ناتوان پر تقاضوں کے تیر برساتے ہو؟ مجھے اپنی لاغر زندگی میں صرف چند حسرتیں جمع کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور گو مجھ نادار کی گٹھی میں یہ چڑیلیں بھی پریاں ہیں۔ مگر دنیا انہیں دیکھے گی تو جو وہ ہیں وہی کہے گی۔ تقاضا کرو اُن فربہ معتبر شخصیتوں سے جن کے چرچے ہیں۔ جن کے محلوں کی ہوا شبانہ رقص سے پامال ہے۔ جن کی جیبوں سے زندگی چھن چھن کرتی ہوئی اچھلتی ہے۔ نہ مجھ سے جس کی زندگی محض زندگی کی آرزو ہو۔ میرے شعلے صرف میرے اپنے لئے ہیں، دنیا کے لئے

شرارم سنگ شد از کلفتِ صبر آزمائیہا

مجھ پر رحم نہیں کرتے تو اپنے رسالے کے پڑھنے والوں کی ادبی توقعات کا احترام تو کرو۔

تمہارا ....

دوست! تم یہ اپنا بوسیدہ فلسفہ رہنے دو۔ ظالم! تمہیں پتہ تو ہے کہ میری ردّی کی ٹوکری آباد ہے۔ اور انتخاب کا بکس خالی۔ اس پر تمہاری طرف سے یہ لیت ولعل! اور کچھ نہیں تو علّو والے ماجرے کو نام بدل کر لکھ ڈالو اتنا بہت دلچسپ تو نہیں مگر چونکہ امرِ واقع ہے۔ کئی اخبار زدہ شوق سے پڑھ لیں گے۔ عبارت میں خود درست کرلوں گا۔

تمہارا ....

پیارے دوست! سبحان اللہ کیا فرمائش کی ہے؟ تمہارے عامیانہ مذاق کی کوئی حد بھی ہے؟ اور کیا میں ایسا غدار ہوں کہ اپنے عزیز ترین دوست علّو اور اس کی بیوی ناہید کا حال شائع کردوں اور اس میں بات کیا ہے؟

ہزار آرزوؤں سے شادی ہوئی، دو ایک سال ایک دوسرے کے پروانہ وار عاشق رہے۔ مگر ناہید کی کافی سے زیادہ جائداد حبیب علو صاحب کی ناتجربہ کاری پر نثار ہو چکی تو رخنہ اندازوں نے چپکے ہی چپکے لگانے بجھانے سے اُدھر علّو کو اِدھر ناہید کے بھائی کو ایک دوسرے سے وہ برگشتہ کیا کہ ناہید کے لئے زندگی جہنم ہوگئی

وہ تو اس پر بھی نہ بدلی۔ ریشم سے ململ پر اور سونے سے کانچ پر آ اتری۔ مگر واہ ری ناہید کیا مجال کہ علّو کو کبھی کنایتاً بھی جتلایا ہو کہ بُرا ہُوا۔ دنیا مگر کب چھوڑتی ہے۔ بہن، بھائی کو لڑوا دیا۔ بھائی کو سکھلایا گیا کہ ناہید کو مجبور کرے کہ وہ علّو کے کان کھینچے۔ ناہید کو جائیداد کی تباہی کا قلق کچھ بھی نہ تھا مگر سگے ماں جائے کو کہنا کہ مجھے تباہ ہونے دو تم دخل مت دو۔ زہر کھانے کے برابر تھا۔ وہ اس پر بھی تیار ہو گئی۔ جب علّو کو اُس باوفا کے اِس فیصلے کا علم ہوا تو آپ کی آنکھیں کھلیں مگر کیا خاک کھلیں۔ آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ خود بدولت ناہید جیسی فرشتہ خصلت کے شوہر ہونے کے قابل نہیں اور جدید فلسفۂ زندگی کی تعمیل میں آپ نے خودکشی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ڈوب کر مر جانے سے انہیں نفرت تھی، اور پستول آپ کے پاس تھا نہیں۔ روشنیٔ طبع یوں چمکی کہ پستول چرایا جائے۔ اور یہ خیال اس قدر مستحکم ہُوا کہ کئی سوند بیروں کو رد کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے آسان طریقہ پستول چرانے کا یہ ہے کہ کسی فوجی افسر کے بہرے بن جائیں اور موقع ملے تو پستول اُڑا لیں۔ اس عزم سے آپ پشاور جا نکلے اور سچ مچ ایک کرنیل کے خدمتگار بن گئے۔ چند ہی دن میں وہ اعتبار جمایا کہ کرنیل کو کسی طرح کا شبہ نہ رہا۔ اور کرنیل صاحب مع خدمت گار شکار کو نکلے۔ علّو کرنیل صاحب کے خیمے کو پوری طرح بند کرنے کے بہانے سے عین اس وقت خیمہ سے نکلا جب اس نے دیکھ لیا کہ کرنیل نے پستول بھر کر بستر کے نیچے رکھ لیا ہے۔ علّو نے دو ایک گھنٹے تو انتظار کیا اور پھر دبے پاؤں اپنی چھولداری سے نکل کر چپکے سے خیمہ کا پردہ کھول کر اندر گھسا۔ کیا دیکھتا ہے کہ دو غیر علاقہ کے پٹھان کرنیل کی رائفل کا بکس سنبھالے پہلو والی قنات کے نیچے سے نکلنے کو تیار ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جست کر کے ان دونوں کے اوپر گرا بکس تو ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر وہ کھسک گئے۔ ابھی علّو اٹھا بھی نہ تھا کہ کرنیل نے خیمہ سے نکل کر دو فیر کئے۔ مگر اندھیرے کے باعث وہ پٹھان صاف بچ گئے۔ اس کے بعد کرنیل خیمہ میں داخل ہُوا اور بجلی کی دستی مشعل کی شعاع علّو پر ڈال کر اور پستول اس کی طرف سیدھا کر کے ذرا درشتی کے لہجے میں کہنے لگا۔

کرنیل - سچ سچ بولو۔ مگر پہلے یہ سمجھ لو کہ ہم فوجی کبھی بے خبر نہیں ہوتے۔ مجھے چوروں کے آنے کی بھی خبر ہے۔ تمہارے آنے کی بھی خبر ہے۔ میں اس تاک میں تھا کہ چور نکلنے والے ہوں تو فیر کروں۔ بولو تم کیسے خیمے میں آئے؟

علّو - (ایک آدھ منٹ سوچنے کے بعد) میں آپ کا پستول چرانے آیا تھا کیونکہ میں خودکشی کرنا چاہتا تھا۔

کرنیل - خودکشی کیوں کرنا چاہتے تھے؟

علّو - آپ کو اس سوال کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔

کرنیل - تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی مجھے کوئی حق نہیں۔ مگر تم مجھے اجازت دو کہ میں تم سے یہ سوال پوچھوں (پستول کو

جھکا کر اور خالی کرتے ہوئے) یہ سوال ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے پوچھنا چاہتا ہے۔

علو نے جب کچھ جواب نہ دیا تو کرنیل نے پستول خالی کر کے رکھ دیا۔ اور پھر پلنگ پر اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔

کرنیل - کیا مسٹر علاء الدین کرسی پر بیٹھ کر مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے۔

علو - (گھبرا کر بیٹھ کر) آپ کو میرے نام کا پتہ کیونکر ہے ؟

کرنیل - جب آپ نے میرے پاس نوکری کی التجا کی اور یہ کہا کہ چٹھی کوئی نہیں تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اس قطع وضع کے آدمی کے لئے نوکری کی تلاش کسی مصیبت کے باعث سے ہے۔ چنانچہ آپ سے میں نے والد کا نام دریافت کیا اور شہر۔ مجھے یقین تھا کہ والد کا نام آپ غلط نہیں بتائیں گے۔ اتفاق سے شہر بھی آپ نے صحیح بتا دیا۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر سے گو وہ میرا ذاتی واقف نہ تھا آپ کے والد کا نام لکھ کر حالات دریافت کئے۔ معلوم ہوا کہ آپ نجیب خاندان سے ہیں۔ مگر کسی خانگی کشمکش اور مالی نقصان کے باعث کچھ عرصے سے شہر سے غائب ہیں۔ یہ اطلاع مجھے کل ملی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے ضلع کے افسر کو اطلاع دینی چاہئے ؟ غالباً میرا فیصلہ یہی ہوتا کہ اطلاع نہیں دینی چاہئے۔ مگر اب یہ واقعہ پیش آگیا۔

علو - آپ کو صحیح خبر ملی۔

کرنیل - شاید آپ کو علم ہو کہ آپ کے والد اور میرے چچا کے کچھ تعلقات تھے۔

علو - میرے والد کے دوست کا نام تو کرنیل ہوورڈ تھا اور آپ کا نام ہوورڈ مرے ہے۔

کرنیل - مجھے اپنے نانا کا نام اختیار کرنا پڑا۔ ورنہ کرنیل ہوورڈ میرے والد کے بھائی تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ کرنیل ہوورڈ مرے نے علو صاحب کو کمسریٹ کے ایسے نفع والے ٹھیکے دیئے کہ علو اب لاکھوں کے پھیر میں ہیں۔ مگر جب یہ ٹھیکہ دار صاحب دو سال کے بعد پہلی دفعہ گھر وارد ہوئے تو باوجود اس کے کہ انہوں نے ناہید کے پاؤں پر سر رکھا ناہید اُن سے بگڑی رہی۔ علو کے لئے وہ چند دن قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ مگر ناہید آخر میری تدبیر سے رام ہوئی۔ اُسے غصہ یہ تھا کہ اگر علو نے خودکشی کرنی ہی تھی تو پہلے مجھے مارتا۔ اُس کے غم میں گھل گھل کر مرنے سے اُس کے ہاتھ سے مرنا بہتر ہوتا۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ جس شخص کے لئے سگے بھائی سے بگاڑی اُس شخص کا کیا اتنا حق بھی مجھے نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے دل کا راز بتاتا ؟" اُس کا غصہ حق بجانب تھا۔ مگر ادھر علو کا یہ حال تھا کہ ناہید کی ناراضگی میں وہ منٹ منٹ میں سو سو دفعہ مرتا۔ ان دونوں عاشق معشوق کو بن موت مرتے ہوئے مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا اور مجھے ایک تجویز سوجھ گئی۔ ایک شام بصد منت ناہید کو کھانے پر بلوایا۔ اور اپنی بیوی کے روبرو حالانکہ

وہ علو کی رشتہ میں بہن تھی۔ اور اس معاملہ میں علو کی طرفدار تھی۔ بندے نے علو کی وہ بدتعریفی شروع کی کہ ناہید کا ایک رنگ آئے ایک جائے۔ آخر اُس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور جھنجھلا کر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔

ناہید۔ میں سمجھتی تھی کہ علو ہی خود پسند ہے مگر وہ اتنا کمینہ نہیں جتنے کہ تم ہو۔ اُس نے کبھی بھی کسی دوست کو بُرے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میرے بھائی سے بگاڑ رہا مگر برا لفظ اُس نے کبھی کوئی استعمال نہ کیا۔ اگر علو نے دل دکھایا ہے تو میرا دکھایا ہے۔ تم اُسے بُرا کہنے والے کون؟ مجھے تمہارے گھر سے کھانا کھانا زہر ہے۔

یہ کہہ کر وہ غصہ میں بھری اُٹھی اور زار زار رونے لگی۔ اُدھر پردے کے پیچھے سے علّو جن کو پہلے ہی وہاں چھپا دیا گیا تھا نمودار ہوا اور آتے ہی اُس نے ناہید کو اٹھا لیا۔ عشق وہ بلائے بد ہے کہ ان بے حیاؤں کو ہمارے سامنے پیار کرتے شرم نہ آئی۔ اور میرا شکریہ ادا کئے بغیر علو صاحب ناہید کو گود میں اٹھائے چل دیئے۔

بھلے آدمی سوچو تو سہی یہ واقعہ ہی کیا ہے کہ اسے کوئی اہل قلم کسی مقبول رسالے کے لئے سجا کر پیش کرے۔ محض چند غلطیاں، چند غلط فہمیاں اور تھوڑی سی میری نفسیات سے واقفیت پر مبنی چالبازی۔ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی علو کا دوست ناہید کے سامنے علو کو صلواتیں سنائے گا تو ناہید کی دبی ہوئی عشق کی آگ از سر نو بھڑک اُٹھے گی۔ اس معاملے میں سب سے بہتر میرا *suggestion* تھا۔ ناہید بھولی بھالی کو یقین ہو گیا۔ کہ میں سچے دل سے علو کو حقارت آمیز لفظوں سے یاد کر رہا تھا مگر اچھی کہانی انگریزی *sandwich* کی طرح کاریگری کی محتاج ہے یعنی اِس طرح کہ درمیان میں تو وہی ایک بھنی بوٹی ہو مگر اِدھر اُدھر ساگ کی سبزی، چقندر کی سرخی اور انڈے کی سلیقہ سے کٹی ہوئی سفیدی زردی اس بھنی بوٹی کو نگاہ کے لئے اور نگاہ کے ذریعہ اشتہا کے لئے اِس قدر دلفریب بنادے کہ وہ بوٹی صرف غذا نہ رہے بلکہ بجائے خود صنعت کا نمونہ بن جائے۔ اس واقعے میں آندھی کیسے چلاؤں۔ بجلی کیونکر گرجے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکالمے میں حاضر جوابی کے جو کرشمے ہوتے ہیں وہ اس میں کیسے کھپ سکیں۔ مگر تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو!

تمہارا۔۔۔۔۔۔۔

دوست! تم اپنی امید سے بڑھ کر اس واقعے کا خون کرنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ مجھے اب پتہ چلا کہ تمہیں وہ چند الٹی سیدھی ترکیبیں جو آج کل کے بعض رسائل کو مقبول بنا رہی ہیں ضرور ازبر ہیں۔ مگر واقعات کا شاعرانہ موازنہ

کرنے سے تم اپنی طبعی شریت سے مجبور رہو۔ اس کا تم اللہ میاں سے وقتِ فرصت گلہ کر لینا۔ مجھے فی الحال وہ واقعہ لکھ بھیجو۔ جو دوسرے دن تمہارے اور ناہید کے درمیان علو کے روبرو ہوا۔ کوئی کہتا تھا کہ ناہید نے تم سے معافی مانگی اور تمہیں گلے لگا کر پیار کیا۔ کیا بات تھی؟ اگر کوئی صاحبِ تخیل اہلِ قلم مل گیا تو اس سے استدعا کروں گا کہ جن واقعات کو تم نے اس بے دردی سے چکنا چور کیا ہے اُن میں وہ ادبی شان پیدا کر دے۔

دوست۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے ملک میں کوئی ادبی کورٹ مارشل ہوتا۔ تمہارا نام تو شاید کسی طرح علمی دنیا میں نہ آتا مگر کورٹ مارشل کے تذکرے پر تنقید نویس کس لطف سے اس شہادت کا ذکر کرتے جو تمہارے برخلاف گزرتی

میں ہوں ایک گھامڑ کا دوست

پیارے دوست! تم کچھ ہی بکا کرو مگر میری طرف سے ہرگز تمہیں اجازت نہیں کہ علاء الدین والے واقعات کا تم کوئی استعمال بھی کرو جس قسم کے بتدی تمہارے زیر اثر ہیں اُن کے قلمی داؤ پیچ سے میں خوب واقف ہوں۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ جب سے تم سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا ہے میں خود محسوس کرتا ہوں کہ میرا کورٹ مارشل ہونا چاہیئے۔ اِس لئے کہ تمہارا رسالہ اور تمہارے خط بن پڑھے جلا دینے کے پڑھتا بھی ہوں اور پھاڑتا بھی نہیں۔

تمہارا........

دوست! تمہاری اور تمہاری ممانعت دونوں کی ایسی تیسی۔ تمہارا اپنا قول ہے کہ ایڈیٹر ہونا اور ایماندار ہونا دو متضاد باتیں ہیں۔ اگر تم نے مجھے وہ ناہید کے پیار والا واقعہ بلا کم و کاست بالکل راست راست نہ لکھا تو میں اپنے رسالے میں مفصلہ ذیل نوٹ شائع کر دوں گا۔

نئی تہذیب اور ایک مشہور گھرانہ "جن نئی اخلاقی آندھیوں نے آج کل مغربی ممالک میں سوشل تعلقات کے مطلع کو غبار آلود کر رکھا ہے وہ اِس پرانے شہر میں بھی زور شور سے چلنے لگی ہیں۔ یورپ میں تو صرف عین نکاح کے بعد دولہا کے عزیز ترین دوست کو حق ہوتا ہے کہ وہ نئی دلہن کے ہونٹوں سے ہونٹ رگڑ کر سرخروئی حاصل کرے مگر ہمارے شہر کے آنریبل فیشنیبلوں نے اس میں اتنی ترمیم اور کر لی ہے کہ جہاں کہیں میاں بیوی میں بگاڑ ہوا فوراً کسی دوست نے بیچ بچاؤ کر کے نئے سرے سے شادی رچا دی اور اس حق الخدمت میں اِس نئی پرانی دلہن کو خوب دل کھول کر اُس کے نئے پرانے میاں کے سامنے پیار کر لیا ہمیں معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے

کہ اس تازہ بتازہ نو بنو کے موجد ہمارے شہر کے ایک بزعم خود مشہور اہلِ قلم مسٹر ڈیش ہیں اور اُن کے معاون مسٹر ۔۔۔۔ ہیں جن کا ہندوستانی نام ہم معلوم نہیں کر سکے گو مسٹر ۔۔۔۔ یورپین صحبت سے فیض یاب ضرور ہوئے ہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کی بیگم صاحبہ نے کس طرح ایشیائی تہذیب سے عدم تعاون کی روش اختیار کر لی۔ دنیا منتظر رہے گی کہ مسٹر بزعم خود مشہور کے ہاں کس دن چقلیش ہوتی ہے۔ اور کیا اُس دن باہمی مصالحت کے لئے مسٹر ۔۔۔۔ کی خدمات طلب کی جائیں گی۔ یا اس تازہ بتازہ نو بنو کے حلقۂ تقدیس میں اور لوگوں کو شامل ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ کیوں دوست۔ کیا تم اِس تحریر کا شائع ہونا پسند کرو گے؟ واللہ بااللہ میں ضرور شائع کر دوں گا۔

تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔۔

پیارے دیوانے اگر یہ تحریر تم شائع کرو گے تو اس کا جواب علّو کے بوٹ تمہاری کھوپری پر تصنیف کریں گے میں اِس تمام خط و کتابت کی نقل علّو کو روانہ کر رہا ہوں۔

تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔۔

ڈیر علّو۔ ملفوفہ نقولہائے خطوط کو وقت فرصت دیکھ لینا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا ایڈیٹر دوست محض مذاق کے مرض میں مبتلا ہے۔ ورنہ کجا وہ کجا دل آزاری۔ بہر حال تمہیں بے خبر رکھنا مناسب نہیں۔

تمہارا ۔۔۔۔۔۔۔۔

علّو کی طرف سے جواب

ڈیر ڈیش۔ ناہید تمہارے اور تمہارے ایڈیٹر دوست کے خطوط کی نقول پڑھ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ یہ خط اور جو حاشیہ اُس نے چڑھایا ہے وہ سب ضرور شائع ہوں اور فوراً شائع ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ تم نے ناہید کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا کہ غازی کمال پاشا جہاں تک آزاد خیالی کا تعلق ہے تمہارے سامنے طفلِ مکتب ہے۔ ناہید کہتی ہے کہ اگر آزاد خیال مرد ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ تم ہو تو تمہارا فطرتی حق ہے کہ تم اپنے لئے چوڑیاں بنواؤ اور برقعہ پہنو۔ مردِ خدا تم صرف اس بات سے ڈر گئے کہ ناہید جیسی باوفا پر تہمت تراشی گئی یا تہمت تراشنے کی دھمکی دی گئی۔ کیا تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ زمانے کے تغیر سے ناہید کیا ایسی سینکڑوں پر تہمتیں عائد ہونگی۔ میاں آنکھیں کھولو۔ انگورا لندن، اور کابل انگورا بن رہا ہے مگر تم انہیں دلی کی گلیوں

میں گرفتار رہو۔ خدا کے لئے اپنی حالت کو بدلو۔ ناہید کی تحریر حسبِ ذیل ہے مگر یہ خط نہیں تب ملے گا جب یہ سب کچھ شائع ہو جائے گا۔

درعلو نے ابھی مجھے بزعمِ خود مشہور کے اور اُن کے ایڈیٹر دوست کے خط دکھائے ہیں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ علّو کے دقیانوسی دوست بزدل عورتوں سے بھی بدتر ہیں۔ مگر آج یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا۔ ایڈیٹر صاحب تو محض شوخیٔ تحریر کی خاطر جھوٹ بولنے پر آمادہ ہیں۔ مگر مسٹر ڈیش میں اتنی بھی ہمت نہیں۔ انہیں یہ بھی ناگوار گزرا کہ کیوں ہم نے ان کے سامنے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ مزید لطف یہ کہ ان کوڑمغزوں کی ڈرپوک طبیعتیں تہمت لگانے پر بھی آئیں تو بس اسی قدر کہ ناہید نے علو کی موجوگی میں مسٹر ڈیش کو پیار کر لیا۔ کیا اُن کی نگاہوں میں یہ جرم ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔ مگر جی چاہتا ہے کہ کاش اُن کا جھوٹ کبھی تو سچ ہو جائے یعنی ہر ہندوستانی خاتون کا یہ حوصلہ ہو کہ عصمت کی غلامی میں زندگی کی جائز خوشیوں کو خواہ مخواہ اپنے پر حرام نہ کر لیں مگر اس مشکل مسئلے پر آرزو کا اظہار فی الحال فضول ہے۔ گر مجھے موجودہ تاریکی کے زمانہ میں بھی یہ کہنے کی جرات ہے کہ کسی اور مرد کو پیار کرنا جرم ہو یا نہ ہو مگر ہزارہا مثالیں اس وقت ایسی موجود ہیں جن کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ شوہر کو پیار کرنا ضرور جرم ہے گناہ ہے، کفر ہے کیونکہ صنفِ نازک کو مذہب یا رسم کے بہانے سے بند کرنے والے مرد اس قابل نہیں۔ چونکہ میں نہ کسی کے جھوٹ سے ڈرتی ہوں نہ مجھے کسی کے سچ کی پروا ہے۔ اس لئے جو اصل واقعات ہیں ان کو مختصراً لکھ دیتی ہوں۔ علو سے میرا بگاڑ اس لئے نہ تھا کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کیا اور مجھے خبر نہ کی۔ یہ تو میری محض کہنے کی باتیں تھیں۔ اصل بات تو یہ تھی کہ جب دو سال بعد علو واپس آیا تو اُس نے مجھ سے بے تکلف گفتگو کی اور مجھ سے معافی مانگی۔ اس بات سے میں جل گئی۔ اُسے چاہئے تو یہ تھا کہ اِس طرح ملتا گویا کہ صرف دو منٹ جدا ہوئے گزرے ہیں۔ اور اُسے یقین ہوتا کہ علو چاہے دنیا بھر کا نالائق ہو مگر اُسے ناہید سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر حال میں ناہید کا ہیرو ہے۔ اُس نے جو معافی مانگنے کی حرکت کی تو میں بھی اُس سے اس طرح پیش آئی جس طرح ہندوستانی روٹھ جانے والی خاتونوں کا قاعدہ ہے۔ روٹھنا میرے لئے واقعی کسرِ شان تھا مگر کیا کرتی جب خود اپنے ہی مرد کی عقل پر پردہ پڑ جائے اور میں بالارادہ اس وقت تک روٹھی رہی جب تک کہ اس نے بلا تکلف مجھے مسٹر ڈیش کے گھر میں گود میں نہ اٹھایا مجھے اُسے سبق سکھانا تھا کہ عشق میں تکلف کفر ہے۔ باقی رہا مسٹر ڈیش سے پیار کرنے کا قصّہ سو اس میں صرف اِسی قدر سچ ہے کہ جب مسٹر ڈیش سے خلافِ عادت زبان درازی کر کے اُن کے گھر سے بلا اجازت رخصت ہوئی تو بعد میں مجھے خیال آیا کہ مجھے تو میرا علو مل ہی چکا ہے لاؤ مسٹر ڈیش کے آنسو تو پونچھ دوں۔ دوسرے دن اُن کو بلوایا تو وہ حضرت

بھی معافی مانگتے ہوئے وارد ہوئے۔ اِس پر مجھے ان کو بنانے کا خوب موقع ملا اور ہماری گفتگو حسب ذیل ہوئی۔

ناہید۔ آپ نے جو کچھ کیا اس نیت سے کیا کہ علّو کی اور میری صلح صفائی ہو جائے۔ میری یہ غلطی تھی کہ آپ سے ناحق زبان درازی کی۔

مسٹر ڈِیش۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے کہ آپ مہمان تھیں اور مجھ سے آپ کی دل آزاری ہوئی۔

ناہید۔ آپ بڑے ہیں میں چھوٹی ہوں۔ معافی مانگنے کا حق میرا ہے۔

مسٹر ڈِیش۔ اِس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال نہیں۔ غلطی کی ابتدا مجھ سے ہوئی۔

جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو ہم دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل سر جھکائے کھڑے تھے۔ علّو کی طبیعت ہمیشہ سے چلبلی ہے اور اُس نے چپکے سے پہلو میں آ کر گردنوں میں ہاتھ دے کر ہم دونوں کے سر بھڑا دئیے۔ اور اِس پر ہم تینوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور معافی کا ذکر اس قہقہے میں بہ گیا۔ یہ ہے اُس تمام بپار کا قصّہ۔ اِس کی نسبت جتنا کسی کا جی چاہے جھوٹ جوڑ لے۔ بقلم خود ناہید"

تمہارا دوست علّو

عبدالعزیز

پرتوِ افکار

الٰہی آج یہ کیا ہو گیا زمانے کو	کہ ہے گناہ وسیع الخیال ہونا بھی
خزاں کی زد میں آ واز کہہ رہا ہے شجر	کہ تخم کو ہے غنیمت نہال ہونا بھی
جو چوٹیوں پہ ہے وہ گھاٹیوں سے گزرا ہے	کمال کی ہے علامت زوال ہونا بھی
نہ شکوہ سنج مزاج شرح ہو کیوں کر	محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

دلِ برشتہ کی وہ خاک ہوں میں اے افسرؔ
نہ آیا جس کو کبھی پائمال ہونا بھی

حامد اللہ افسر

سرودِ مستانہ

در شالا باغِ کشمیر گفتہ شد

(۱)

چہ خوش روزگارے بود بانگارے
لبِ جُو بیارے بزیرِ چنارے
سرِ سبزہ زارے برآبشارے
بہ ساقیٔ مہ طلعتے گلعذارے
بہ خنیاگرے رازداں رازدارے
بہ باغِ نشاطے و یا شالا مارے
چہ خوش روزگارے بود بانگارے   لبِ جُو بیارے بزیرِ چنارے

(۲)

گلان سر زنند از دلِ مرغزاران
ہزاران سرایند بر شاخساران
لبِ جُو بیاران نشستند یاران
بخوابند و غلطند بر سبزہ زاران
برقصند و بجہند چوں مے گساران
بخوانند با نغمۂ آبشاران
چہ خوش روزگارے بود بانگارے   لبِ جو بیارے بزیرِ چنارے

(۳)

بباغ اندر آبیں بساطِ زمین را
گل و سبزہ و لالہ و یاسمین را
بزیرِ درختان غزالانِ چین را
لبِ آب غلمان و حورانِ عین را
ثنا خوانِ خدائے جہان آفرین را
وزان پس بزن نغمۂ آتشیں را
چہ خوش روزگارے بود بانگارے   لبِ جو بیارے بزیرِ چنارے

(۴)

ز ہر سو غزالے بباغ انجمن شد
بساطِ چمن چون دیارِ ختن شد
ز خوبان ہزاران چمن در چمن شد
چمنہا ہمہ پُر ز یاس و سمن شد
تو گوئی گلستان بہشتِ عدن شد
ز فرطِ طرب آبہا نغمہ زن شد
چہ خوش روزگارے بود بانگارے   لبِ جو بیارے بزیرِ چنارے

(۵)

سر از خاک زد جلوۂ آتشینے
پر از اختران چون فلک شد زمینے
درے باز شد از بہشتِ برینے
بخواہم ہمی پُر زمے ساتگینے
کہ تا بہرِ درمانِ قلبِ حزینے
چو مستان سرودے زنم با حسینے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۶)

بجوی اندر آید ز کہسار آبے
درخشان چو برقے روان چون سحابے
بدل ماہتابے بہ تن آفتابے
ہمہ مستی آرد چو جامِ شرابے
ہمہ نغمہ دارد چو تارِ ربابے
ہمانا بخواند بما این خطابے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۷)

چہ خوش بوستانیست اللہ اکبر
بحیرت ہمی بیندش چرخِ اخضر
بآبش قسم مے خورد حوضِ کوثر
لبِ جوئے بنشیں بہ مینا و ساغر
بزن پشتِ پا بر بساطِ سکندر
برقص و بخواں با بتانِ سمن بر
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۸)

بیا مطربا زن سرودے نوائے
کہ دارم ببر ماہِ گلگوں قبائے
مہِ دلستانے مہِ دلربائے
پری چہرہ لالہ رخے خوش ادائے
بیا و بزن با حریفاں صلائے
بدہ سازِ ایں جامۂ دلکشائے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۹)

بیا ساقیا ریز بادہ بجامے
بگو از حریفاں سلامے پیامے
بخواہم مئے آتشیں لعل فامے
کہ سوزد ہمی دفترِ ننگ و نامے
بدہ آفتابے بہ ماہ تمامے
بہ بادہ گساراں چہ صبحے چہ شامے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۰)

بیا ساقیا آر جامِ شرابے
کہ یک جا ببینم مہ و آفتابے
و یا باز کن نرگسِ نیم خوابے
ببیں از در ملکِ جان انقلابے
کہ تا مست گردم بگیرم ربابے
سرایم چو مرغے برقصم چو آبے
چہ خوش روزگارے بود با نگارے لبِ جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۱)

بخواہم بخوبانِ کشمیر رقصم
بہ سبزہ و دو گل با ہم و زیر رقصم
لب آب جُو پا بزنجیر رقصم
بلغزم بیفتم چو نخچیر رقصم
بآتش عذاران بشمشیر رقصم
بیاد زمانِ جہانگیر رقصم
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۲)

خوشا آن زمانے خوشا روزگارے
کہ بُد مردمِ ہند را شہریارے
خوشا شہریارے خوشا غمگسارے
کہ دردورِ او ملک شد لالہ زارے
ہمی خورد مردم مئے پُر شرارے
ہمی خواند با گلرخاں چوں ہزارے
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیرِ چنارے

(۱۳)

سلامے بخوانم بآں روزگاراں
سلامے فرستم بآں شہریاراں
خدایا ز گلزارِ ما شد بہاراں
ز ابرِ کرم باز بفرست باراں
برویاں بہار از برِ کوہساراں
کہ رقصیم و خوانیم بر جویباراں
چہ خوش روزگارے بود بانگارے لب جویبارے بزیرِ چنارے

محمد اکبر منیر

دردِ محبّت

یہ کچھ ہمارے درمیان محبت کا دکھلاوا نہیں میرے پیارے! بارہا طوفان کی دردناک راتوں نے مجھے آ لیا۔ اور میری شمع گل ہوگئی! تاریک شبہات چھا گئے اور میرے آسمان سے تمام ستاروں کو ملیا میٹ کر دیا! بارہا کنارے ٹوٹے اور طغیانی میرے فصل کو بہا لے گئی! اور چیخ پکار اور مایوسی نے میرے آسمان کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک شق کر دیا! لیکن یہ میں نے جان لیا ہے کہ تیری محبت میں درد کے صدمے ہوتے ہیں موت کی سرد مہری کبھی نہیں ہوتی!!

"گلچیں"

جمیل نے ثروت کو بارہا پہلے دیکھا تھا اور آج بھی دیکھا۔ لیکن آج دیکھا تو وہ ایکبارگی ہمہ تن سرور و انبساط ہوگیا مگر ساتھ ہی کچھ غمگین و ملول بھی + اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ایک کھوئی ہوئی چیز اُسے مل گئی، وہی چیز جسے اُس نے چند دنوں اپنے ہم عمر دوستوں عالم اور اختر اور مظفر سے پاکر کہیں کھو دیا تھا + اُسے یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ ثروت اُس کی ہم جنس نہیں۔ ہم جنسوں کی دوستی میں اُس نے کب دیکھا تھا کہ قابلِ عمل کیا ہے اور کیا نہیں۔ دوستی میں اُس نے نہ کسی مصنف کی پند و نصائح سے فائدہ اٹھایا نہ کسی بزرگ سے مشورت کی کہ ایک نوجوان کو کیونکر اس راہ میں گامزن ہونا چاہئیے اور نہ خود کبھی غور کیا کہ اس امتحان میں کامیابی کیسے ہوسکتی ہے؟

جمیل نے ثروت کو دیکھا ثروت نے جمیل کو۔ لیکن جمیل نے وہ کچھ دیکھا جو پہلے کبھی اپنی آنکھوں نہ دیکھا تھا اور ثروت نے شاید وہی دیکھا جو وہ بارہا پہلے دیکھ چکی تھی + جمیل نے ثروت کو ثروت کہہ کر پکارا تو اُس نے حسبِ معمول جواب دیا لیکن جب ثروت نے جمیل کو جمیل کہا تو اُس کی رُوح و رواں میں ایک لرزش سی پیدا ہوگئی اور بجز اِس کے کچھ جواب بن نہ پڑا کہ اُس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور خاموش ہوگیا + وہ کہتا تو کیا کہتا کہ اب "ثروت" کا لفظ جمیل کے لیئے دنیا بھر کا سب سے زیادہ ناقابلِ اظہار جذبہ ہوگیا تھا!

اُسے اِس بات کا کچھ علم ہوچکا تھا کہ لڑکے لڑکی کی دوستی مشرقی تہذیب کے منافی ہے۔ وہ اِس تہذیب کا پابند تھا اور اِس لیئے محبت کے اولین جذبات کے پیدا ہوتے ہی اُس کے منہ پر مُہرِ خاموشی ثبت ہوگئی۔ جہاں وہ اپنی عزیزہ ثروت سے دوسروں کے ہوتے یا تنہا بھی بہت سے کھیل کھیل سکتا تھا اور بہت سی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہاں اب برسرِ محفل وہ اُسے اُس کے نام سے بھی نہ پکار سکتا تھا!

جمیل نے اُس چاندنی رات میں آبشار کے کنارے حسن کا وہ سیمیں ہلال دیکھا جس نے اُس کے دل کی ندی میں سمندروں کا طوفان برپا کردیا! وہ نہ سمجھا کہ یہ کیا ہوا اور کس لیئے؟ وہ سمجھا تو یہی سمجھا کہ اُسے وہ ہم خیال مل گیا ہے جس کی اُسے تلاش تھی جو پایا جاکر بسا اوقات کھویا گیا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس کے نقطۂ نظر سے یہ تھا بھی بالکل درست + اُسے اک رفیق کی تلاش تھی ـــــ تو کیا یہ رفیق وہی نہ تھا، وہی نہ تھی جس کی اُسے اک زمانے سے جستجو تھی؟!

رات اور رات بھی چاندنی، باغ اور باغ بھی پانیوں کی ہلکی شورش اور پھولوں کی بھینی نکہت سے مست و مخمور، صحبت اور صحبت بھی بھولے بھالے معصوم بچوں اور ہم عمر عزیزوں کی ـــــ اس فضا میں محبت کا وہ چشمہ پھوٹا جو خدا جانے کب سے زندگی کے کہسار کے نیچے نیچے اپنا سر پٹکتا ہوا روشنی کا رستہ ڈھونڈ

رہا تھا!

جمیل کا جی بھر آیا۔ اُس نے چاہا کہ وہیں کسی پھولتے پھلتے گلزار کے پاس اُس آبشار کے قُرب میں جہاں چاند کی چاندی پانی کی روانی میں گھل رہی تھی وہ اور ثروت تنہا بیٹھ جائیں۔ یہ اُسے اور وہ اِسے اپنی ساری رام کہانی سنا دے یہ اُس کے آگے اور وہ اس کے سامنے وہ شیریں گیت گا دے جو چاند اپنی چاندنی جو پھول اپنی نکہت اور جو آبشار اپنی روانی میں الاپتا ہے ۔۔۔۔ گیت وہ گیت جو ہم آہنگ ہیں وہ دونوں گیت جو فی الحقیقت ایک ہی گیت ہے! بچپن کی دلچسپ و دلفریب باتیں ہوتی جائیں، محبت کی طول طویل کہانیاں کہی سُنی جائیں ۔۔۔ اور یوں ہی یہ چاندنی رات ہو اور یہ رات یوں ہی چاندنی ہوتی جائے کہ کبھی اِس کی صبح نہ ہو اور ہو تو اِس کٹی پھٹی روشن دنیا میں نہ ہو بلکہ کہیں اَور کسی اَور سرزمین میں جہاں دہن پھول ہو اور گفتگو اُس کی نکہت!!

---

(۲)

جمیل کی زندگی اُداسی اور ناخوشی کا مرقع بن گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ثروت کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُس کی باتیں اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اُس کی آنکھیں اُس کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمیل کی رُوح ثروت کے وجود سے معمور ہو گئی اور پھر کسی اَور شئے یا تصور کے لئے وہاں جگہ باقی نہ رہی!

لیکن انسان محض اِک روح نہیں۔ اُس کا ایک جسم بھی ہے اور پھر اُس روح اور اُس جسم کی کڑیاں ہیں جنہیں ہم نفس و دماغ کہتے ہیں۔ جب تک یہ قفسِ عنصری ہے جب تک یہ کڑیاں ہیں ہم ایک قید میں ہیں اور اس قید ہی سے ہماری دنیاوی زندگی ممکن و مرتب ہے۔

جمیل شرمیلا تھا، کمزور تھا، پابند تہذیب و تمدن تھا۔ اِس لئے لازم ہوا کہ اپنے جذبۂ محبت کے متعلق وہ خاموش رہے اور زندگی کو حسب سابق جاری رکھے۔

علاوہ بریں وہ اپنے مخصوص خیالات کے سلسلے کا پابند بھی تھا۔ اُس کے خصوصی جذبات محبت اظہارِ محبت کو اک لغزش اور رسمی تکمیلِ محبت کو اک گناہ کبیرہ تصور کرتے تھے۔

جب اُس کے دل نے پہلے پہل سوچا کہ مرد عورت کی محبت کا انجام شادی اور شادی بھی خانہ آبادی ہوتا ہے تو عرقِ ندامت کے قطرے اُس کی پیشانی سے ٹپک پڑے اور اُس نے اپنے جی سے پوچھا کہ کیا میرے آغازِ محبت کی غرض یہی تھی؛ اور پھر بآوازِ بلند کہا کہ مرد عورت میں محبت نہیں ہوتی اور نہ لڑکے لڑکیاں مرد اور عورت ہی ہوتے ہیں۔

جب اُسے یہ معلوم ہؤا کہ یا وہ ثروت کو شادی کے ذریعے سے حاصل کر سکتا ہے اور یا کوئی اور اُسے اپنے لئے حاصل کرلے گا تو اُس کے دل میں "ناممکن" کی صدا اُٹھی اور اُس نے کہا کہ ثروت میرے حصول کے لئے نہیں۔ اُسے کوئی حاصل کرلے تو کیا کرے لیکن اُس سے یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نہ رہے گی جب تک "میں" ہوں ثروت بھی چاہے تو اپنے تئیں مجھ سے نہ چھین سکے گی اور میں بھی چاہوں تو اپنے کو اُس سے جدا نہ کر سکوں گا۔ اُس نے کہا کہ جب دل حسن کی پاکیزہ ترین صورت کو دیکھ لے وہ صورت جو محبت سے معمور ہو وہ صورت جس میں محبت وعصمت و قوت مستور ہوں جب دل ایسے زندہ و پایندہ حُسن کو دیکھ لے تو اُس حُسن کا لطیف جوہر اُس دل میں جگہ پالیتا ہے اور پھر حسن بھی اُسے وہاں سے خارج نہیں کرسکتا۔ پُر محبت دل حُسن میں اُس محبت کو ڈھونڈتا ہے جس کی کائنات بھر میں ہر شئی کو تلاش ہے۔ پھر وہ حسن کھویا جائے لیکن وہ محبت فنا نہیں ہوسکتی۔ زندگی کے ساز میں جب صدائے محبت ایک بار ارتعاش پیدا کردے تو اُس کا تار تار ہم آہنگی میں محوِ اہتزاز ہو جاتا ہے۔ پھر ساز ندہ ساز چھوڑ دے لیکن موسیقی اُس ساز میں ہمیشہ کے لئے گھر بنا لیتی ہے!

اور جمیل نے کہا "ثروت! میری تیرے لئے محبت درحقیقت تیری میرے لئے محبت ہے۔ خواہ تجھے میرا خیال بھی ناگوار ہو"!

غرض اِن جنوں زا روح پرور خیالات کی کشمکش میں جمیل دنیا اور زندگی کو صرف محبت کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ سچ یہ ہے کہ دنیا اب اگر تھی تو محض اُس کے حواسِ خمسہ کے لئے اور زندگی پہلے اُس کے لئے نہ بھی تھی تو اب محبت کے بلوریں منشور میں سے وہ نہ فقط نظر آئی بلکہ اس کے ایک ایک پہلو پر رنگ رنگ کی خوشنما روشنیوں کا عکس پڑا۔ کائنات سمٹ کر زندگی، زندگی سمٹ کر محبت اور محبت سمٹ کر ثروت بن گئی۔ رات کے وقت وہ کہکشاں کے دائیں بائیں کے دو ستاروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور کہتا کہ وہ ثروت ہے اور یہ جمیل جنہیں دنیا کے رسمی گرد و غبار نے ایک دوسرے سے جُدا کر رکھا ہے بارہا شب کو سوتے وقت اُس کا لباس تر ہوگیا اور گرمی کی بہت سی کٹھن دوپہریں بھی ایسے ہی کرب واندوہ میں کٹ گئیں۔ صبح و شام اُس کے خیالات شعر وسخن کے جھولوں

میں جھولا کئے اور اُداسیاں روز بروز اُس کے دل پر گھٹائیں بن بن کر چھا گئیں + وہ اکثر تنہا رہتا اور اُس کا دل تخیل کی عزلت میں اپنی ثروت کو پہلو میں بٹھا لیتا، اور اُس کے زبان وقلم بھی اکثر اُسے روبرو جان کر اُس سے ہم کلام ہوا کرتے!

ایک روز اُس نے اپنے اک خیالی نامۂ محبت کو اِس حسرت سے ایک رنگیں لفافے میں بند کیا اور اُس پر "ثروت کو ملے" لکھا کہ اُس سے شبہ ہوا کہ اب اُس کے جذبات قابو سے باہر ہو رہے ہیں اور شاید کوئی نیا گل کھلا چاہتا ہے + تاکہ اُس کی بھولی بھالی دلبر کی حسین نگاہ کسی ناموزوں لفظ سے آزردہ نہ ہو جائے اُس نے لفافے کو دوبارہ کھولا اور اُس کے جملوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شروع کیا:-

میری ثروت!

میں نہیں جانتا کہ اِس سرنامے کو دیکھ کر تم کیا کہو گی؟ ثروت! تم میری اس لئے نہیں کہ میں تمہیں اپنی بنانا چاہتا ہوں۔ تم "میری" محض اِس لئے ہو کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم میری ہو صرف اِس خلوت میں صرف اِس ساعت میں جب کہ تم خود میرے سامنے نہیں، دنیا میں تم میری نہیں، تم اپنی ہو یا پھر جس کسی کی بھی تم ہونا چاہو!

ثروت! میرا وجود تو محض اِس لئے ہے کہ میرے دل میں تمہارا عکس نظر آئے تمہارے حسن سے میرے دل میں محبت کے جذبات پیدا ہوں، تمہارے خیالوں سے میری تنہائیوں کی دنیا معمور اور تمہاری آنکھوں کی یاد سے میری تاریکیاں پُر نور ہو جائیں! میری ثروت!

تمہارا جمیل

ساتھ ہی ایک پرزے پر یہ شعر بھی تھے:-

مُورت مری صورت تری ثروت مری پیاری!
راحت مری چاہت تری ثروت مری پیاری!
غم میرے لئے، تیرے لئے لُطف و مسرّت
عشرت مری خدمت تری ثروت مری پیاری!
چہرے میں حیاء سر میں خرد، دل میں محبت
آنکھوں میں مروّت تری ثروت مری پیاری!

کُلفت بھی ہو مجھ کو تو وہ کلفت نہیں مجھ کو

غم خوار ہے اُلفت تری ثروت مری پیاری!

تنہا جو نہ ہوتے تو نہ قسمت سے تجھے روتے

آفت ہے محبت تری ثروت مری پیاری!

ننھا سا ترا دل ہے مرے پیار سے آگاہ

ہاں چپ کی ہے عادت تری ثروت مری پیاری!

ثروت نے اُسی روز سہ پہر کو اپنی میز پر ایک لفافہ پڑا پایا۔ کھولا تو دیکھا ـــــ "میری ثروت"! دپھر گھبرا کر راقم کا نام دیکھا تو لکھا تھا) ـــــ "تمہارا جمیل" ـــــ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خط کو پھر پڑھنا شروع کیا ـــــ "میری ثروت!" ـــــ کہ اتنے میں چونک کر جاگ اُٹھی۔ کنکھیوں سے میز کی طرف دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ شرما کر پھر لیٹ گئی۔ لیکن اب نیند ان شیریں آنکھوں میں کب آتی تھی؟

---

(۳)

جمیل کی آنکھوں میں تو ثروت جو کچھ تھی سو تھی لیکن یوں بھی یہ دوشیزہ حسن وجمال کا اک تازہ مرقع تھی۔ اُس کا قد میانہ، اُس کی چال موزوں اور اُس کی چھب دلکش تھی۔ اُس کے رخساروں میں صباحت کی چمک اور اُس کی آنکھوں میں حیاداری کی جھلک تھی۔ اُس کا ذرا گول سا چہرہ، اُس کی ستوان اُٹھی ہوئی ناک، اُس کی لانبی لانبی پلکیں اور اُس کے پتلے پتلے ہونٹ ایسے متناسب تھے کہ وہ حسین صورتوں کے درمیان ایک چینی کی مورت معلوم ہوتی تھی! اُس کی نگاہ شرمگین تھی لیکن اُس بچپن کے عالم میں بھی اِس ادائے شرم کی خوش رنگ سطح کے نیچے معصوم شوخی اور انجان محبت کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھتی معلوم ہوتی تھیں! وہ اپنے حُسن سے قطعی ناآگاہ تھی اور دلبرانہ اداؤں کے مصنوعات سے یکسر آزاد بچپن اُس کے بھولے بھالے چہرے پر سبک پرواز بادلوں کی طرح منڈلاتا تھا اور طفلانہ شوخی اُس کے لب و دنداں پر قوسِ قزح کی طرح کھیلتی تھی! اُس کی مسکراہٹ میں ایک نرم ونازک غنچے کی شگفتگی تھی اور اُس کے قہقہوں میں کسی رنگیں نوا بلبل کے چہچہے! وہ محض حسن نہ تھی، وہ حسن کے ساتھ معصومیت، معصومیت کے ساتھ محبت اور محبت کے ساتھ زندہ دلی بھی تھی!

وہ تنہائی پسند نہ تھی، قدرت نے گویا اُسے محفل آرائی کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ وہ جس محفل میں شریک

ہوتی محفل کا گلدستہ بن جاتی وہ جس مجمع میں بیٹھتی اُس کی زیب و زینت ہو جاتی تھی ۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں کھیلتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ چاند کی کشتی تاروں کے کنول پھولوں کے بیچوں بیچ آسمان کی نیلگوں جھیل میں رواں ہے ! اے کاش وہ یونہی کھیلتی رہتی ، دریائے طفلی کے ہنڈولے میں یہ گوہر شاہوار یونہی اپنے صدف میں جھولتا رہتا اور کسی کی نظر اُس پر نہ پڑتی ، بچپن کے رنگا رنگ پھولوں کے درمیان یہ چڑیا یونہی چہچہاتی رہتی ـــــــ مگر مشرق کی دنیا میں جہاں بے نظر پڑے عقاب اپنے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے ۔ یہ کیونکر ممکن تھا ؟

اُس کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی ۔ وہ انگریزی اور اردو اور فارسی علم ادب میں خاصی دسترس رکھتی تھی اور تاریخی کتب سے اُسے خاص شغف تھا ۔

غرض ثروت حُسن و اخلاق اور تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے ہمہ صفت موصوف تھی !

جمیل جو انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اب کالج میں داخل ہونے والا تھا ثروت کے بھائی حمید کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا ۔ حمید کی اُس کی خاصی دوستی تھی ۔ حمید کی خواہش پر اُس کے والد نے شیخ نعیم الدین سے اصرار کیا کہ جمیل کو بجائے بورڈنگ ہوس میں داخل کرنے کے حمید کے ساتھ ہی لاہور میں رہنے دیں ۔ مردوں مردوں میں یہ باتیں ہوئیں لیکن مردوں کی وہ خانگی کنجیاں جن کے بغیر مُراد کے قفل کبھی کھل نہیں سکتے باہمی تعلقات کی پیچیدگیوں کو بہتر جانتی تھیں ۔ ثروت کے لئے در پردہ پیام آنے شروع ہو گئے تھے اور اُس کی والدہ بدر النسا اس تاک میں تھیں کہ ننھے پھول کے شیدائیوں میں بہترین گلچیں کونسا نکلے ۔ جمیل اچھا لڑکا تھا لیکن محض داشتہ آید بکار ۔ اُس کے مقابل میں زیادہ موزوں امیدوار موجود تھے اور انہیں میں سے انتخاب ضروری تھا ۔

اُدھر جمیل کی والدہ خورشید بیگم کے اپنے منصوبے تھے ۔ ہر چند جمیل کے لئے علیم الدین کا گھرانا اونچا نہ تھا لیکن بجائے بدر النسا کے گھر میں چاند تارا کرنے کے اُسے اپنی بہن کا کلیجا ٹھنڈا کرنا تھا اور پھر عذرا لڑکی بھی کسی سے کم نہ تھی ؟ سو نہ ثروت کی والدہ نہ جمیل کی والدہ کسی طرح اُن کے رشتے پر راضی تھیں ۔ اس لئے وہ اُن کے ایک ساتھ رہنے کے مخالف تھیں ۔ لیکن علیم الدین مغربی وضع کے ایک فراخ دل آدمی تھے ۔ چار راتوں کے قانونی جنگ کے بعد میاں نے بیوی کو سمجھا بجھا کر منا لیا کہ اکٹھے رہنے سے رشتے ناتے کو کچھ تعلق نہیں کیونکہ اب بارہا ایسے موقعے پیدا ہوا کریں گے اور ہونے بھی چاہئیں کہ نوجوان لڑکیاں لڑکوں سے ملیں جلیں اور

طرفین کے دل میں شادی کا خیال پیدا نہ ہو۔ بدرالنسا کی مزید تسلی ہوگئی جب ایک روز خورشید بیگم نے باتوں باتوں میں پیش بندی کے طور پر جتا دیا کہ جمیل کے لئے اُس کا خیال کدھر کو ہے؟

جمیل "علیم منزل" میں رہنے لگا۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس نے بہتیری کوشش کی کہ وہ معمول کے موافق زندگی گزارے۔ تیار ہوکر کالج جائے وہاں پڑھ پڑھا کر کالج کی بازی گاہ میں جاکر کوئی کھیل کھیلے۔ شام کو کسی طالب علمانہ مباحثے میں حصہ لے اور رات کو توجہ سے پڑھا ہوا دہرائے اور یوں باقاعدہ اپنا کام کرتا رہے۔ وہ اُن نوجوان مسلمان عشاق کی طرح تو تھا نہیں جو بمصداق

علی الصباح کہ مردم بکاروبار روند
بلاکشانِ محبت بکوئے یار روند

دن کو گریبان چاک ہوکر کوچوں میں گھومتے شام کو غزل لئے مشاعروں میں پڑا جائے اور رات رات بھر "سحر البیان" یا "زہرِ عشق" کی مثنویوں یا شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنوں کے قصوں میں ہمہ تن مستغرق رہتے ہیں۔ گریبان کھلا ہے۔ سر کے بال ہر سمت لہرا رہے ہیں جہاں جاتے ہیں گنگناتے ہیں "مزا دیتے ہیں بار تیرے بال گھنگروالے" جب تک جیب میں چاندی ہوئی ہر دوسرے روز سنیما میں جا دھمکے کہ اَور کچھ نہیں تو مغربی محبت کے ناز و ادا کے نظاروں ہی سے دل کی کچھ تسلی کرلیں اور ہفتے میں دو بار ضرور تھیئٹر میں جا ڈٹے کہ "دہو بڑی بانکی دُلھنیا موہنیا" والا پارٹ سن کر اپنی آئندہ "چھیلی البیلی" کا سراپا آنکھوں دیکھ لیں اور رات کو خواب میں "دلی گوری نار" سے زندگی کے ڈرامے کی تکمیل کرلیں۔ نہ تعلیم سے غرض نہ عزیزوں سے واسطہ نہ قوم کا جھگڑا نہ ملک کا ٹنٹا۔ ہندو مسلم لڑیں تو اُن کی بلا سے۔ انگریز ڈیم فول کہہ کر "کسی کالے لوگ" کو ریل کے فرسٹ کلاس سے ٹھکرا یا کرے تو ٹھکرا یا کرے یہ حضرت رواداری اور بے اعتنائی کی تصویر ہیں۔ باوا کمایا کرے یہ کھایا کریں اور کھانا بھی کیسا؟ یہ عشق کے پھیر میں ہیں کچھ بھوک لگی تو خیر کچھ زہر مار کرلیا ورنہ بالعموم تو

نہ کھانے کی سُدھ اور نہ پینے کا ہوش
بھرا دل میں اُس کے محبت کا جوش

اور اتفاق سے

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

کسی کے ہاں شادی ہو تو اور ماتم ہو تو اُن کا وہی ایک سا عالمِ استغراق ہے۔ کوئی مرتا ہے لوگ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہیں مگر ان کے وردِ زبان وہی

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

خدا نے کائنات بنائی مگر سوائے ان حضرتِ دلگیر اور ان کے رنگیں ادا دلربا کے سب محض بے سود۔ نری رکاوٹیں، خالی لغویات فقط خشک نمائشیں۔ دنیا کی تاریخوں میں دین کے قصوں میں بہت کچھ ہو گزرا مگر یہ بات کہاں؟

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

نہیں جمیل کے جذبات بے معنی ہوں ناممکن التکمیل ناقابلِ عمل سب کچھ سہی لیکن متانت سوز اور حیات کُش نہ تھے۔ کم از کم اپنی طالب علمانہ زندگی میں اُس نے اپنے مقررہ کام کو بوجہ احسن سرانجام دیا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ انگریزی وار دو علم ادب کے چمن سے ہمیشہ رنگ رنگ کے پھول چنا کیا + لیکن گو جمیل کی محبت تضیع اوقات نہ تھی اُس کی زندگی کے تقسیمِ اوقات میں بظاہر اُس کا کچھ زیادہ حصہ نہ تھا لیکن اُس کے دل و دماغ پر ایک زائد بار گراں پڑ گیا جس کے باعث اِس بالی عمر میں وہ اُس جسمانی چستی اور قلبی خوش خیالی سے محروم ہو گیا جو جوانی کا طغرائے امتیاز ہے۔

بظاہر یہ ہوا کہ راتوں کو چھپ چھپ کر رونے سے اُس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی۔ اُس کے چہرے پر چھائیاں سی پڑ گئیں اُسے کھیل کود سے دلچسپی نہ رہی وہ ہم عمروں کی صحبت سے پرہیز کرنے لگا۔ غم انگیز اشعار اور پُر درد واقعات میں اُس کے لئے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی + باقی وہ اپنے کالج کے ہونہار طلبا میں سے تھا۔ ادب سے اُسے گہری دلچسپی اور بالخصوص فارسی عربی سے اُسے خاص الفت تھی۔ البتہ ایسے مضامین سے وہ گریز کرتا جو اُس کے نزدیک طبیعت کے اسپِ تازی کے ساتھ ایک ٹوٹے ہوئے چھکڑے کی طرح باندھ دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ اگر امتحان میں ناکامی کا ڈر نہ ہوتا تو طبیعیات میں سوائے اس کے کہ "پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے" اُسے کسی اور حقیقت کا علم نہ ہوتا۔

اِس سے پہلے جمیل گاہے گاہے جب کبھی ثروت کو دیکھتا تو خوشی کے ساتھ مایوسی اور تسکینِ قلب کے ساتھ

اک نوع کی گرانی بھی محسوس کرتا اور جب اُس کا دل اُسے اِس پر ملامت کرتا تو وہ چپکے چپکے لسان الغیب کے یہ شعر گنگنانے لگتا۔

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ درمنقار داشت ۔ واندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش درعینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست ۔ گفت مارا جلوۂ معشوق دراں کار داشت

لیکن یہ آہ و زاری خوشیوں سے یہ بیزاری یہ ترکِ صحبت یہ میلانِ کلفت ثروت کی قربت سے یہ سب کے سب دفعتہً لطف و مسرت کے جذبات میں تبدیل ہو گئے + اور کیونکر نہ ہوتے چمن سے دُور دشتِ فرقت میں بلبل محوِ فغاں ہوا کرے لیکن چمن زار میں اپنے ننھے پھول کو آ کر دیکھتے ہی کیونکر ہمہ تن سور و انبساط نہ ہو جائے + یہ جمیل کے لئے کوئی اک معمولی بات نہ تھی کہ اُس کی ثروت دن رات اُس کی نظروں کے سامنے ہو اور نظروں کے سامنے ہونے کے معنی بھی کوئی اُس وارفتہ مزاج نوجوان سے پُوچھتا + جس قدر اُس کا ثروت سے کوئی بات بھی نہ کرنا ایک غیر معمولی بات تھی اُسی قدر اُس کا عموماً اُس کی طرف دیکھتے ہی رہنا ایک صاحبِ نظر کے لئے قابلِ غور امر تھا + کچھ دنوں کے بعد جمیل ذرا سنبھلا اور اب ایک معمولی انسان کی طرح پہلے کی بہ نسبت زیادہ بولنے اور کم دیکھنے لگا + اُس کا جی یہی چاہتا تھا کہ نہ کچھ بولے نہ بُلائے بلکہ صرف اک دیکھے ہی جائے۔ ثروت کی آنکھوں میں دلکشی بھی حدِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ اُسے موتی کی دمک جانیئے یا کسی پھول کی چمک، ابر آلود افق میں سے آفتابِ صبح کی تنک تابی کہیئے یا تاروں بھری رات میں سُہا یا زہرہ کی جھلملاہٹ + ثروت کی نگاہوں میں وہ معصوم حسن جلوہ ریز تھا جس کا جواب محض جمیل کے دل کی بے لوث و بے غرض محبت تھی + اُس کا جی چاہتا تھا کہ دیکھے اور دیکھتا رہے۔ مگر اِس آوارۂ شباب و پابندِ قواعد دنیا میں جہاں محبت ایک جنسی غرض اور گفتگو ایک کاروباری معاملہ ہے کوئی کس طرح دیکھے اور کس طرح بولے اور کس طرح پیار کرے کہ وہ دنیا کی نظروں خلائق کے کانوں اور قدرت کے رشک و حسد سے محفوظ و مامون رہے +

یہ رشک و حسد قدرت کے دل میں اُٹھا اور سُوءِ انتقام دیکھئے کہ اُس نے جمیل ہی کو اپنی بہیمانہ عقوبت کا ذریعہ بنایا۔

ثروت کے لئے جو پیغامات کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا وہ گویا حسن و عشق کا ایک معرکہ تھا جس میں قسم قسم کے امیدوار اپنی اپنی برچھی تانے شکارِ حسن کی متاعِ جانفزا لُوٹ لینے کو میدان میں اُتر آئے +

اِن میں محمد سلیم تو اپنے کنبے ہی کے رکن تھے۔ شکل و شباہت دلکش تھی، کالج میں ایف اے میں تعلیم پاتے

تھے اور صفاتِ ستودہ سے پیراستہ تھے - لیکن ان کے وسائلِ معاش فی الحال محض مستقبل کے دستِ غیر مستقل میں تھے ۔

دوسرے امرت سر کے رہنے والے ایک انجنیئر خان بہادر شہامت خاں تھے جو علاوہ پُرصحت اور نجیب الطرفین ہونے کے مال و دولت اور جاہ و مرتبت سے مُزیّن تھے - اُن کے چہرے میں رعب و داب جسم میں زور و توانائی اور چال میں گویا ایک قسم کی شان و شوکت تھی جس سے دیکھنے والا کہہ اُٹھے کہ یہ شخص اگر انجنیئر نہ ہوتا تو ضرور ایک روز وزیرِ زراعت یا سیاسی جلوسوں کا سرگردہ بنتا ۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے "فرزندی میں قبول" کئے جانے کا خلوص نامہ اپنے بڑے بھائی سے یہ کہتے ہوئے ڈاک میں ڈالا کہ شہامت قابلِ ملامت ہوگا اگر وہ ایک روز اِس پری کو اپنے شیشے میں نہ اتار لائے - اُن کا حافظہ کمزور اُن کا غصّہ تیز اور اُن کا "طبیعی" مزاج صبح و شام متغیر و متلون رہتا تھا -

تیسرے بمبئی کے ایک مشہور خاندان کے جس میں پردہ کی پابندیاں رفع دفع کردی گئی تھیں ایک نوجوان بیرسٹر تھے ان کے کچھ حالات بجز اِس کے معلوم نہ ہوسکے کہ یہی صاحب اور اُن کی بیوی اِس زوجیت طلبی کے اٹھارہ سال بعد لاہور والوں سے مصوری میں اسٹیفل کی تفریحی طعام گاہ میں رسمی طور پر ملے -

اِن پیغاموں پر گھر میں آئے دن جب کبھی بیچاری ثروت سب کے درمیان موجود نہ ہوتی یا زبردستی کسی بہانے سے اِدھر اُدھر بھیج دی جاتی گفت و شنید ہوتی ۔ علیم الدین اپنی بیٹی کی اتنی جلد شادی کرنے کے مخالف تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ ان باتوں کا تذکرہ نوجوانوں اور دوسرے عزیزوں کے سامنے ہوتا رہے لیکن بدرالنساء اِن فرضی اصولوں کی اصولاً دشمن تھیں - اول تو اُن کا خیال تھا کہ شادی میں نہ عجلت کرنی چاہیے نہ تاخیر بلکہ فقط مصلحتِ وقت کو دیکھنا چاہیے اور دوسرے مخفی معاملات اگر طشت از بام نہ بھی ہوں تو بعض اوقات اُنہیں خود ظاہر کردینا چاہیے تاکہ پیغام بھیجنے والوں کے حُسن و قبح پر بخوبی روشنی پڑسکے ۔ اُنہوں نے اپنے نرم دل شوہر کو اِس بات پر راضی کرلیا کہ گو ثروت کی جلدی شادی کرنے کی ضرورت نہیں مگر کم از کم اِن "طالبینِ صادقین" کے ٹھیک ٹھیک حالات ضرور دریافت کئے جائیں - ہمارے پاس گنجائش نہیں کہ اس "خفیہ معاشرتی خدمت" کے عام نفسیات اور خاص رپٹوں پر تنقید کی نظر ڈالیں -

لیکن جو بات ہمارے نقطۂ نگاہ سے اہم ہے وہ یہ تھی کہ جمیل کا دل روز بروز ان خانگی مباحث کو سُن سُن کر متہیج و مضطرب ہوتا گیا - بے اطمینانی نے ملال اور ناآگاہی نے یاس کے ساتھ مل کر اُس پر ہونے والے

واقعہ کی دل سوز بجلیاں گرائیں + کیا اُسے محض اِس بات کا رنج تھا کہ کسی کی طفلی کے دن جن میں وہ بھی شریک بازی رہا ہے ختم ہونے والے ہیں؟ کیا اُسے اِس کی فکر تھی کہ جس کی ساری زندگی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے کیا جا رہا ہے اُسے ایوانِ مشورت سے بارہ پتھر باہر نکال دیا جاتا ہے؟ یا کیا اُس کی عقل اِس پر ہنس رہی تھی کہ جسے تو سچی محبت کی نظر سے دیکھتا ہے وہ عنقریب عمر بھر کے لئے کسی اَور سے رسمی طور پر چپیک دی جانے والی ہے اور تُو چپ چاپ بیٹھا اپنے خیالوں میں محو ہے؟ یا کیا اُس کی ننھی آرزو آبدیدہ ہو کر کہہ رہی تھی کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر میرے سارے تخیلات ہیچ اور میرے سارے تصورات قطعی طور پر ملیا میٹ ہو جائیں گے!

شاید یہ سبھی عمل پہلو بہ پہلو دل میں جاری تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ اس جذباتی کش مکش پر اُس کی شاعریت وخیال پرستی نے اپنے رنگین آنچل ڈال رکھے تھے۔ جن سے جمیل کو خود بھی اپنی دلی خواہشات کی پوری پوری خبر نہ تھی کہ وہ کیا ہیں اور اُن کے لئے بیرونی دنیا میں کیسے نتیجہ خیز فیصلے سنائے جانے والے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اگر حالات خود مساعدت کرتے اگر بجائے اس کے کہ وہ اتحادِ محبت کی طرف قدم بڑھائے اتحادِ محبت خود اُس کی طرف قدم بڑھاتا اور اِس معاملے میں طرفین کے عزیز واقارب ترغیب دیتے تو وہ اُس مادّی ظاہری یگانگت سے بھی انکار نہ کر سکتا جو دنیا والوں کے نزدیک جمیل کی سی روحانی مصاحبت سے کہیں زیادہ قابلِ عمل اور سودمند ہے + لیکن علاوہ اَور باتوں کے ابھی جمیل کی عمر ہی کیا تھی کہ اِس قسم کے سوال اُٹھائے جاتے اور یوں بھی مستقبل مُسکرا رہا تھا کہ تیری قسمت میں وہ کچھ اور وہ سب کچھ ہے جس کا تُوفی الحقیقت تمنائی ہے!

مگر جمیل کو مستقبل کی کیا خبر تھی؟ وہ تو فقط یہ دیکھ رہا تھا کہ بچپن جس کے چمنستان میں وہ اور ثروت ننھی چڑیوں کی طرح اُڑا کئے ہیں وہاں اب اُس کے پیارے آشیانے کے اُوپر شاہین اور باز اور عقاب خوب منڈلاتے پھرتے ہیں اور اُدھر باغبان بھی یہی کہہ رہا ہے کہ یہ رنگین چڑیاں اِن بازوں اور اِن عقابوں ہی کے لئے ہیں + وہ خود ایک ذرا سا پکھیرو تھا اُس میں نہ اپنی ننھی چڑیا کو بچانے کی قوت تھی اور نہ اِن طاقتور شکاری پرندوں کے مقابلے کی تاب +

کہاں تو یہ کیفیت تھی کہ کسی کا نظارۂ جمال جہاں نما ہو رہا تھا اور کہاں اب یہ حالت ہوگئی کہ اُس کے قُرب میں دنیا جمیل کی آنکھوں میں اندھیر ہوتی گئی! کبھی وہ وقت تھا کہ وہ ثروت کی جدائی میں رو کر خوش ہو لیا کرتا تھا اب یہ ساعت بھی آئی کہ اُس کی قربت میں سینے میں ایک ایسی آگ لگی نہ جس کا دھواں آہوں میں نکلتا تھا نہ جس کے شعلے آنسوؤں میں تبدیل ہوتے تھے + نوبت بایں جا رسید کہ یہ اضطرار ناقابلِ برداشت ہوگیا اور

جتنی مسرت جمیل کو یہاں آتے ہوئی تھی اُتنی ہی بےچینی اب یہاں رہنے میں محسوس ہونے لگی!
آخر اک روز اُسے ایک ترکیب سوجھی - اِس ڈر سے کہ اُس کے والد شاید اِس منصوبے سے متفق نہ ہوں اُس نے اپنی والدہ سے کہا کہ وہ لاہور میں خوش نہیں وہاں ایک عجیب بین الاقوامی ماحول ہے جو تعلیم کے سکون میں مخل ہوتا ہے - بہتر ہے کہ اُسے علی گڈھ بھیج دیا جائے + خورشید بیگم بڑی سیانی عورت تھی - اُس کی آنکھ سورج کی طرح چھپی ہوئی چیزوں پر روشنی ڈالتی تھی - اپنے بیٹے کے لاہور جانے کے بعد جلد اُس نے تاڑ لیا تھا کہ اُس کی غلط انداز نگاہیں وہاں پڑ رہی ہیں جہاں سے انہیں ہٹ جانا چاہئے - پس اگرچہ جدائی ماں کو شاق تھی لیکن اُدھر رشتے ناتے میں ساری عمر کا معاملہ تھا اِس لئے اُس نے جمیل کی تجویز پر بخوشی صاد کیا اور نعیم الدین کے سامنے بیٹے کی بےحد تعریف کی کہ کس قدر حوصلہ مند لڑکا ہے کہ سب عزیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر محض اپنی تعلیم و ترقی کے لئے گھر سے اتنی دور جانے کو تیار رہے +
علی گڈھ میں داخلے کا انتظام کر لیا گیا - یہاں کے احباب نے جب اِس سفر کی خبر سنی تو اُن کو رنج و تعجب ہؤا + ہم نے احباب کا ذکر کیا ہے مگر فی الحقیقت جمیل کا صرف ایک ہی دوست تھا - جمیل میں دوستداری کا مادہ ضرور تھا لیکن دوستی بھی اُس کے نزدیک ایک نوع کی محبت تھی جس کا اثر ایک ہی وقت میں صرف دو شخصوں پر حاوی ہو سکتا تھا + یہ دوست اُس کے کالج کا ایک نووارد نوجوان پروفیسر منظور احمد تھا جس سے اُس کی راہ و رسم یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ دونوں میں جلد ایک نہایت گہری دوستی پیدا ہو گئی +
منظور عقل و شکل شرافت و دولت ہر لحاظ سے ایک پسندیدہ نوجوان تھا - ولایت میں تعلیم پائی تھی لہذا مغربی تمدن کی مُہر بھی اُس کی شخصیت پر ثبت تھی - اس پر طُرّہ یہ کہ نہ ناچ رنگ کا شوق نہ شراب جوئے کی مغربی وضع کی عادات +
منظور کچھ عرصے سے جمیل کی طبیعت کے اضمحلال سے غایت درجہ متاثر ہو رہا تھا - جانے سے ایک ہفتہ پہلے اُس نے ایک دن شام کی چہل قدمی کے دوران میں جمیل سے بڑی محبت و ہمدردی سے کہا کہ جمیل ہم تم بھائی بھائی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کہ ہم سچے اور بےتکلف دوست ہیں - تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہارا رنج میرا رنج ہے - کچھ عرصے سے میں تم کو غمگین و ملول پاتا ہوں آخر مجھے کچھ تو بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے"؟
جمیل نے چپکے سے جواب دیا " بھائی تم مجھے مسرور نہیں کر سکتے پس اِس ماجرے کے بیان سے حاصل؟ اب ہماری دوستی میں جو بات مجھے بغایت خوش و مطمئن کر سکتی ہے وہ فقط یہی ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کروں -

کوئی خدمت جو تمہاری خوشی کی کفیل ہو سکے۔ خدا گواہ ہے کہ میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کہ تم کو خوش دیکھوں!

منظور نے مسکرا کر جمیل کی طرف دیکھا پھر ذرا سنجیدگی سے کہا "جو کچھ میں چاہتا ہوں افسوس کہ میں اس کے قابل نہیں۔ جمیل بولا "منظور! تم میری نظر میں ہر شے اور ہر شخص کے قابل ہو" منظور نے جمیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "تو میرے لئے معراجِ مسرت یہ ہے کہ تم اپنی بجائے ایک ایسا رفیق میرے لئے چھوڑو جو تمہاری طرح صادق اور تمہاری طرح میرا مُشیر کار بنے"!

رخصت کے دن جب احباب و اقربا اسٹیشن پر الوداع کہنے آئے تو جمیل نے حمید اور منظور کا ایک دوسرے سے تعارف کرا کے کہا کہ "تم جو پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو دراصل اس تعارف کے محتاج تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے پہچانو" پھر حمید سے کہا "حمید! میری بجائے اب منظور تمہارا بھائی ہے" اور منظور سے کہا "منظور! اب حمید میری طرح تمہارا رازدار دوست ہو گا"!

بشیر احمد
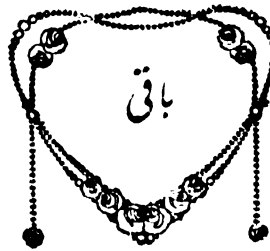
اپنے پھول سے

خبر بھی اس کی ہے کچھ اے گُلِ بہار تجھے؟ ٭ پکارتی ہے تری عندلیبِ زار تجھے!

ترے خیال میں راحت سے بے خبر ہے کون؟ ٭ خبر بھی اس کی ہے کچھ میں ترے نثار تجھے؟

قرار جس سے ملے کچھ نہ کچھ مرے دل کو ٭ کروں میں اے مری جاں اس طرح سے پیار تجھے

گر اختیار مقدّر پہ ہو مجھے، دے دوں ٭ جو اختیار مجھے ہیں وہ اختیار تجھے

سجاؤں باغ کے پھولوں سے تیرے گھر بھر کو ٭ پنہاؤں آہ میں اک موتیوں کا ہار تجھے

ہے آرزو کہ ہوں پوری تری تمنائیں ٭ یہ حق سے میری دعا ہے کہ دے قرار تجھے

سرور و لطف کی کلیاں ترے چمن میں کھلیں ٭ دکھائے باغ میں پھر باغباں بہار تجھے

نگہ سے اشک کی مانند اُسے ٹپکنے دے ٭ کسی پہ آہ جو آتا ہے دل میں پیار تجھے

کہاں کہاں ہے جہاں میں ترے لئے چاہت ٭ خبر یہ دیتا ہے میرے نفس کا تار تجھے

کرے ہزار جتن پھر بھی تیری اُلفت میں
لطیف یاد کر اُٹھتا ہے بار بار تجھے

لطیف

اپنے شاعر سے

آج تو نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ میں جو صبر وتحمل کی پتلی تھی جس کی سرد مہری جس کی جفا کی شکایتیں ہمیشہ تیرے وردِ زبان رہا کرتی تھیں، کیوں اور کس لئے بے اختیار آنکھوں سے آنسو برسانے لگی؟ — آہ بہتر یہی ہے کہ تو نہ پوچھے۔ یہ آتشِ نہاں خانۂ دل ہی میں پنہاں رہے۔ یہ سلگے اور ہمیشہ سلگتی رہے مگر اسی طرح کہ اس کا دھواں کبھی عیاں نہ ہو۔ یہاں تک کسی روز یہ دھواں مجسم روح بن کر اس تنِ خاکی کو خیر باد کہہ دے، باغِ حقیقت میں یہ آتش گلزار ہو کر نمودار ہو اور گلستان فردوس کے ایک ایسے کونے میں جس کا تصور اِن تاریک راتوں کی تنہا مشعل ہے یہ گل پھول بن کر پھلے پھولے!

صبر وقرار کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا اُس وقت جب تُو نے موتیوں کا وہ ہار میری نذر کیا۔ تُو سراپا شوق تھا اور میں مجسم حسرت۔ تیرے اِن الفاظ نے "مجھے یہ ہار اپنی گردن میں پہنانے کی اجازت دے" میرے رہے سہے ہوش وحواس کھو دیئے! یہ ہدیہ کیسے قبول کروں؟ آہ تو کیا جانے بہتر یہی ہے کہ نہ جانے اُن آرزوؤں اُن تمناؤں کی وسعت کو جو دل کے کسی گوشۂ تاریک میں ہمیشہ کیلئے مدفون کر دی گئیں! تجھے کیا معلوم کہ یہ دل جس پر تُو دنیا جہان کے موتی نچھاور کرنے کو تیار ہے تمام عمر ایک ایسے لمحے کو ترسا کیا جب کوئی اُسے اپنے ہاتھ سے زیادہ نہیں، ایک ننھا سا پھول ہی پیش کرے؟ جسے دنیا میں ہر شے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے وہ کیا جانے کہ کسی کا پیار سے کچھ "پیش کرنا" کسے کہتے ہیں؟!!

کڑکڑاتے جاڑے کی اُن طویل راتوں میں، جب نیند پلکوں میں آنے کا نام نہ لیتی ہو، جب ایک ایک گھڑی ایک ایک سال معلوم ہوتی ہو، تنہائی میں آہ وزاری، بے قراری اور اشک باری میں وقت تمام ہوتا ہو وہ شباب کا بہترین زمانہ اِسی رنج ومحن میں گزر چکا۔ بہتر یہی ہے کہ اب آرزوؤں اور تمناؤں کے مدفن پر پھول چڑھائیں، ہمیشہ اُس کی یاد دل میں تازہ رکھیں اور اُسے ٹھوکر لگانے سے پرہیز کریں۔

اے دوست آ! ہم اِسی کوشش میں تمام ہو جائیں! اسی جدوجہد میں بقیہ عمر صرف کر دیں۔ کہ یہ غنچہ جو اِس مدفن کی خاک میں سے چٹکا ہے ہماری آرزوؤں کے خون اور اشکِ حسرت سے اِس طرح سیراب ہو کہ وہ ایک رنگین ولاجواب پھول بن جائے! باغِ جنت کا یہ پھول آپ ہی اپنی نظیر ہو اُس کی نکہت گلستانِ حقیقت کو معطر کر دے اور اُس کی شمیم باغِ جہاں میں چاروں طرف پھیل جائے!!

ہجومِ جلوہ

ہر اک قطرہ ہوا آئینہ ساماں دیکھتے جاؤ
ہجومِ جلوہ ہائے شبنمستاں دیکھتے جاؤ

کیا ہے جلوۂ گل نے چراغاں دیکھتے جاؤ
گلستاں میں بہارِ صبحِ خنداں دیکھتے جاؤ

مرے آئینۂ دل نے محبت سے جلا پائی
اِس آئینہ میں اپنا روئے تاباں دیکھتے جاؤ

گلستاں میں تمہارے حُسن نے کی نور افشانی
تم اپنے حُسن کا یہ پرتوستاں دیکھتے جاؤ

چمن کا ذرہ ذرہ راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے
تمہارے خیر مقدم کے ہیں ساماں دیکھتے جاؤ

شبِ تاریکِ ہستی میں منور کر دیا کیا
تمہاری یاد نے میرا شبستاں دیکھتے جاؤ

میں ہوں موجِ کرم کی گوہر افشانی سے بیگانہ
مرے دریائے نادانی کا پایاں دیکھتے جاؤ

مرا دل پارہ پارہ ہوگیا اندوہِ ہجراں سے
ہوا یوں آئینہ خانہ کا ساماں دیکھتے جاؤ

تمہارے آفتابِ حسن نے کیا نور پاشی کی
مہِ یثرب کا یہ کارِ نمایاں دیکھتے جاؤ

ح ب

حُسنِ عمل

میں اپنی زندگی کے ایام کو ایک عقلمندانہ طریقہ پر یُوں ضائع کرنا چاہتا ہوں کہ ہر صبح مسکراتا ہوُا بستر سے اٹھوں۔ آنے والے دن اور اُس کی گوناگوں مصروفیتوں کا عزت و احترام کے ساتھ خیر مقدم کروں۔ ایک صاف اور پاکیزہ دل کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دوں۔ ہر کام کرتے وقت خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنے انتہائی مقصد کو مدِنظر رکھوں، لوگوں سے ملوں تو اِس طرح کہ ہنسی میرے لبوں پر کھیل رہی ہو اور میرا دل محبت کے نشہ میں چُور رہو۔ انکسار ہمدردی اور خوش اخلاقی ہر دم میری رفیق ہوں۔ میری راتیں اُس خمار آلود تھکن سے آشنا ہوں جو انسان کو میٹھی نیند سلاتی ہے اور میری روح اُس سرُور سے بہرہ اندوز ہو جو اپنے فرائض کو عمدگی کے ساتھ انجام دینے کے بعد حاصل ہوتا ہے!

میں نہیں جانتا کہ دنیا کی نظروں میں میری کیا حقیقت ہے لیکن اپنے تئیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ گویا ایک بچّہ تھا جو عمر بھر سمندر کے کنارے کھیلتا رہا اور عمدہ عمدہ گھونگے اور سیپیاں چن کر دل لگی کا سامان پیدا کرتا رہا۔ اِس حالت میں کہ صداقت کا بحرِ ناپیدا کنار ایک پوشیدہ مُعمّا بن کر میرے سامنے لہریں مار رہا تھا۔

مجھے اِس دنیا سے ایک ہی دفعہ گزرنا ہے اِس لئے جو کچھ اچھّا کام مجھ سے ہو سکے، یا جو نیکی بھی میں کسی ہم جنس کے ساتھ کر سکوں چاہئے کہ اُسے ابھی کر لوں اور غفلت نہ کروں کیونکہ اِس راستے سے میرا گذر پھر نہ ہوگا!

اصل دنیا وہ ہے جو انسان کے دل کے اندر آباد ہے۔ بیرونی دنیا کی سب رنگینیاں اور لطافتیں گویا اِسی اندرونی دنیا کا عکس ہیں۔

سچا کمال یہ نہیں ہے کہ انسان کبھی لغزش نہ کرے بلکہ یہ کہ ہر لغزش میں گر گر کر سنبھلے۔

(ترجمہ)

محمد رفیع بیگم

سچّی شاعری

مسٹر جارج مور عہدِ حاضر کے انگریزی مصنفین میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے بجائے انگریز مصنفین کے انگریزی مصنفین کی اصطلاح قصداً استعمال کی ہے۔ کیونکہ مسٹر جارج مور اگرچہ انگریزی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں لیکن دراصل وہ آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں اور اُس علمی تحریک کے علمبرداروں میں سے ہیں جو انیسویں صدی کے آخر میں آئرلینڈ کے ادبیات کو ترقی دینے کے مقصد سے شروع ہوئی تھی۔ اور جسے عموماً آئرش ادبیات کے احیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حال میں اس نامور ادیب نے انگریزی شاعری کا ایک منتخب مجموعہ "خالص شاعری" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں مختلف ازمنہ کے شعراء کے چیدہ چیدہ کلام کے علاوہ ایک نہایت دلچسپ تمہید کے پیرایہ میں اپنے خیالات شاعری کے صحیح موضوع کے متعلق بیان کئے ہیں۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ شاعری کے دو اقسام قرار دیتے ہیں۔ ایک تو وہ شاعری جس میں شاعر صرف اپنے جذبات و حسیات اور وارداتِ قلبی کا اظہار کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جس میں شاعر اپنی قوتِ متخیلہ سے واقعات و اشیا کی اصل حقیقت و ماہیت کو بین و واضح کر دیتا ہے۔ یہ تقسیم دراصل ایک فلسفیانہ تجزیہ پر مبنی ہے۔ دنیا کا کوئی واقعہ لے لیجئے (اور واقعات میں انسان کی اندرونی دنیا کے واقعات بھی شامل ہیں) مثلاً غروبِ آفتاب یا انسانی عمر کا انحطاط۔ اس واقعہ کو ہم دو طرح پر دیکھ سکتے ہیں ایک محض اس واقعہ کی اپنی کیفیت کے لحاظ سے اور دوسرے اُن اثرات کے لحاظ سے جو وہ واقعہ کسی خاص لحظہ میں ہمارے قلب پر وارد کرتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک واقعہ فی نفسہٖ ایک مستقل شے ہے جو ہر ایک انسان کے لئے کم و بیش یکساں کیفیت رکھتی ہے۔ گو جو لوگ چشمِ بینا رکھتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اُس شے کے زیادہ پہلو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس واقعہ کا جو اثر کسی خاص انسان کے دل پر ہوتا ہے وہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ اور قرینِ قیاس ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف شخصوں پر یا ایک ہی شخص پر دو مختلف اوقات میں مختلف بلکہ متضاد اثر پیدا کرے۔ مسٹر جارج مور اِس حقیقت پر انحصار کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سچّی اور خالص شاعری وہی ہے جس کا موضوع حقائق اور واقعات ہوں اور جو شاعری شاعر کے تغیر پذیر جذبات و کیفیاتِ قلبی کی مظہر ہو وہ سچی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اول قسم کی شاعری ہر زمانہ اور ہر ملک کے شاعروں کے لئے یکساں تاثیر رکھتی ہے لیکن دوسری قسم کی شاعری کا اثر خیالات کے تغیرات کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اور اس نوع کی کوئی نظم یا شعر جو ایک ملک اور ایک زمانہ میں نہایت موثر سمجھی جاتی ہو۔ ممکن ہے کہ دوسرے ملک اور دوسرے زمانہ

نہ صرف بے لطف بلکہ بے معنی تصور کی جائے چونکہ صرف اشیا اور واقعات ہی مستقل ہستی رکھتے ہیں ۔ اس لئے اُن کی شاعری ابدی ہے ۔ اور چونکہ واردات و موہوماتِ قلبی ناپائیدار اور عارضی موجودات ہیں ۔ اس لئے جس شاعری کا مدار اُن پر ہو اُس کو بقا نصیب نہیں ۔

جارج مور کا یہ نظریہ غور و توجہ کے قابل ہے اور اگر مان لیا جائے تو یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اردو زبان کے مشاہیر شعرا کو اِس خاص معیار سے پرکھنے کے بعد جو آرا اُن کے مابین فضیلت کے متعلق عام طور پر قائم کر لی گئی ہیں اُن میں کہاں تک ترمیم کی ضرورت ہے ۔ سب سے پہلے تو یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ آج کل کے اُردو شاعروں نے جو مسلک غالب کی تقلید میں اختیار کر لیا ہے ۔ وہ غلط مسلک ہے ۔ کیونکہ اُن کی شاعری کا انحصار زیادہ تر اُن کے ذاتی تخیلات و محسوسات پر ہوتا ہے جس کا پورا لطف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اُن جیسی ذہنیت رکھتے ہیں ۔ لہذا اجمال کی جس پیچیدگی و ندرت کو وہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں ۔ وہ دراصل اُن کی شاعری کے لئے باعثِ نقص ہے ۔ خود غالب کا بھی بہت سا کلام جو اُن کی مشکل پسند اور عامیانہ خیالات سے نفور طبیعت کا نتیجہ تھا ساقط الاعتبار قرار پائے گا ۔ پرانے اساتذہ میں میر تقی کو جو امتیازی درجہ حاصل رہا ہے وہ کم ہو جائے گا ۔ کیونکہ اُن کے کلام کی رونق بہت کچھ واردات و کیفیاتِ قلبی پر منحصر تھی البتہ سودا کے پایہ میں کوئی پستی نہیں آئے گی بلکہ شاید کچھ پیشتر سے زیادہ بلند تسلیم کر لیا جائے ۔ متاخرین میں آتش کا بازار کسی قدر سرد پڑ جائے گا لیکن میر انیس کی شان میں مطلق فرق نہیں آ سکتا ۔ مومن خاں کی شاعری بالکل نظر سے گر جائیگی ۔ لیکن ذوق کے ناصحانہ کلام کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی ۔ علیٰ ہذا القیاس داغ کا رنگ پھیکا پڑنے کی بھی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی لیکن "گلزارِ داغ" کو جو فوقیت اب تک رائے عامہ میں حاصل رہی ہے وہ ضرور زائل ہو جائے گی ۔ ان سب اساتذہ کے مقابلے میں ایک اور شاعر زیادہ وقیع تصور کیا جائے گا جسکو اب تک تذکرہ نویس مبتذل و عامیانہ کہا کرتے تھے یعنی نظیر اکبر آبادی کیونکہ اُس کی شاعری تمام و کمال واقعات و اشیا کے مشاہدہ پر مبنی ہے ۔ اور خیالات و حسیات کی الجھن سے اُس کی آزاد طبیعت گریز کرنے کی عادی معلوم ہوتی ہے ۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان قیاسات کو موجودہ زمانہ تک طول دیا جائے ۔ اور آج کل کے مشاہیر شعرا کی بھی مسٹر جارج مور کے خیال کے تحت میں نام بنام تنقید کی جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ اِن دنوں ہر ایک شاعر اپنی اور اپنے طرفداروں کی نگاہ میں نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی تمام اساتذہ کا استاد ہے اور اُن میں سے کسی کے حق میں بھی وہ جراتِ ناقدانہ برتنا جو ہمارے اگلے وقتوں کے شعرا کے ساتھ بے خوف و خطر برتی جا سکتی ہے میرے بیاکسی اور سست قلم مضمون نگار کے لئے نہایت مخدوش رویہ ثابت ہو سکتا ہے ۔

محمد سعید

تُو اور میں

تو نغمہ چاہتا ہے، فغاں چاہتا ہوں میں — تو چاہتا ہے جو، وہ کہاں چاہتا ہوں میں

چہرہ پہ چاہتا ہے مسرت کی لہر تُو — سینے میں ایک برق تپاں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے یہ کہ دہن گل فشاں رہے — جس سے شرر جھڑیں وہ زباں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے دل کو ترے ہو سکوں نصیب — بیتاب دمبدم رگِ جاں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے دیدۂ ظاہر ہو محوِ خواب — باطن میں دیدۂ نگراں چاہتا ہوں میں

شیخِ حرم سے گر تجھے زمزم کی ہے طلب — پیرِ مغاں سے رطلِ گراں چاہتا ہوں میں

تُو چاہتا ہے سایۂ گل ہیں ہوائے سرد — شاخِ چنار شعلہ فشاں چاہتا ہوں میں

تو زندگی کے ساحلِ خاموش پر مقیم — گردابِ زندگی کا سماں چاہتا ہوں میں

دل میں ترے ہے راحتِ پیرانہ کی اُمنگ — جذباتِ تیز و تند و جواں چاہتا ہوں میں

آسانیوں میں ہے تری خودداریوں کا راز — دشواریاں گسستہ عناں چاہتا ہوں میں

منبر پہ تجھ کو جلوۂ واعظ کا اشتیاق — سُولی پہ رازِ حق کو عیاں چاہتا ہوں میں

تو چاہتا ہے دل ہو ترا لالہ زارِ عیش — اُٹھتا ہوا جگر سے دھواں چاہتا ہوں میں

دنیا مسرتوں کی ہے درکار اگر تجھے

بیتابیوں کا ایک جہاں چاہتا ہوں میں

سلیم

مرزا صاحب نے فرمایا کہ والدِ مرحوم نے بہت سی کتابیں لکھیں اور اُن کی گزرِ اوقات اسی سے ہوتی تھی لیکن بعض چیزیں ایسی بھی اُن کی ہیں جو اب تک یا تو شائع نہیں ہوئیں اور اگر شائع ہوئیں تو اب نایاب ہوگئی ہیں۔

سوانحِ دہلی۔ شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب گورگانی نے ۱۸۹۴ء میں ایک رسالہ سوانحِ دہلی کے نام سے لکھا تھا جس کو نرائن داس جنگلی مل تاجر کتب نے شائع کیا تھا اس رسالہ میں دہلی کے تمام قدیم و جدید انقلابات درج کئے گئے تھے اِس کی زبان نہایت صاف اور موثر اور اصلی قلعہ معلی کی زبان تھی۔ سوانح دہلی سے بعض باتیں ایسی بھی معلوم ہوئیں جن کی آج کل اردو پڑھنے والوں کو بالکل واقفیت نہیں ہے اِس لئے اِس مضمون میں اُن تاریخی یادگاروں کو اقتباس کر کے جمع کیا جاتا ہے۔

جب ہندوستان انگریزوں کو ملا۔ شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب نے اپنی کتاب سوانحِ دہلی میں اس عہدنامہ کا اقتباس بھی اردو زبان میں درج کیا ہے جو بہادر شاہ بادشاہ کے دادا شہنشاہ شاہ عالم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہوا تھا اور جس عہدنامہ کی رو سے انگریزوں کو بنگال اور بہار کی دیوانی کا حق حاصل ہوا تھا اُس عہدنامہ کا اقتباس شہزادہ صاحب نے اِن الفاظ میں لکھا ہے۔

نقلِ عہدنامہ

عقیدت گزین عبودیت آگین وفادار خادم دلی خیر خواہ اشجع روزگار شریف ابنِ شریف کمپنی انگریزی کی خدماتِ لائقہ اور محبتِ مفرط سے خوش ہو کر مابدولت و اقبال بنگال بہار اڑیسہ کی خدمتِ دیوانی ۱۱۷۱ بنگلہ کی فصل اول بہار بطور بخشش و جاگیر استمغا کی تفویض کرتے ہیں کوئی اور اس عنایت میں شریک نہیں۔
جو خراج ماہ بماہ دیوان کو آستانہ فلک رفعت مابدولت پر حاضر کرنا چاہیئے وہ ان کے لئے معاف کیا جاتا ہے اس خدمت گزارانِ سلطنت کو چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ کا ذمہ دار ہونا پڑے گا جو رقم نواب ناظم بنگال کو پیش کرنی پڑتی ہے۔ کمپنی کو لازم ہے کہ سالانہ رقم مذکورہ ادا کرتے رہیں مابدولت و اقبال کے سنہ ۶ جلوس میں ۸ صفر المظفر کو شرفِ نفاذ پایا۔

اِس عہدنامہ پر ایک نظر۔ اِس عہدنامہ کے الفاظ خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں کہ انگریزی گورنمنٹ کو شاہ عالم بادشاہ نے عقیدت گزین اور عبودیت آگین اور وفادار خادم کے الفاظ عطا کئے تھے اگر آج کوئی تیموری شہزادہ انگریز گورنمنٹ کو اس عہدنامہ کے الفاظ کے بموجب وفادار خادم یا عبودیت آگین کہہ دے تو شاید اُس کو جیل خانہ جانا پڑے لیکن ایک زمانہ وہ تھا کہ انگریز گورنمنٹ نے اِن الفاظ کو نہایت فخر کے ساتھ عہدنامہ

میں لکھوایا تھا۔

اور اِس عہد نامہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوانی صرف بہار اور بنگال کی دی گئی تھی اور اُس کے معاوضہ میں چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ خراج انگریزی گورنمنٹ پر لگایا گیا تھا۔

شاہ عالم نے ۱۷۵۳ء سے ۱۲۲۱ء تک حکومت کی اور ۱۲۰۲ھ میں غلام قادر روہیلے نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لیں اور اُس کو اندھا کر دیا۔

ایک بہت بڑا تاریخی خط

شہزادہ مرزا احمد اختر صاحب نے اپنی کتاب سوانح دہلی میں مکتوبات لارڈ ولزلی سے جناب دفرلی بارلو اڈنی گورنر جنرل ہندوستان مورخہ ۲ جون ۱۸۰۵ء بنام صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرس فورٹ ولیم کلکتہ نقل کیا ہے گورنر جنرل کا نام اردو میں لکھنے کے سبب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ تاریخ دان حضرات ۱۸۰۵ء کے لحاظ سے اس نام کی اصلاح کرلیں گے اس خط میں چند باتیں نہایت غور طلب ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی رعایا سے بھی ہے کیونکہ خط کے یہ الفاظ کہ "عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی دیوانی دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کے لئے شرعِ محمدی کے مطابق قایم ہوں"۔ اس فقرہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انگریز گورنمنٹ ۱۸۰۵ء میں تحریری وعدہ کرچکی ہے کہ دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کا انصاف شرع محمدی کے موافق کیا جائیگا۔ مگر آج اِس وعدہ پر گورنمنٹ کا عملدرآمد نہیں ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان قوم برٹش گورنمنٹ سے بموجب مذکورہ وعدہ کے قانون شرع محمدی کے رواج کا مطالبہ کرے۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کو زیادہ فکر فرانس کا تھا۔ مرہٹوں کا زیادہ فکر نہ تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گورنر جنرل نے شاہ عالم بادشاہ اور اُن کے خاندان کی عظمت وشوکت اور رعب وداب شاہی کو قایم رکھنے کا وعدہ کرلیا تھا لیکن شاہ عالم کے بعد انگریزوں کے سیاسی عہدہ دار اِس وعدہ پر قائم نہیں رہے اور جیسا کہ میں نے کتاب "بہادر شاہ کے مقدمہ" میں اور کتاب "دہلی کی جانکنی" میں تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے پہلے برٹش افسران سیاسی برابر اس کوشش میں تھے کہ تیموریہ خاندان کا شاہانہ اقتدار بالکل نیست ونابود کر دیا جائے۔ اور دہلی میں جو ایک کانٹا بادشاہ کی صورت میں کھٹک رہا تھا اُس کو نکال کر پھینک دیا جائے۔

اور بھی کئی چیزیں اس خط سے معلوم ہوتی ہیں جن کو ناظرین کے غور کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ تاریخی خط یہ ہے :۔

از گورنر جنرل و کونسل

بخدمت صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرز۔ فورٹ ولیم کلکتہ

۲۔جون ۱۸۰۵ء

حضور پرنور فیض گنجور صاحبان!

گورنر جنرل کونسل حضور کی کمیٹی کو وہ انتظام بھیجتا ہے جو شہنشاہِ فلک بارگاہ شاہ عالم کے آئندہ گزارہ خاندانِ شاہی کی پرورش اور شہنشاہِ موصوف کے کاروبار لائقہ کے انصرام کے لئے سوچا گیا ہے اور جن اصولوں پر انتظامِ مذکور مبنی ہے وہ معرضِ بیان میں آئیں گے۔

اِس گورنمنٹ کی ہرگز یہ خواہش نہیں ہے کہ حضورِ پرنور کو حریفوں سے محفوظ رکھنے اور پنشن دینے کے عوض میں شاہی اختیارات حاصل کرے اور اُن کے وسیلہ سے ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں پر کوئی حکومت جتائے اور شہنشاہِ موصوف کو اُن صوبجات پر جو وسیع سلطنتِ مغلیہ میں شامل تھے یا ہیں بطورِ شہنشاہِ ہندوستان کوئی حق جتائے یا رئیسوں کو تعظیم کرانے سے روکے۔ جو فوائد کہ گورنر جنرل نے شہنشاہ کو دشمنوں کے نرغہ سے نکالنے اور تختِ دہلی پر متمکن کرنے اور اُن کو اور اُن کے خاندان کو حفاظت میں لینے سے سوچے ہیں وہ ہمارے ۱۳ جولائی سنہ گزشتہ کے مکاتبہ سے منکشف ہوگئے ہونگے یعنی مرہٹے بالعموم اور فرانس بالخصوص شہنشاہ کے نام سے بہت سے حق جتا کر اور بہانہ کر کے سلطنتِ انگلشیہ کو خطرہ اور پریشانی میں ڈالتے اگر حضور برابر اُن کے قبضہ میں رہتے۔ خاص کر فرانس تو غضب مخالفت کرتا۔ اس مضمون کے حوالہ کے لئے گورنر جنرل کونسل جناب کی توجہ ہمارے ۱۳ جولائی سنہ گزشتہ کے مراسلہ کے اُس کاغذ کی طرف جس پر نشان الف دیا ہوا ہے اور اس مراسلہ کے نہترویں پیرے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ حضور شاہ عالم کو فرانسیسی اہلکاروں کی حفاظت میں لینے اور اُن کو اُن کی ہدایت پر چلنے کی حالت میں قوت انگریزی کو شکست کرنے کا منصوبہ ہو رہا تھا۔ اب تختِ دہلی کمپنی کے ہاتھ میں آگیا اور اس قسم کے منصوبے اب بڑی دقت میں پڑ گئے ہیں گورنر جنرل اس کے علاوہ اُن مصائب کو نہ دیکھ سکا جو فرانس اور مرہٹوں کے ہاتھ سے شہنشاہ اور خاندانِ تیموریہ پر پڑ گئے ہیں۔ وہ مفلسی، ادبار، شکستہ حالی میں مبتلا ہیں۔ خاص کر معمر بادشاہ کی یہ حالتِ سقیم چشمِ انسانی سے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اس لئے گورنر جنرل شہنشاہِ موصوف کو اپنی حفاظت میں لیکر اُس کی بقیہ زندگی امن و آسائش سے گزروانا چاہتا ہے اصول مذکورہ پر خیال کر کے سرکارِ انگریزی نے عنانِ توجہ اس طرف مبذول کی ہے کہ شہنشاہ اور خاندان

شاہی کی پرورش کے لئے ایسا معقول انتظام کیا جائے کہ وہ ہر طرح اپنی عظمت و شوکت رعب و داب شاہی کو قایم رکھ سکیں۔ جائز حظِ زندگی سے بہرہ ور رہیں اور وفادار اور دوست سلطنتِ انگلشیہ کے رہیں جو اُن کے لئے ایک امر ضروری ہے۔

خاندانِ شاہی تک انگریزی حفاظت پھیلانے میں ہم کو حضورِ فیض گنجور شاہِ عالم کے بطور شہنشاہِ ہند کے حقوق کی نگہداشت کرنی اور اُن کی حکومت کو رجواڑوں سے تسلیم کرانے میں ہم کو کوئی دقت نہ پڑے اور اس لئے گورنر جنرل کا ارادہ ہے کہ تنخواہ کے ساتھ ہی اختیارات کا تصفیہ محض غیر ضروری ہے۔

گورنر جنرل کونسل نے مفصلہ ذیل امور پر کاربند ہو کر آیندہ انتظام سوچا ہے۔

کہ دریائے جمنا کے مابین کنارے کے قطعاتِ زمین جس قدر گرد و نواحِ دہلی میں شامل ہو سکتے ہیں خاندانِ شاہی کے قایم رکھنے کی غرض سے دے دیئے جائیں وہ حصصِ زمین رزیڈنٹ دہلی کے چارج میں سمجھے جائیں اور حضور کے نام سے آمدنی جمع کی جائے اور انصاف چکایا جائے۔ اِن قواعد و ہدایات سے جو سرکارِ انگریزی نامزد کرے۔ حضورِ پرنور کو ایک دیوان اور کچھ معمولی اہلکار مقرر کرنے کی اجازت دی جائے کہ وہ دفتر کلکٹری میں موجود رہیں۔ اور تمام آمدنی جمع شدہ اور اخراجات جمع آمدنی کی حضور کو اطلاع دیتے رہیں۔ اور حضور کی دلجمعی کر دیں کہ آمدنی میں کسی قسم کا تغلب ہوا ہے یا نہیں۔ عدالت ہائے انصاف خواہ فوجداری خواہ مذہبی دیوانی دہلی اور اُس کے متعلقات کے باشندوں کے لئے شرع محمدی کے مطابق قائم ہوں۔ عدالتِ فوجداری کوئی حکم جو قیدِ میعادِ کثیر یا سزائے موت پر مشتمل ہو بغیر مرضی حضور عمل میں نہ لایا جائے اور تمام دعووں اور احکامِ مقدمہ کی اطلاع ہر روز حضور کو دی جایا کرے۔ علاوہ جاگیر مذکورہ دیگر قطعاتِ دور و دراز حضور کی تعمیل طلب ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رزیڈنٹ دہلی کے خزانے سے ہر مہینے رقوم ذیل حضور کے خرچ جیب خاص کے لئے دیئے جایا کریں۔

حضورِ پرنور	اسی ہزار روپے
ولیعہد صاحب علاوہ جاگیر	دس ہزار روپے
حضور کے عزیز صاحبزادہ مرزا عزت بخش	پانچ ہزار روپے
حضور کے اور دو نابالغ خورد صاحبزادوں کو فی	پندرہ سو (تین ہزار روپے)
حضور کے پچاس چھوٹے لڑکے لڑکیوں کو کل	دس ہزار روپے

شاہ نواز خان خزانچی حضور	دو ہزار پانسو روپے
سید رضا خاں قریب حضور و ایجنٹ گورنمنٹ کو	ایک ہزار روپے
میزان کل	ایک لاکھ گیارہ ہزار پانسو روپے

اگر جاگیر حضور کے اخراجات پوری نہ کر سکے یا اُس میں کمی ہو جائے تو حضور کی ذاتِ خاص کی تنخواہ ایک لاکھ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔

علاوہ رقومِ مذکورہ بالا دس ہزار روپیہ سالانہ حضور کو چند تیوہار کی غرض سے دیا جائے

وغیرہ وغیرہ . . . .

دستخط

دفرلی بارلواڈنی

امورات مذکورہ تقریبًا سب کے سب منظور ہو گئے۔ حضور کی تنخواہ میں بیس ہزار کی توقیر ہو گئی یعنی ایک لاکھ قرار دی گئی۔ علاوہ اس کے دس ہزار روپیہ سالانہ مرمتِ قلعہ و مکانات کے لیے ملنے لگا۔

خلاصۂ مقصد۔ ان تاریخی اور اہم تحریرات کو موجودہ باشندگانِ ہندوستان نسلِ ہمایوں کی ایک سیاسی یادگار تصور کر سکتے ہیں۔ اور اُن کا اردو زبان کے ممتاز اور شہرۂ آفاق رسالہ ہمایوں میں شائع ہونا یقینًا کارآمد و مفید ہے۔

حسن **نظامی**

خیالات

ہر شخص اپنے جی میں اپنے تئیں دنیا کا سب سے بڑا عقلمند اور سب سے بڑا مظلوم سمجھتا ہے۔

احسان جو جتایا جائے وہ زائل ہو جاتا ہے۔ جو نہ جتایا جائے اُس کا بدلہ احسان سے بھی نہیں دیا جا سکتا۔

باغبان

آفتاب

آفتاب! اے نوعروسِ صبح کے آئینہ دار
اے کہ قبضے میں ترے سر رشتۂ لیل و نہار
اے کہ تیری ہر نظر اطرافِ عالم سے دوچار
اے کہ تیرے سازِ ہستی کے نغموں کا مدار
ذرّے ذرّے کو تجلّی کا پتا دیتا ہے تُو
پتّھروں کو چوم کر ہیرا بنا دیتا ہے تُو

دور سے آتا ہے تُو ہم کو جگانے کے لئے
نامِ غفلت کا زمانے سے مٹانے کے لئے
گدگداتا ہے شگوفوں کو ہنسانے کے لئے
خاک سے شبنم کے قطروں کو اُٹھانے کے لئے
دیکھ کر پھولوں کی ناداری تڑپ جاتا ہے تُو
رنگ بن کر عارضِ گلشن میں کھپ جاتا ہے تُو

اے کہ تُو ہے جملہ موجوداتِ عالم کی مُراد
ہاتھ میں تیری شعاعوں کے ہے نبضِ ابروباد
دشمنانِ زندگی سے تو ہے مصروفِ جہاد
تیری کرنیں ہیں عناصر میں نظامِ اتّحاد
حُسنِ لیلائے جہاں پرور ترے محمل میں ہے
تیرے دم سے ولولہ نشوونما کے دل میں ہے

صدقے ہوتی ہے زمیں تیری ادائے ناز پر
بحر سر دھنتے ہیں تیرے شعلۂ آواز پر
ثابت و سیار مفتوں ہیں ترے انداز پر
رقص کرتا ہے نظامِ دہر تیرے ساز پر
سوزِ بیداریٔ عالم کا تری تانوں میں ہے
زمزمہ روئیدگی کا تیرے افسانوں میں ہے

ہاں، دیئے جا تال یونہیں، مُطربِ بزمِ حیات!
وجد میں دن ہے ترے نغموں سے، اور غش میں ہے رات
مایۂ صد فخر ہے فانی جہاں کو تیری ذات
سرخرو رہ تا قیامت اے غرورِ کائنات!
گرم تیرے جام سے ہستی کا مے خانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

ہیں تری چھانی ہوئی گلیاں جہان آباد کی چھیڑ کچھ باتیں ہمارے نامور اجداد کی
تیری نظروں میں تو ہونگی رونقیں بغداد کی کچھ تو کیفیت بیاں کر ملت برباد کی
کتنے سکے تو نے دیکھے ہیں ہمارے نام کے؟
اے مورخ سطوت پارینۂ اسلام کے!

خانہ زادوں میں تھی اپنے شوکت اسکندری اپنے نقش پا میں تھی شان کلاہ قیصری
ٹھوکروں کی زد پہ رہتے تھے بتان آذری اپنی آنکھوں سے برستا تھا جلال حیدری
دنگ تھے ناقوس، گلبانگ اذاں کے سامنے
کوہ جھک جاتے تھے اپنے کارواں کے سامنے

کلمہ گو جس دور میں تھے صاحب تاج و علم یاد تو ہونگے تجھے وہ دن بھی اے گردوں حشم
خشک روٹی جو کی تھی خوراک ارباب کرم کتنی سادہ زندگی رکھتے تھے خدام حرم
چتر شاہی تھے سروں پر دلق زیب دوش تھے
آہ جب "فقر و امارت" دونوں ہم آغوش تھے

اے کہ اڑ جاتا ہے تجھ سے خواب نوشین کا اثر آفتاب! اے نیلگوں دریا کے تابندہ گہر
تاج زریں جگمگا تا ہوگا اپنے فرق پر سچ بتا، پھر بھی کبھی آئے گی کیا ایسی سحر؟
آنکھ کھل جائے گی غفلت سے جہان آباد کی؟
جاگ اٹھے گی سلطنت غرناطہ و بغداد کی؟

کھا رہا ہے ٹھوکریں ہشیار بھی ہوگا کبھی مسلم خوابیدہ اب بیدار بھی ہوگا کبھی
جان دینے کے لئے تیار بھی ہوگا کبھی؟ بزدلی کے نام سے بیزار بھی ہوگا کبھی
طور سے کیا پھر صدائے لن ترانی آئے گی؟
سچ بتا کیا پھر زلیخا پر جوانی آئے گی؟

کیا دیا تو نے جواب امید میں ڈوبا ہوا مرحبا، اے آفتاب روح پرور مرحبا
تیرے قرباں، پھر تو دہرا دے، یہ تو نے کیا کہا؟ جس نے دل کے مردہ ارمانوں کو زندہ کر دیا

"چھٹ رہی ہیں ظلمتیں شب کی سحر ہونے کو ہے
آفتابِ تاجِ مسلم جلوہ گر ہونے کو ہے"

مژدہ اے مسلم! کہ تو ہر رنگ میں پایندہ ہے — بعدِ مردن، گوشۂ تربت میں بھی تو زندہ ہے
پھر تبسم سا لبِ تقدیر پر رخشندہ ہے — ایک چنگاری ضمیرِ حق میں پھر تابندہ ہے
زندگانی کی سرِ تربت ہوا آنے کو ہے
چرخ سے پھر قم باذنی کی صدا آنے کو ہے

اے کہ تو سرمایۂ پیغامِ ربّ المشرقین — اپنی بربادی پہ کیوں کرتا ہے اتنا شور و شین
خشک ہو سکتی ہے کشتِ خواجۂ بدر و حنین؟ — جس کے ہر ذرے کے اندر جذب ہے خونِ حسینؑ!!
ہو، اگر دستِ عدو میں تیشۂ بیداد ہے
کربلا پر تیرے سقف و بام کی بنیاد ہے

تجھ کو کیا پروا، ہوائے دہر اگر ناساز ہے — حشر تک تائیدِ ربانی تری دمساز ہے
تیرے سینے میں زمین و آسماں کا راز ہے — بربطِ جبریل کی تو آخری آواز ہے
شورشِ الحاد سے دل تیرا ڈر سکتا نہیں
صورِ محشر بھی تجھے خاموش کر سکتا نہیں

سبزۂ خوابیدہ وہ انگڑائیاں لے کر اٹھا — صبح ہونے کو ہے، تہ کر غفلتیں، بستر اٹھا
مضطرب ہے بحر، کشتی ڈال دے لنگر اٹھا — تاجِ شاہی منتظر ہے اے مسلماں سر اٹھا
دیکھ رحمت کی گھٹائیں ماہیٔ بے آب ہیں
تیری کھیتی پر برسنے کے لئے بے تاب ہیں

شبیر حسن جوش

قیدی

لندن کے ایک باغ میں گرمیوں کی ایک سہانی صبح کا ذکر ہے۔ پرندے ابھی اپنے بہارین نغمے گا رہے تھے۔ اور درخت ابھی پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ کہ یکایک ہمارے دوست نے کہا "کہیں مینا بول رہی ہے"۔

کستورے یہاں تھے۔ اور توتی، پھدکیاں بھی اکثر نظر آجاتی تھیں۔ رات کو الو بھی بولتا تھا۔ اور سال میں ایک دفعہ کوئل بھی کینٹ اور سرے کے علاقوں سے بھول بھٹک کر درختوں کے اس سرسبز جزیرے میں آ نکلتی تھی۔ مگر مینا ہم نے یہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔

ہمارے دوست نے کہا "وہ دیکھو! پھر اُس طرف سے آواز آئی!" وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور گھر کی طرف چل دیا جو پاس ہی واقع تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اپنی جگہ پر بیٹھ کر کہنے لگا "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ بھی پنجروں میں جانور رکھنے کے شائق ہیں"۔ ہم نے کہا "یہ بلبل ہمارے باورچی نے پال رکھا ہے"۔

"ناہنجار" اُس کے منہ سے یہ لفظ بے ساختہ نکل گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں کوئی نہایت زبردست احساس بیدار ہو گیا ہے جس کو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔

یکایک وہ یُوں برس پڑا:-

"میں کسی چیز کو محبوس دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ پرندے ہوں یا آدمی۔ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہے"۔ پھر ہماری طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھ کر، گویا ہم نے اُس سے یہ باتیں کہلوا کر کوئی فائدہ حاصل کر لیا ہے۔ اُس نے فوراً ہی اپنا سلسلۂ کلام شروع کر دیا:-

"چند سال کا ذکر ہے کہ میں جرمنی کے ایک شہر میں اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا جو اُن دنوں تمدنی معاملات کے متعلق کچھ تحقیقات کر رہے تھے۔ ایک دن وہ کسی قید خانے کے معائنہ کے لئے جا رہے تھے کہ اُنہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی قید خانہ نہیں دیکھا تھا۔ اِس لئے میں اُن کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اُس دن بھی آج کی طرح مطلع بالکل صاف تھا۔ ہر چیز پر وہی سرد جگمگاہٹ رقص کر رہی تھی جو صرف جرمنی کے بعض علاقوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ قید خانہ جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا۔ اُن قید خانوں میں سے

تھا جو پینٹن ول کے نقشے کے مطابق ستارے کی شکل کے بنائے گئے تھے۔ قید خانے کا دستور اور نظام وہی تھا جو سالہا سال گزرے یہاں رائج تھا۔ جرمن اُس وقت بھی اور اس میں شک نہیں کہ اب بھی قیدیوں کو کامل تنہائی کی جانکاہ تعذیر میں مبتلا کرنے کے بیہودہ خیال کو اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ اُن کے لئے ایک نیا کھلونا تھا اور وہ پورے عجزونہ جوش کے ساتھ اِس پر عمل پیرا تھے۔ یہ اُن کی عادت ہے کہ جس کام کو وہ شروع کرتے ہیں اُس میں ایسا ہی انہماک دکھاتے ہیں۔ میں قید خانے کے متعلق کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ نہ یہ کہ ہم نے اُس میں کیا کیا دیکھا جن خوفناک طریقوں اور اصولوں پر ایک ایسا محکمہ چل سکتا ہے اُن سب پر یہاں عمل کیا جاتا تھا۔ بلکہ میں یہ کہنے کی جرات بھی کروں گا کہ انتظام اچھا تھا۔ اور قید خانے کے حاکم نے بھی ہر موقع پر اپنی ذات کے متعلق مجھ پر اچھا اثر ڈالا۔ میں نہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں جسکو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ اور جس نے مجھے ہمیشہ کے لئے جانداروں کو اسیر کرنے کا احساس کرا دیا خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان بڑے ہوں یا چھوٹے"

ہمارا دوست یہاں ٹھہر گیا۔ پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں کچھ اور طیش ملا ہوا تھا۔ اور جیسے یہ طیش اُسے اپنی خاموش فطرت کے خلاف بغاوت کرنے پر آرہا تھا۔ اُس نے کہا:-

"جب ہم نے اُس مقام کو جس کے در و دیوار خاکی رنگ کے تھے اچھی طرح دیکھ لیا۔ تو حاکم قید خانہ نے میرے دوست سے دریافت کیا "کیا آپ ایک دو عمر قیدی بھی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کو ایک ایسا شخص دکھاؤں گا جسے یہاں رہتے ہوئے ستائیس سال ہو گئے ہیں"۔ مجھے اُس کے الفاظ اب تک یاد ہیں اُس نے کہا "وہ تنہائی کی قید سے کچھ فرسودہ سا ہو گیا ہے"۔

جب ہم اس قیدی کی کوٹھڑی کی طرف جا رہے تھے تو انہوں نے ہمیں اُس کی سرگزشت سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ ابھی وہ لڑکا ہی تھا کہ ایک فرنیچر بنانے والے نے مددگار کے طور پر اُسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ مگر اُس نے نقب زنوں کی ایک ٹولی کے ساتھ مل کر اپنے آقا کو لوٹنے کا ارادہ کیا۔ ڈاکے کے دوران میں اُس نے بدحواسی کے عالم میں ایک ہی ایسا وار کیا۔ کہ کارخانہ دار اُسی جگہ مر گیا۔ قاتل کے لئے موت کا حکم دیا گیا۔ مگر حکومت کی سفارش سے جو اُن دنوں جنگِ ساڈووا کے خونیں نظاروں کو دیکھ دیکھ کر گھبرا گئی تھی، اُس کی سزا عمر قید میں تبدیل ہو گئی"۔

جب ہم اُس کی کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا اپنے کام کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گو اُس کی عمر چالیس سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ ہوگی لیکن وہ ساٹھ سال سے کم کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کا جھکا ہوا قد اور کانپتا ہوا تباہ شدہ جسم ایک میلے رنگ کی چادر سے جو پوشاک کے بچاؤ کے لئے پہنی جاتی ہے ڈھنپا ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بھسلا پڑ گیا تھا اور اُس میں وہی انداز آ گیا تھا جو عموماً قیدیوں کی شکلوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اُس کے نقوش بالکل بدنما ہو گئے تھے۔ اُس کے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔ اُن کا رنگ مجھے بھول گیا ہے . . . .

مجھے اس میں شک ہے کہ اُن میں کوئی رنگ تھا بھی۔ جب ہم ایک ایک کر کے آہنین دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اُس نے تعظیم کے لئے اپنی ٹوپی سر سے اتاری جو اُن تمام چیزوں کی طرح جو اُس نے پہن رکھی تھیں مٹیالے رنگ کی تھی۔ اُس کے سر میں بھی جس پر اب بہت تھوڑے بال نظر آرہے تھے خاک پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمارے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا اور مسکین نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ اسی طرح جیسے ایک اُلّو دن کی روشنی کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے کبھی تم نے کسی چھوٹے بچے کو دیکھا ہے جو پہلی مرتبہ بیمار ہوا ہو۔ وہ اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر کتنا حیران اور پریشان ہوتا ہے۔ بس یہی حالت اُس کی تھی۔ لیکن اُس کی صورت میں ایک غیر معمولی مسکنت تھی۔ ہم نے بہت سے قیدیوں کو دیکھا تھا۔ مگر اُن سب میں یہی ایک تھا جس کی طبیعت میں ایک خوفناک حلم تھا۔ جب وہ اپنی کانپتی ہوئی آواز میں ہاں صاحب .... نہیں صاحب، کہتا تھا۔ تو اُس کی کمزوری اور نرمی سے عجیب یاس ٹپکتی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ اُس میں قوتِ ارادی کی ایک رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔"

ہمارا دوست یہاں رُکا۔ اور اپنے دل میں اس نظارے کا تصوّر لانے پر بھی اُس کی پیشانی پر ایک بل پڑ گیا۔ اُس نے کہا:-

"اُس کے ہاتھ میں سخت کاغذ کا ایک ورق تھا جس پر وہ بہرے اور گونگے اشخاص کے لئے ایک خاص طرزِ تحریر میں نئے عہد نامہ کی کچھ عبارت نقل کر رہا تھا۔ جب وہ ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ گونگے اور بہرے اسے کس آسانی سے پڑھ سکتے ہیں اپنی انگلیاں کاغذ کے حروف پر پھیر رہا تھا تو ہم نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ ایک چکّی چلانے والے کی طرح گرد آلود ہو رہے تھے۔ کوٹھڑی میں گرد کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گرد نہ تھی جو اُس کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھی۔ بلکہ انسانی پودے کا وہ فضلہ تھا جو بیج بنتے وقت نکل آتا ہے۔ جب وہ کاغذ اوپر کو اٹھاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی جھینگے کا پر کانپ رہا ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ قاعدہ جس کے مطابق تم لکھ رہے ہو۔ کس کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ اور ہم نے کسی کا نام بھی لیا۔ اُس نے کہا: نہیں، نہیں، وہ صحیح نام یاد کرنے کی کوشش کی شدت سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ آخر اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور دھیمی آواز سے کہنے لگا۔ "آہ! میں نہیں بتا سکتا" پھر یکایک وہ نام اُس کی زبان پر آ گیا۔ اُس وقت وہ پہلی مرتبہ اپنی ہیئت میں انسان نظر آیا۔ آزادی کی قدر و قیمت۔ دوسروں سے ہمارے تعلقات کے حقیقی معانی، آوازوں اور نظروں کے ذریعہ سے لمحہ بہ لمحہ ہمارے دلوں کے انجلا کی غرض کسی بات کو یاد رکھنا اور پھر اُس کے استعمال کی ضرورت، ان سب کو اس سے پہلے میں کبھی نہ سمجھا تھا۔ اُس شخص کے لئے تم جانتے ہو، اپنی زندگی میں یادداشت کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ اُس پودے کی مانند تھا جسے ایک ایسے مقام پر لگایا گیا ہو جہاں شبنم کا گزر تک نہ ہو سکے۔ کیفیت جو محض ایک نام کے یاد آ جانے سے اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی سوکھے ہوئے درخت

پر صرف ایک سبز پتہ باقی رہ گیا ہو۔ سنو! انسان ایک حیرت انگیز چیز ہے۔ کوئی مخلوق نہیں جو انسان کی طرح مصائب برداشت کر سکے"۔

ہمارا دوست اپنی جگہ سے اُٹھا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"اُس کی دنیا بڑی وسیع نہ تھی۔ ایک ہی کمرہ تھا جو زیادہ سے زیادہ پانچ گز لمبا اور چار گز چوڑا تھا۔ وہ اِس میں تیئیس سال گزار چکا تھا۔ بالکل بے مونس و بے یار۔ اِن قید خانوں کا انتظام اتنا زبردست ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ تک پاس نہیں پھٹک سکتا۔ ذرا سوچو کہ زندگی کی اِس جانکاہ منزل میں سے گزرنے کے لئے اور جسم و روح کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے آدمی کی کتنی قوت صرف ہوتی ہوگی"۔

وہ ہماری طرف مڑ کر کہنے لگا۔

"تم کیا خیال کرتے ہو کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُس کے ہوش و حواس کو اِس حد تک بھی برقرار رکھا ہوا تھا؟ میں تمہیں بتاتا ہوں:" ابھی ہم اُس کی اِس تحریر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اُس نے ہمارے ہاتھ میں لکڑی کا ایک تختہ دے دیا۔ جو ایک بڑی تصویر کے برابر تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر تھی جو ایک باغ کے عین وسط میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور جس کے ہاتھ میں رنگ برنگ کے پھول تھے۔ اُس کے پیچھے ایک چھوٹی سی ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کچھ گھاس تھی اور ندی کے کنارے پر ایک عجیب و غریب قسم کا پرندہ بیٹھا ہوا تھا۔ جو پہاڑی کوے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ لڑکی کے ایک طرف ایک درخت تھا جو بھاری بھاری پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ ان پھلوں میں ایک ایسا تناسب تھا جو کبھی کسی درخت میں نظر نہیں آیا۔ پھر اِس میں ایک ایسی بات بھی تھی جو تمام درختوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِن پھلوں میں جان ہے۔ اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ لڑکی اپنی گول گول آنکھوں سے سیدھا ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور یُوں معلوم ہوتا تھا کہ پھول جو اُس کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ تمام تصویر . . . . میں کیا کہوں . . . . ایک معجزہ نظر آتی تھی۔ خام رنگوں کی نمائش سے یہ بالکل قدیم اطالوی مصوری کا نمونہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی تکمیل کے لئے مشکلات پر غلبہ حاصل کرنے میں انتہائی جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم میں سے ایک نے اُس سے سوال کیا کہ کیا اُس نے تصویر بنانا زمانۂ قید سے پہلے سیکھا تھا۔ لیکن اُس غریب کو ہمارا سوال سمجھنے میں غلطی ہوئی اور وہ کہنے لگا نہیں نہیں منتظم صاحب جانتے ہیں کہ میرے پاس کوئی نمونہ نہ تھا۔ یہ میرا اپنا ہی تخیل ہے۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مگر اُس کی مسکراہٹ شیطان کو بھی رلا دینے والی تھی۔ اُس نے اِس تصویر میں وہ تمام چیزیں رکھ دی تھیں جن کے لئے اُس کی روح بے قرار تھی . . . . عورت، پھول، پرندے، درخت، نیلا آسمان، بہتا ہوا پانی، اور اپنے وہ

تمام حسیات و جذبات جو اُس کے دل میں اِن تمام چیزوں کی دوری سے پیدا ہوتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اُس نے اِس تصویر کو اٹھارہ سال میں بنایا ہے۔ اِس عرصے میں وہ اِسے بار بار رٹتا رہا اور بار بار بناتا رہا۔ اور موجودہ تصویر اُس کا سوواں نقش تھا۔ یہ ایک شاہکار تھا۔ ہاں۔ وہ ستائیس سال سے وہاں رہتا تھا۔ اُس کو زندہ رکھنے کے لئے اِس جیتی جاگتی موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔ جہاں اُس کے حواس معطل پڑے ہوئے تھے۔ دیکھنے۔ سننے سونگھنے اور کسی چیز کو محسوس کرنے کا خیال تک اُس کے حافظہ سے محو ہو چکا تھا۔ اُس کی بھوکی روح کا تصور صرف اُس لڑکی کی تصویر رہ گئی تھی جس کی آنکھیں متحیر تھیں اور جس کے ہاتھ میں پھول تھے۔ بیشک یہ تصویر انسانی ولولے اور شوق کی فتح الفتوح تھی۔ اور کمالِ فن کا عظیم ترین اظہار تھا جو تمام عمر میں میرے دیکھنے میں آیا"۔

ہمارے دوست کے چہرے پر مختصر سی مسکراہٹ آئی۔

"انسان کا دل اتنے پردوں میں محفوظ ہے کہ اُس شخص کی مصیبت کا پورا پورا احساس مجھے تب بھی نہ ہوا گو بعد میں میں نے اُسے محسوس کر لیا۔ جب حاکم قید خانہ نے اُس سے اُس کی صحت کی نسبت کچھ پوچھا اور وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ آہ! میں اپنی موت کے دن تک بھی اُن آنکھوں کو نہ بھول سکوں گا۔ وہ حزنِ مجسم تھیں۔ . . . . . سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو اُس نے گزار دی تھیں اور سکوت و تنہائی کی وہ تمام ابدیتیں جو ابھی قبر تک پہنچنے کے لئے اُسے گزارنی تھیں اُن آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ اگر اُن تمام آزاد انسانوں کی آنکھوں کی رحم انگیز المناکیاں جن کو میں نے عمر بھر میں دیکھا ہے یکجا جمع کر لی جائیں تو پھر بھی وہ اُن آنکھوں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی۔ میں اُن کی تاب نہ لا سکا۔ اور جلد ہی اُس کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔ اُس وقت دکھ اور تکلیف کے اُس تقدس کا احساس مجھ میں پیدا ہوا اور اب تک میں اُسے محسوس کرتا ہوں جو کہتے ہیں کہ روسیوں میں باوجود اُن کے وحشیانہ پن کے موجود ہے۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سب کو اُس کے سامنے جھک جانا چاہئے تھا۔ میں بے گناہ اور آزاد تھا۔ مگر اُس کے سامنے اپنا وجود مجھے مقید اور گنہگار معلوم ہوتا تھا۔ جو جرم بھی اُس سے سرزد ہوا تھا۔ مجھے اُس کی کوئی پروا نہیں۔ اُس برباد شدہ انسان کے خلاف ایسا گناہ کیا گیا تھا کہ مجھے اپنی ذات اُس کے پاؤں کی خاک معلوم ہو رہی تھی۔ جب میں اُس کی نسبت خیال کرتا ہوں تو اپنی نوع کے خلاف میرا جوش دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اُس وقت ساری دنیا کے محبوس جانداروں کا درد میرے ایک سینے میں آ کر اُٹھتا ہے"۔

ہمارے دوست نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور پورے ایک منٹ تک وہ خاموش رہا۔ آخر اُس نے کہا۔

ننّھا ادیب

تیرے ننّھے جی میں کیا آئی کہ اے ننّھے ادیب
کر رہا ہے صفحۂ قرطاس پر گلریزیاں

ہو رہی ہے نوکِ خنجر کی طرح ہر دل کے پار
واہ وا تیرے قلم کی نوک کی یہ تیزیاں

تیری اِن خاموشیوں میں مجھ کو آتی ہیں نظر
تیرے طوفانِ تخیّل کی قیامت خیزیاں

تیرے فکرِ سادہ میں موجود ہیں وہ سب کی سب
برگِ گل میں کی ہیں فطرت نے جو رنگ آمیزیاں

بات کیا ہے جو ترے دل میں سما سکتی نہیں
خامہ تیرا کر رہا ہے کیسی عنبر بیزیاں

جوش کیسا ہے جو ترے سینے میں آخر موجزن
جس سے پیدا ہیں تری جاں میں یہ شور انگیزیاں

شاہدِ معنی اُدھر اور شوخیاں تیری اِدھر
اُس کی کم آمیزیاں اور تیری بے پرہیزیاں

دیکھنا برہم نہ کر ڈالیں زمانے کو کہیں
تیری دل آرائیاں اور اُس کی دل آویزیاں

منصور احمد

آہ وہ شے جو فضا میں زندہ رکھتی ہے تمہیں — آسماں پر رات بھر تابندہ رکھتی ہے تمہیں
آدمی کا دل بھی اُس شے کا امانت دار ہے — وہ مئے سرجوش جس سے زندگی سرشار ہے
فرق اتنا ہے کہ حاصل ہے فلک پر گھر تمہیں — رات نے پہنا دیا ہے نور کا زیور تمہیں
اور زمیں پر رینگتے پھرتے ہیں ہم خاکی نژاد — ہیں ہمیشہ سے رہینِ رنج و غم خاکی نژاد

پھر رہے ہو تم مگر ہم قید ہیں مجبور ہیں
دیکھتے ہیں تم کو لیکن تم سے کوسوں دور ہیں

ہے زمیں خاموش بزمِ آسماں خاموش ہے — دم بخود ہے جھیل اور آبِ رواں خاموش ہے
کر رہی ہے غور ہر شے نظمِ موجودات پر — ایک نشّہ کی سی کیفیت ہے طاری رات پر
چپکے چپکے گیت خاموشی کے گاتی ہے فضا — دیکھ کر تاروں کی جانب مسکراتی ہے فضا
درسِ آگاہی یہاں ملتا ہے ہر تمثال سے — پتہ پتہ کہہ رہا ہے یہ زبانِ حال سے
مجھ کو دیکھو مظہرِ شانِ خدا ہے دل مرا — ماسوا میں بے نیازِ ماسوا ہے دل مرا

پڑ رہا ہے مجھ پہ پرتو اُس مقدس ذات کا
دیدۂ بینا ہے جس سے ذرّہ ذرّہ رات کا

پیش کر سکتی ہے یہ شے صرف تنہائی ہمیں — گھیرتے ہیں جب خیالاتِ من و مائی ہمیں
پھوٹتی ہیں نور کی کرنیں دلِ آگاہ سے — ہوتے ہیں اس وقت بندے ہم کلام اللہ سے
ہر بُنِ مو سے نکلتی ہے انا الحق کی صدا — روح کے سانچے میں ڈھلتی ہے انا الحق کی صدا

ایسی حالت میں نقابِ جسم اٹھا دیتے ہیں ہم
موت بھی آئے تو اُس کا منہ چڑا دیتے ہیں ہم

فاخر ہریانوی

نئے سال کا پیغام

(حکمتِ مغرب کا ایک ورق)

چندروز ہوئے ایک عزیز دوست نے شکایت کی تھی کہ جب زندگی کی تکلیفیں، دوستوں کی بے وفائیاں اور رشتہ داروں کی نامہربانیاں یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں کہ دنیا میں زندہ رہنے سے کیا حاصل؟ یہی ناکہ مستعار زندگی کے جتنے دن بھی باقی ہیں وہ انہیں کلفتوں میں کٹ جائیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر جان بوجھ کر آنے والے مصائب کی یاد میں اپنی روح کو تکلیف دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

نہ صرف میرے یہ دوست زندگی کے تاریک پہلو پر نظر رکھتے ہیں بلکہ دنیا کی آبادی کا سے بھی زیادہ حصہ زندگی کے روشن پہلو پر نظر ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ گذشتہ واقعات کی یاد ہی سب سے بڑا زہر ہے جو ہماری جسمانی وروحانی مسرت کی شیرینیوں کو بالکل تباہ کردیتا ہے۔ اسی لئے آؤ نئے سال سے تمام گذشتہ نقصانات اور رنج وغم کو دل سے بھلادیں۔

نیا سال برکت وسعادت کا پیغام اپنے ساتھ لایا ہے۔ اپنی بگڑی زندگی کو نئی امنگوں سے استوار کریں۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہم گزرے ہوئے واقعات، کھوئی ہوئی دولت، اقربا کی مفارقت یا محبت کی تلخکامیوں کے ہتھوڑوں سے زندگی کے خوبصورت قصر کو قبل از وقت مسمار کردیں۔

عزیز دوست مجھ سے مت کہو کہ دنیا میں کسی قسم کی کامیابی یا مسرت حاصل کرنے کا وقت گذر گیا۔ مجھے مت سناؤ کہ تم بیمار ہو یا تمہاری روح افکارِ دنیا سے زخمی وگھائل ہوچکی ہے۔ روح عطیۂ ایزدی ہے، دنیا کی کوئی طاقت اُسے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچاسکتی۔ یہ تمہارے ادنیٰ خیالات ہیں جو تمہیں بیمار و مضمحل بنائے رکھتے ہیں۔ اپنی روح کو، اپنے دل کو مجبور کرو کہ وہ تمہارے لئے صحت وامید اور مسرت وشادمانی حاصل کرے۔ ہروقت صحت اور خوشی کے بلند و پاکیزہ خیالات وجذبات کو اپنے دل ودماغ میں جگہ دینے سے نئے سال کے چند مہینوں میں دنیا کے کامیاب اور خوش مزاج آدمیوں میں تمہارا شمار ہوسکتا ہے۔

کھوئے ہوئے روپے کا خیال دل سے بھلادو، اپنی غلطیوں اور لغزشوں کو فراموش کردو، حوادثِ دنیا کے زخم اور گذشتہ

ناکامیوں کو بالکل نظر انداز کردو۔ عزیز و اقربا کی اموات کا غم مٹاتے نہیں مٹتا ـــــ یہ بالکل درست ہے لیکن پیارے دوست یہ رنج و غم خدا کی طرف سے اِس لئے ہمارے پاس آتے ہیں کہ ہم بنی نوع انسان کے ساتھ زیادہ تلطف اور زیادہ مہربانی سے پیش آنا سیکھ جائیں۔ ایسا نہ کرنے کی بجائے اگر اُن سے مشتعل اور ناراض ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ہم میں اور ادنیٰ جانوروں میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ناانصافی اور کمزوری ہوگی اگر ہم یہ کہہ دیں کہ خدا نے ہمیں اِس نقصانِ عظیم کی سختیاں برداشت کرنے کے لئے منتخب کر لیا ہے۔

ایک بالغ نظر مُعلم[1] کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے اپنے شاگردوں کے سامنے کسی بہترین خیال کے اظہار کے لئے ڈیڑھ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ جس خیال پر انعام عطا کیا گیا وہ یہ تھا "انسان اِس بات پر ناراض ہے کہ خدا نے گلاب کے ساتھ کانٹے پیدا کئے ہیں، برعکس اس کے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خدا کا شکر یہ ادا کیا جائے کہ اُس نے کانٹوں کے ساتھ گلاب پیدا کیا ہے" ـــــ زندگی کی نصف تلخیاں اُس وقت کافور ہو جاتی ہیں جب ہم دنیا کو اِس کے کانٹوں سمیت خوشی و مسرت کا گہوارہ سمجھنے لگیں۔

ایک اُداس و غمگین چہرہ، مرجھائی ہوئی صورت، ایک کڑھنے والا دل اور چڑچڑا مزاج اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ چیزیں تمہاری کمزوریوں کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اور اِس بات کی مظہر کہ تمہیں اپنے گرد و پیش کے حالات پر قابو پانے کا سلیقہ ہی نہیں۔ اِس لئے آج ہی عہد کرو کہ تم اِن تمام برائیوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کرو گے ـــ خود حکومت کرنا سیکھو، اپنے دشمنوں کو دل کے تخت پر بٹھا کر اُن کے غلام مت بنو، اقلیمِ دل کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لو۔

میں یہ بھی سننا نہیں چاہتا کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو ـــــ عمر کے سالوں کی تعداد ایک ڈراونے بھوت کی طرح ہے، اس تعداد کو نظر انداز کردو بڑھاپا کسی اور کے در پر دھرنا دے کر بیٹھ جائے گا۔

اپنے کھانے میں اعتدال پیدا کرو، تازہ پانی سے روزانہ غسل کرو۔ خوب ورزش کرو لیکن بلاناغہ۔ کوشش کرو کہ سر سے پاؤں تک، تمہاری رگ رگ میں، زندگی کے آثار پائے جائیں۔ صبح و شام صرف پانچ پانچ منٹ تک اپنے پھیپھڑوں کو خوب پھیلاؤ اور سانس لیتے وقت صدقِ دل سے یقین کرو کہ تم صحت، فرزانگی اور کامیابی کے سانس لے رہے ہو۔

ہر وقت یہ امید رکھو کہ صحت تمہیں ضرور میسر ہوگی۔ ایسی چیزیں یکدم حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تمہارے تصور

---

[1] میری مراد ڈوایٹ ایل موڈی سے ہے۔

میں صرف یہی بات رہنی چاہئے کہ یہ بالکل عارضی توقف ہے۔ اور اُسے کامل طور پر حاصل کرنے کے لئے ہر وقت متوقع رہو۔ جسمانی ایذاؤں کو یہ کہہ کر بھلا دو کہ ایک دفعہ جاکر پھر واپس نہیں آسکتیں اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اِس خیال کو دماغ میں جاگزین نہ ہونے دو کہ تم مستقل طور پر بیمار رہو کسی سے مت کہو کہ تم دائم المرض ہو۔

فرانس کے نوجوان علم کیمیا کے مطالعہ میں مصروف ہیں اس امید پر کہ شاید کسی دن سونا بنانے کا راز اُنہیں معلوم ہو جائے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تم اپنے دل اپنی روح اور اُس کی لامحدود قوتوں کا مطالعہ کرو۔ تمہاری کامیابی کے نتائج دنیا کے بڑے سے بڑے کیمیادان کی امیدوں سے عظیم تر ثابت ہونگے اور تم ایک ایسا قابلِ رشک طلسم سیکھ جاؤ گے کہ دنیاوی راحت و آرام اور دولت و تنعم کے غیر مختتم ذخیرے تمہارے قدموں کے نیچے ہونگے۔

اپنے بدن کو جواہر رکھنے والی چاندی کی ڈبیہ، دل کو مخمل کا استر اور اپنی روح کو ایک بیش بہا جواہر خیال کرو۔ اِس ڈبیہ کو ہر وقت چمکیلا اور گرد و غبار سے محفوظ رکھو لیکن اس بات کو کبھی فراموش نہ کرو کہ اِس ڈبیہ کے سب سے گرانقدر جواہر کو معصیت و گناہ کے زنگ سے بچانا تمہاری زندگی کا سب سے پہلا فرض ہے۔

آج پہلی تاریخ ہی سے اِس بات کو ذہن نشین کرلو کہ تم عدیم المثال کامیابی کے قصرِ فلک بوس کے سنہری دروازے میں کھڑے ہو، ایک مکمل اور شاندار سال تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایک سال کے عرصہ میں تمہیں اپنی صحت کو دوبارہ حاصل کرنے کے علاوہ دولت، اطمینانِ قلب اور سرمدی مسرتوں کو بھی اپنے قبضہ میں لانا ہے۔

دوستو! بڑھو، اور اِن چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کردو۔ خدائے واحد نے اُنہیں تمہارے لئے پیدا کیا ہے اپنا حصہ ضرور حاصل کرو۔

محمد ضیاء الدین شمسی

وجدانیات

اُن کو درپیش ہے تقریب سفر کیا ہوگا — بیٹھ بھی جاؤں اگر خاک بسر کیا ہوگا

موت ہے موت مجھے دردِ جدائی کا خیال — میرے اللہ جدائی کا اثر کیا ہوگا

میرا گھر کا ہے کو ہے ایک سیہ خانہ ہے — شمع گر رہ نہیں گھر میں تو گھر کیا ہوگا

دلِ وحشت زدۂ ہجر پہ کیا گزرے گی — وہ تسلی مجھے دیتے ہیں مگر کیا ہوگا

اُن کے جانے سے پریشاں نظری ہتی ہے
کوئی بتلائے مجھے اہلِ نظر کیا ہوگا

عابد علی عابد

کلامِ گرامیؔ

(غیر مطبوعہ)

عشوہ در پردہ ستمہاست کہ با ما مے کرد | صبر فرمود حیا، شوق تقاضا مے کرد
غمزہ را رخصتِ خونریز دہد تا چہ کند | جور نا کردنش آں بُود کہ گویا مے کرد
تار تار است گریبانِ شکیبم امشب | کیست گستاخ کہ آں بندِ قبا وا مے کرد
ناںگوئیم کہ فردا بتر ست از امروز | وائے امروز کہ سر در سرِ فردا مے کرد
کارِ امروز بفردا مگذار اے غافل | وائے آں ابلہ کہ سر در سرِ فردا مے کرد
نعرہ ہا بر زدم آں آفتِ جاں بر نگرفت | گریہ سر کردم و دُزدیدہ تماشا مے کرد
من بخود گم شدہ ام گم شدہ را مے جویم | حیف منصور چہ گم کرد کہ پیدا مے کرد
کرد در نقطۂ دل خامۂ اُستادِ ازل | نقشِ صنعت کہ بایں گنبدِ مینا مے کرد
ساقی آں بادہ کہ از خُم کدۂ وحدت ریخت | نشۂ بیخودیٔ عشق دو بالا مے کرد
کارِ ما بود گرہ در گرہ از گردشِ چرخ | چشمِ ساقیست کہ از کار گرہ وا مے کرد
ذرہ ام رقص کناں خیمہ بخورشید زند | قطرہ ام شور باندازۂ دریا مے کرد

زیرِ لب خندۂ خوش داشت گرامیؔ در نزع
جاں بجاناں دہد و قطرہ بدریا مے کرد

گرامیؔ مرحوم

موت

موت منڈلا رہی تھی۔ ہاں گاؤں کے ارد گرد چاروں طرف موت منڈلا رہی تھی۔

چپکے چپکے رات کی تاریکی میں وہ یہاں آئی تھی۔ غم کے اونچے اونچے سیاہ پہاڑوں کو پھلانگتی ہوئی۔ خون کی سرخ ندیوں کو چیرتی ہوئی اور جلتے ہوئے آنسوؤں کے دریاؤں کو عبور کرتی ہوئی وہ چلی آئی تھی۔ اس کی راہ میں آہوں کے جھکڑ چلتے تھے۔ الم انگیز نالوں کے بادل گرجتے تھے اور خون کے آنسوؤں کی بارش ہوتی تھی لیکن وہ چلی آئی۔ اپنی پرسکون رفتار سے زیر لب مسکراتی ہوئی وہ چلی آئی۔ اس کی تفرقہ پرداز طبیعت کو روح اور جسم میں تفرقہ ڈلوانے سے بڑا لطف آتا تھا۔

اس نے کئی بڑے بڑے دروازوں کو کھٹکھٹایا لیکن ہر بار زہریلے نشتروں سے اس کے پاؤں زخمی ہوئے۔ ایک ہرے بھرے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑی ہو کر وہ ہنسی۔ "کیسے بیوقوف لوگ ہیں"۔ لوگ کہتے تھے کہ اس درخت پر بجلی گر گئی۔ لیکن یہ تو موت کی ہنسی تھی۔ اُف اس کا تبسم بھی کس قدر خوفناک تھا۔

ایک بے در کا جھونپڑا۔ آہ ایک بے در کا جھونپڑا! اس نے اپنا سر آگے کی طرف جھکایا اور پھر مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر سب کا اس کے دل میں بس ایک ہی درجہ تھا۔

غریب آدمی مسافرت پر جانے کے لئے اپنے بچوں سے رخصت ہو رہا تھا۔ موت نے کہا "آہا غربت، یہ مجھے اور بھی مرغوب ہے"۔ کیا ہوا میں اس کے پیچھے جاؤں گی۔

دبے پاؤں وہ اس کے پیچھے ہو لی۔ جس جس راستے سے وہ گزرا وہ بھی گزرتی گئی۔ اس کی رفتار ریل گاڑیوں سے بہت تیز تھی۔

لڑکی نے گھر کو صاف کر کے کونا کونا مٹی سے لیپ دیا۔ بار بار اس کے کانوں میں اپنے باپ کی آواز گونجتی تھی "میری سلیقہ مند بیٹی"۔ وہ ہنستی ہوئی چکی چلاتی تھی کہ میرا باپ اب جلد واپس آنے والا ہے۔ وہ گیت گاتی تھی۔ افلاس کے دنوں اب رخصت ہو جاؤ کیونکہ میرا باپ اب آنے والا ہے۔ کیا ہوا اگا ئے کم دودھ دینے لگی ہے۔ اب اسے پیٹ بھر کے چارا ملے گا کیونکہ میرا باپ اب آنے والا ہے۔ میرے ننھے بھائیوں کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ اور وہ سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ لیکن میں کیوں غم کروں کہ میرا باپ اب آنے والا ہے۔ اس نے کہا مدت گزر گئی ہمیں کسی نے محبت کی نظروں سے نہیں دیکھا میرے بھائی لوگوں کی گھڑکیاں سہتے ہیں۔ لیکن میں غم کیوں کروں کہ میرا باپ اب جلد آنے والا ہے۔

ہر روز لڑکی، دل میں نئی نئی امنگوں کو لئے ہوئے اُٹھتی لیکن انتظار کے دن مایوسی میں تبدیل ہوتے گئے۔ اُس نے دعا مانگی اور کہا ۔ اگر میرا باپ خیریت سے آجائے تو میں خانقاہ میں دیا جلاؤں گی ۔

وطن کی محبت نے کمزوری اور ناتوانی کو بُھلا دیا۔ وہ آگیا اپنے گھر میں وہ آگیا مگر روح اب جسم سے رخصت ہو رہی تھی۔ لڑکی نے باپ کی صورت دیکھتے ہی سر پیٹ لیا۔ "میرے خدا میں کیا سوچ رہی تھی اور یہ کیا ہو گیا"

اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اُس کی زبان اور اُس کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا تھا اور اُس کی گردن پیچھے کو ڈھلک گئی تھی بیٹی اُس کے سینے سے لپٹی ہوئی پوچھ رہی تھی میرے باپ کس نے تمہارا یہ حال بنا دیا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ لیکن اُس کی نیم مردہ آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

باپ کا اشارہ سمجھ کر لڑکی نے بچوں کو اُس کے پاس بلانا چاہا۔ "میرے ننھے بے کس بھائیو آؤ آخری بار اپنے باپ سے مل لو۔ بچے چیخیں مارنے لگے اُنہیں موت کے گھونگروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ موت اُن کے باپ کے اردگرد رقص کر رہی تھی اور وہ اُس کے پاؤں کے گھونگروؤں کی دھیمی دھیمی آواز سُن رہے تھے ۔ وہ زیرِ لب مسکرائی۔ ننھے بچوں کا دل توڑنے میں اُسے خاص راحت ہوتی تھی ۔ وہ رقص کرتی رہی ۔ ہاں اُس کی تفرقہ پرداز طبیعت کو روح اور جسم میں تفرقہ ڈلوانے سے بڑا لطف آتا تھا ۔ آج کی رات آخری تھی اور وہ مطمئن تھی ۔

لڑکی رو رہی تھی اُس کے رونے میں قیامت کا درد تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کے اِس سیلاب میں اُسکا دل اور جگر بھی پگھل کر بہ جائے گا۔ اُس نے کہا "میرے باپ تم اِن چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اب ہمیشہ کے لئے تم اُنہیں لوگوں کے طعن و ملامت کے لئے چھوڑ جاؤ گے ۔ میرے بھائی بہت نازوں سے پالے گئے تھے کون اب اِن کے ناز اُٹھائے گا۔ میرے باپ میرا سب مان تیرے ہی ساتھ تھا ۔ اب میں ہمسایوں کے طعنے سنوں گی اور ہر ایک کی ملامت سہوں گی۔ کوئی محبت سے میرا نام لے کر اب مجھے نہ پکارے گا۔ اور کسی کی آواز سُن کر میں خوش ہو کر ہنستی ہوئی اپنے گھر کی چوکھٹ سے باہر نہ جھانکوں گی۔ میرے باپ ہم کتنے بے کس ہو جائیں گے۔"

وہ کچھ نہ بول سکتا تھا ۔ لڑکی نے کہا میرے باپ مجھے صرف ایک دفعہ بتا دے کہ تجھے کس نے ایسا بے بس کر دیا۔ وہ خاموش رہا۔ اب روح جسم سے آخری بار گلے مل رہی تھی۔ موت رقص کرتی رہی وہ خوش تھی کہ اب روح جسم کو الوداع کہہ رہی ہے۔ روح پرواز کر گئی مرنے والے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو آخری قطرے ڈھلک کر مٹی میں مل گئے۔

موت آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کی بیٹی زمین پر گری پڑی تھی اور اُس کے معصوم بچے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ اُن کے قریب سے مسکراتی ہوئی گزر گئی۔ چپکے چپکے وہ چلی گئی ـــــــ کسی اور جسم اور کسی اور روح میں تفرقہ ڈالنے کے لئے وہ چلی گئی۔

ز ۔ ب

جامِ صہبائی

(۱)

بے نیاز طلسمِ زندگی کو پایا
آلودۂ غم سرورِ ہستی کو پایا
تسکیں ہے اگر ہو فراواں میں اثرؔ
سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا

(۲)

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر
اے ننگِ جہاں رنج کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے زندگی کا ہستی میں وقار
کھا زخم پہ زخم اور فریاد نہ کر

(۳)

دشوار نہیں ہے سہل مشکل میری
مشکل سے مرادیں ہوں گی حاصل میری
دشواریٔ رہِ طلب سے ہمت ہے اثرؔ
خوش ہوں کہ بہت کٹھن ہے منزل میری

(۴)

بیگانۂ عقل و ہوش ہوتا جاتا ہوں
بے خود و خاموش ہوتا جاتا ہوں
طوفان ہیں ہمہ تن شکست
تقدیر کو کوستا ہوں ہنگام …
جب سوچتا ہوں جو … ش ہو جاتا ہوں

اثرؔ صہبائی

شاعر کی دُعا

اے خدا! اے زمینوں اور آسمانوں کے بادشاہ! کائنات کے ذرے ذرے میں تیرے حسنِ ابدی کا پرتو نظر آ رہا ہے اور تیری شانِ جمالی ایک نغمۂ خاموش کی صورت میں تمام موجودات پر چھا گئی ہے۔ پہاڑ، دریا، سمندر، درخت، سورج، چاند ستارے سب تیری پرستش میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی رحمت سے میرے بے قرار دل کو اسی نغمۂ خاموش کی چادر سے ڈھانپ دے تاکہ میں تیری تسبیح پڑھوں، تیری قدوسیت کے گیت گاؤں، اور میرے اشعار تیری حمد کے ترانے بن کر بہنے لگیں۔

اے ذوالجلال میں رازِ آفرینش پر غور کرتا ہوں اور حقیقت کی گہرائیوں میں اُس کی تلاش میں مصروف ہوتا ہوں تو تیری عظمت میرے دل پر چھا جاتی ہے اور میں مجسّم حیرت بن جاتا ہوں، اپنے کرم سے حقیقت کو بے نقاب کر کے اُس راز کو مجھ پر آشکار کر دے تاکہ میرے زمینی نغموں میں آسمانی عظمت اور وقار پیدا ہو جائے اور اِس تیرہ خاکدان کے رہنے والوں کو روحانی زندگی کے سرچشمے سے نزدیک کر سکوں۔

اے خالقِ کائنات! میرے دل کی کھیتی میں تو نے عشق کا بیج بویا ہے اور آبِ حسن سے اُس کی آبیاری کی ہے اب اُسے آزادی کی ہوائیں جلد تناور درخت بنا دیں تاکہ فرشتۂ شعر اُس کی شاخوں میں بیٹھ کر آسمانی زندگی کے نغمے بلند کرے اور بھولے بھٹکے انسانوں کو سیدھے رستے پر چلنے کے لئے آمادہ کر دے۔

اے معبودِ حقیقی! ہر حال میں صداقت میرا شعار بنا رہیو اور حقیقت میرے کلام کا جوہر۔ شخصی زندگی کا بیان ہو یا اجتماعی زندگی کی داستان، مناظرِ قدرت کی تعریف ہو یا مظاہرِ کائنات کی توصیف، حقیقت اور صداقت کے سررشتہ کو میرے ہاتھ سے نہ جانے دیجیو۔ میری عزتِ نفس اور پاکیزگیٔ قلب کو قایم رکھیو تاکہ میرا قلم جادۂ حقیقت سے انحراف نہ کر سکے۔ حقیقت کو میری آنکھوں میں جلوہ گر کیجیو تاکہ مجھے ہست سے سروکار رہے اور نیست سے دھوکا نہ کھا سکوں۔ میرا کلام ایک آئینہ ہو جس میں صداقت کی رعنائی منعکس ہو۔ میرا سخن ایک ساز ہو جس سے حقیقت کے نغمے بلند ہو ہو کر فضا کو معمور کر رہے ہوں۔

الٰہی! محبت تمام فضائلِ انسانی کا منبع ہے مجھے اِس کے بیان کرنے کی توفیق عنایت کیجیو تاکہ میرے اشعار

دنیا جہاں کے لئے پیغامِ رحمت ہوں۔ اور انسانی آبادیوں میں بسنے والوں کو حیاتِ حقیقی سے آشنا کرسکیں۔

سبز درختوں اور خوشنما پھولوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں میں آبشاریں اور جوئباریں کس آزادی سے اپنے موسیقی سے لبریز نغمے بلند کررہی ہیں! میرا دل بھی سبز و شاداب پہاڑوں کی مانند ہے جس سے چشمے پھوٹ پھوٹ کر آنکھوں کے رستے بہ رہے ہیں۔ یہ میرے اشعار ہیں۔ اے قادرِ مطلق! انہیں آبشاروں اور جوئباروں کی آزادی و موسیقی سے لبریز کردیجیو۔

اے رحمن و رحیم! تاریک راتوں میں چاند کی روشن مشعل کو آسمان پر نمودار کرکے تو ساکنانِ خاک کے لئے نور کی چادر بچھا دیتا ہے۔ میرے کلام کو مشعلِ مہتاب کی مانند نورانی بنا دیجیو، تاکہ جب آدم کے بیٹے مصائب و تکالیف کی تاریکی سے دوچار ہوں تو اُس کے مطالعہ سے اُن کا اضطراب اور بے قراری آرام اور سکون سے بدل جائیں۔

جب تاریک رات گھنگھور گھٹا کی طرح عالم پر چھا جاتی ہے اور آہستہ آہستہ کائنات کو اپنی سیاہ چادر میں لپیٹ لیتی ہے، تو آفتابِ جہاں تاب کی شمشیرِ ظلمت کے پردوں کو چاک چاک کرکے مشرق سے ظاہر ہوتی ہے اور اِس خطۂ خاک میں نور کی نہریں بہا دیتی ہے۔ اے دونوں جہانوں کے بادشاہ! میرے آتشین نغموں کو سورج کی تلوار بنائیو۔ تاکہ جب ظلم کی تاریکی انسانی بستیوں کا احاطہ کرلے تو یہ تلوار اس کے کثیف پردوں کو چاک کرکے عدل کے جمالِ جہاں آرا سے فضا کو نورانی بنا دے۔

اے کون و مکان کے خالق! تو دیکھتا ہے کہ مغرب کی تہذیب نے کس طرح عالم کو مسخر کر رکھا ہے! مادی تمدن کے تجملات نے انسان کو اپنی حقیقت سے بے بہرہ کردیا ہے، اشرف المخلوقات اقتصادی فشار کے باعث ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اقوامِ عالم بوقلموں کی طرح رنگ بدل رہی ہیں۔ ایک غلامی کا طوق گلے سے اتارتی ہیں۔ دوسری کا پہن لیتی ہیں، مشرق کی روحانیت جو اب تک تیری مخلوقات کی زندگی کا سرمایہ رہی ہے حرفِ غلط کی طرح مٹی جارہی ہے ممکن ہے کچھ عرصے کے بعد حقیقتِ انسانی ان روز افزوں تکلفات کے پردوں میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جائے۔ اور فرزندِ آدم محض بناوٹ اور تصنع کا ایک پتلا بن کر رہ جائے۔ اے خدا! میرے سرود میں وہ آگ بھر دے جس کے شعلے کوہِ آتش فشاں کی مانند فضا میں بلند ہوکر مشرق کے لئے زندگی کا آتشیں پیغام ثابت ہوں اور اِس آدمیت سوز تہذیب کو جلا کر خاکستر کردیں۔

میری ملّت اور میرا ملک مملکتِ حیات کی حدود سے باہر نکل چکے ہیں۔ انواع و اقسام کی غلامی نے انہیں پابزنجیر کر رکھا ہے۔ باہمی معرکہ آرائیوں میں وہ اپنے قویٰ کو مضمحل کر رہے ہیں۔ وہ کھاتے ہیں۔ سوتے ہیں اور چل پھر سکتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ زندہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں زندگی اُن سے کوسوں دور ہے! اے نیست سے ہست کرنے والے خدا! میرے اشعار میں وہ حرارت پیدا کر دے جو ان کے دلوں کو گرما سکے، ان کی مردہ رگوں میں خون حیات کا دورہ پیدا کر سکے، اور اُن کو عزت و آبرو کی آزاد زندگی بسر کرنا سکھا سکے۔

اے زمین و آسمان کے مالک! مختلف لوگ تیری بارگاہ میں مختلف آرزوئیں لیکر آتے ہیں، کوئی تخت و تاج کا خواستگار رہے، کوئی جاہ و منصب کا طلب گار، کسی کو اولاد کی ہوس ہے کسی کو زر و مال کی خواہش۔ میری آرزو ہے کہ مجھے اسرارِ حیات سے آگاہی بخشیو اور اُن کی نغمہ سرائی کی طاقت عطا کیجیو۔ تاکہ میرے اشعار بقائے دوام کی دولت سے مالا مال ہوں اور صحرائے ایام میں ایک ایسے سربفلک مینار کی طرح قائم رہیں جو انقلابات زمانہ کے باد و باراں سے ہمیشہ مامون رہے۔ اور مسافرانِ حیات کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دے۔

محمد اکبر منیر

غزل

وہ خود بیتاب ہونگے غفلتِ صبر آزما کب تک	نہ پوچھا جائے گا ہم سے ہمارا مدعا کب تک
تجھے محرومیوں نے بھی نہ دی تعلیم خود داری	ہوس تاثیر کی اے بیری آہِ نارسا کب تک
بس اب اُٹھ ہمتِ مردانہ میری دستگیری کر	ہوائے التجا کب تک تقاضائے دعا کب تک
تری بیگانہ خوئی سے بڑھی جاتی ہے مایوسی	مری پرسش کو آئے گی نگاہِ نارسا کب تک
بتا اے چارہ گر اس سعیِ لاحاصل سے کیا حاصل	خجل ہوتی رہے گی درد سے میرے دوا کب تک
کسی کی بے نیازی ہے کچھ ایسی مانعِ جرات	نگاہیں دیکھئے کرتی ہیں عرضِ مدعا کب تک
کبھی تو اُس رخِ روشن کو رخصت ہو بشارت کی	رہے مایوس تیرے گیسوؤں کا مبتلا کب تک

غزل کا لطف ہے وابستہ طرزِ کہن وحشت
خیالِ خاطرِ اصحابِ جدت آشنا کب تک

رضا علی وحشت

معارف

(۱)

مرغ طوبیٰ نشیں کا دام ہے زیست؟ دل کی بے تابیوں کا نام ہے زیست؟

یا خرابات ہیں زمان و مکاں؟ اور شراب خودی کا جام ہے زیست؟

(۲)

جوہرِ دل کی بے نقابی ہے؟ یا عناصر کی کامیابی ہے؟

اصل دل ہے کہ زیست کیا معلوم؟ کون سی چیز اکتسابی ہے؟

(۳)

قلبِ مضطر کا اضطراب کہیں؟ یا اسے سحرِ نان و آب کہیں؟

زیست کی اصل کیا ہے کیا جانیں؟ زیست کو آب یا سراب کہیں؟

(۴)

فرق ہے زیست اور ہستی میں بے خودی اور خود پرستی میں

زیست ہستی کا ہے قیام امینؔ اِس "زمان و مکاں" کی بستی میں

(۵)

محوِ حیرت ہوں دیکھ کر دل کو یہ شعور اور پارۂ گِل کو!

حسنِ لیلیٰ کا ہے ظہور امینؔ جس نے چمکا دیا ہے محمل کو

(۶)

کوئی سمجھے ہوئے ہے، طور ہے دل کوئی کہتا ہے "عینِ نور ہے دل"

رازِ دل اہلِ دل ہی جانتے ہیں پرتوِ مہرِ ذی شعور ہے دل

(۷)

اُس سے ہم بے نیاز ہو نہ سکے! یہ کرشمے یہ ناز ہو نہ سکے!

اور سب کچھ ہوئے امینؔ لیکن غزنوی سے ایاز ہو نہ سکے

"امین حزیں"

محبّت کے گمشدہ الفاظ

(۱)

کوہ قاف کی رشکِ ارم وادیوں میں ایک بے رحم پری رہتی تھی۔ وہ لالہ و یاسمن کے پھولوں سے زیادہ حسین لیکن اُس زہریلے ناگ سے کہیں زیادہ شریر تھی جو لمبی لمبی گھاس میں چھپ کر راہ چلتے لوگوں پر حملہ کرنے کے لیے ہر وقت مستعد و آمادہ رہتا ہے۔ اِس پری نے ایک وسیع و عریض مملکت کے لوگوں سے اِس بات کا انتقام لینا چاہا کہ فرمانروائے ملک کی دخترِ بلند کی سالگرہ کے موقع پر وہ لہو و لعب میں اتنے مشغول ہوئے کہ اُس کا شکریہ تک ادا کرنا بھول گئے۔ یہ ملک کہاں واقع تھا، کہانی اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی --- غالباً اُس کے حدود اس ملک سے ملتے تھے جس کے خیاط شہزادیوں کی بیش قیمت قباؤں پر چاند اور ستارے مزین کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

پری اس سوچ میں تھی کہ آیا اُن خبیث روحوں اور شیاطین کو ہزاروں کی تعداد میں بھیج کر اس ملک کو تباہ و غارت کر دے جو اُس کے حکم سے فلک بوس محلات اور پھوس کے جھونپڑے جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ یا گلاب اور موتیا کے پھولوں کو رنگینی اور نعطر سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دے۔ یا ملک کی تمام خوبصورت لڑکیوں کو کریہہ منظر بوڑھی عورتوں کی شکل میں تبدیل کر دے۔ پورب اور پچھم، اتر اور دکن کی تند ہواؤں سے تمام عالی شان عمارتوں اور سرسبز درختوں کو سطحِ زمین کے برابر کر دینا بھی اُس کے حیطۂ اقتدار میں تھا۔ اُس کے ایک اشارۂ ابرو پر جوالامکھی پہاڑوں کے شرارے چشم زدن میں تمام سرزمین کو آتش رقیق سے ڈھانپ سکتے تھے۔ اور روشنی بخشنے والا سورج آنکھ بند کر کے اُس ملک سے گزر سکتا تھا تاکہ اُس کی روپہلی کرنیں اس معتوب ملک کے کسی گوشہ میں اپنا نور نہ بکھیر سکیں۔ لیکن بدباطن پری نے اِن ہولناک سزاؤں سے بھی زیادہ شدید انتقام لیا اور ایک مشاق چور کی طرح جو اطمینان کے ساتھ کسی صندوق سے گرانمایہ جواہر انتخاب کر رہا ہو اُس نے مرد اور عورتوں کے دلوں سے پانچ سماوی الفاظ محو کر دیئے۔

"مجھے تم سے محبت ہے"!!

یہ سزا دے کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکرائی لیکن مسرتِ انتقام کا یہ خندۂ زیرِ لب شاید اُس کے خبثِ نفس سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا اگر مبدأ فیاض نے اُسے سب سے زیادہ خوبصورت اور گلفام ہونٹ نہ عطا کئے ہوتے۔

(۲)

پہلے پہل اُس بدنصیب سرزمین کے مرد اور عورتوں کو اس سختی اور ظلم کا پُوری طرح احساس نہ ہوا۔ وہ اتنا ضرور محسوس کرتے تھے کہ کسی بات کی اُن میں کمی ہے۔ لیکن یہ نہ بتا سکتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے۔ خوبصورت وکشادہ بازاروں میں جب مہ جبین لڑکیاں اپنے منگیتروں سے ملتیں۔ یا نئی بیاہی ہوئی دلہنیں خلوتکدوں میں اپنے محرم راز شوہروں سے ہم کلام ہوتیں تو کچھ کہتے کہتے رک جاتیں پھر وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اجنبیت سی محسوس کرنے لگتے۔ وہ ایک رسمی جملہ زبان سے نکالنے کی آرزو کرتے لیکن انہیں یاد نہ آتا تھا کہ وہ جملہ کیا تھا۔ عشق وشباب کی امنگوں سے معمور عشاق حیران ومضطرب تھے لیکن اپنے اضطراب کے متعلق کسی سے سوال نہ کرسکتے تھے کیونکہ کچھ ایسے بُرے طریق سے اُن نایاب الفاظ کو اپنے حافظہ سے خارج کرچکے تھے کہ اب اُنہیں یہ بھی نہ سوجھتا تھا کہ کسی سے سوال بھی کریں تو کیا کریں۔ پھر بھی اِس وقت تک اُن کی تکلیف زیادہ پریشان کن ثابت نہ ہوئی تھی کیونکہ اُن کے علاوہ بہت سے الفاظ تھے جو ایک دوسرے سے سرگوشی کی آوازمیں کہہ سکتے تھے اور اظہارِ محبت کے اور بہت سے طریق انہیں معلوم تھے۔

افسوس! ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک قسم کا رنج وملال اُن کے حساس دلوں پر محیط ہوگیا۔ بیسو وطور پر اب وہ ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے اور بیسو وطور پر ایک دوسرے کو پیارے ناموں سے پکار کر محبت کی دلگداز زبان میں باتیں کرتے تھے۔ اس امر کا اظہار کہ اُن کے بوسوں میں تمام دنیا کی فرحت ولطافت موجود تھی، اُن کے دلوں کو مطمئن نہ کرسکتا تھا۔ اور اِس بات کی قسم کھانا کہ میاں، بیوی کے لئے اور بیوی شوہر کے لئے جان تک دے دینے کو تیار تھی یا ایک دوسرے کو "میری روح" ۔ "میری مسرت" یا "میرے دل افروز خواب"! کہہ کر پکارنا اب سعئ لاحاصل تھا۔ وہ بلا تامل ایسے لفظ کے بولنے اور سننے کی ضرورت محسوس کرتے تھے جو تمام دیگر الفاظ سے زیادہ دلآویز اور زیادہ شیریں تھا۔ جب اُن کے حافظہ میں اُس لفظ کی انگبینی کا خیال آتا تو اُن پر جانکنی کی سی حالت طاری ہوجاتی کیونکہ وہ اب اچھی طرح جان چکے تھے کہ اُن میں سے اب کوئی بھی نہ اُس لفظ کو زبان سے نکال سکے گا اور نہ کانوں سے سن سکے گا۔

اظہارِ جذبات کی اس بے مائگی کا لازمی نتیجہ آپس کے جھگڑے تھے۔ شوہر بیوی کے حسن وشباب اور نسائیت کی جملہ دلفریبیوں کے ہوتے ہوئے بھی زندگی کی مسرتوں کو ادھورا خیال کرتا تھا اور بیوی، شوہر کے ہونٹوں کی گرمی محسوس کرنے کے باوجود اُس سے ایک ایسی چیز کی طالب تھی جو نہ تو اُس کا خاوند نہ وہ خود جانتی تھی کہ کیا ہے اور نہ اُس مطلوبہ چیز کا نام بتا سکتی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے کو سرد مہری کا ملزم گردان رہے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو

پیماں شکن کہتے اور اظہارِ الفت و تلطف کو تصنع کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اُس کا اظہار اُس طریق پر نہ ہوتا تھا جس طریق پر وہ چاہتے تھے کہ ہونا چاہیئے۔

شہر کے شاداب خیابانوں میں مستِ شباب گل رخوں کے جمگھٹوں کی بجائے اب ویرانی ہی ویرانی نظر آتی تھی۔ گلاب کی رنگینی، یاسمین کی بو اور سرو کی سربلندی میں کوئی جاذبیت نہ تھی۔ چاند موجود تھا پر بے نور۔ چشموں میں پانی تھا لیکن برودت سے معرا۔ حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں سرد پڑ گئی تھیں۔ موسیقی کے روح گداز نغموں کی مقناطیسیت اور چنگ و رباب کی سحر آفرینیاں باطل ہو چکی تھیں۔ جب دو پیکرِ محبت، جنہیں قسامِ ازل نے زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا تھا۔ حریر و اطلس کے زرنگار پردوں کی اوٹ میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تو انہیں ایک قسم کی بیگانگی سی محسوس ہونے لگتی۔ مخمل و دیبا سے منڈھی ہوئی کرسیاں جن کے نرم و نازک پہلو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوئے تھے، اب علیحدہ علیحدہ پڑی رہتی تھیں۔ اور دنیا کے نادر و نایاب جواہر سے مزین کمرے محبت و مودت کے افسانوں کی بجائے اب خشک گفتگو اور بے رس قہقہوں سے گونج رہے تھے۔ کیا محبت کے بغیر زندگی کا کوئی لطف ہے؟ یہ بدنصیب ملک جو پری کی نگاہِ خشمگین کے عتاب میں تھا اگر جنگ کے خوفناک شعلوں یا کسی متعدی وبا سے برباد ہو جاتا تو ہرگز اتنا غمگین، اتنا اداس اور اتنا ویران نہ ہوتا جتنا کہ ان پانچ سماوی الفاظ کے بھول جانے سے ہو رہا تھا

(۳)

اسی مملکت میں ایک شاعر رہتا تھا جس کی حالت بہ نسبت تمام دیگر افراد کے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنی محبوبہ کو مسروقہ الفاظ سنانے یا اُس کے دلفریب لبوں سے وہی الفاظ سننے کے لئے مضطرب و بیقرار تھا۔ اُس کی کوئی محبوبہ نہ تھی البتہ وہ موسیقی کی دیوی کا پرستار تھا۔ اُس کی تمام مصیبت کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک نظم کو اختتام تک پہنچانے سے معذور تھا جو اس نے بدطینت پری کے تکمیلِ انتقام سے ایک روز پیشتر شروع کی تھی لیکن اتفاق کی بات کہ اُس نظم کی ٹیپ انہیں الفاظ پہ ختم ہوتی تھی "مجھے تم سے محبت ہے" اور اس نظم کو کسی دوسرے طریقہ سے ختم کرنا ناممکنات سے تھا۔

شاعر نے کئی بار تیوری چڑھائی، پھر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا "کیا میں دیوانہ ہو گیا ہوں؟" اُسے کامل یقین تھا کہ اس بند کو شروع کرنے سے پیشتر وہ الفاظ اچھی طرح اُس کے حافظہ میں محفوظ تھے جنہیں وہ "ٹیپ" میں لانا چاہتا تھا۔ وہ ہر بار اپنے دماغ پر زور دیتا اور فضا کی تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش

کرتا تھا۔ وہ پہروں انہیں فراموش شدہ الفاظ کو سوچتا، بلند آواز سے انہیں پکارتا ——— وہ صرف انہیں الفاظ کو استعمال کرنا چاہتا تھا جن میں شہد کی حلاوت حسن کی لطافت اور موسیقی کا ترنم موجود تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس لابدی اور مہلک جملہ کو کہاں تلاش کرے۔ اُس کا دماغ اِس معمہ کو حل کرنے سے بکسر قاصر تھا ——— اپنی نظم کو بار بار گاتا اور نامکمل بند تک پہنچ کر خاموش ہو جاتا۔ اُس کے دل میں بے چینی اور بے کلی کی ٹیسیں اُٹھتیں۔ آہ! ناتمام نظم کا عذاب اور دکھ اُس پر سکراتِ موت کی سی حالت طاری کر دیتا تھا ——— اب وہ دیوانوں کی طرح جنگل کے کنارے شفاف اور مصفا پانی کے چشموں کو تکتا رہتا تھا جہاں پریاں حسبِ معمول ستاروں کی روشنی میں رقص کرنے آتی تھیں۔

(۴)

موسم بہار کی ایک سہانی صبح کو وہ ایک درخت کی پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیوں کی چھاؤں میں بیٹھا تھا کہ شریر پری نے اُسے دیکھا اور شاعر کی محبت اُس کے دل میں پیدا ہوگئی ——— پریاں اپنے دستور کے مطابق کسی رسم و رواج کی پابند نہیں ہوتیں ——— ایک تیتری کی سی عجلت کے ساتھ جب وہ گلاب کے پھول کو چومتی ہے، پری نے اپنے خوبصورت لبوں کو شاعر کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اُس وقت شاعر اپنے انہماک کے باوجود پری کے سانس کی خوشبو اور اُس کے نرم و نازک جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زمین کی گہرائیوں میں نیلم اور یاقوت اس طرح جگمگا رہے ہیں جس طرح شبِ دیجور کی سیاہی میں چرخِ چنبری پر ستارے چمکتے ہیں۔ دوسرے لمحہ میں پری اور شاعر سونے اور الماس کی رتھ میں سوار تھے جسے پردار سفید گھوڑوں نے آن واحد میں زمین سے کھینچ کر فضا کی بلندیوں پر اُڑنا شروع کر دیا۔ پھر وہ عرصہ دراز تک ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے رہے۔ اب اُنہیں اپنے لطیف تبسم اور شیریں بوسوں کے سوا کچھ یاد نہ تھا۔ اگر وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے منہ علیحدہ کر کے ایک دوسرے کی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھتے تو اُن کا مطلب اِس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ اتصالِ لب کے علاوہ محبت کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ کرنے کا یہ دوسرا طریق تھا۔ بہشتِ ارضی کی زہرہ جبین حوریں کاسنی ساٹن کے لباس میں ملبوس، ہاتھ میں ہاتھ دیئے اپنے وجد آور رقص سے اُنہیں محظوظ کرتیں۔ اور اُن کے ساحرانہ نغموں کی تانیں غائبانہ موسیقی کی آوازوں کے ساتھ مل کر اِن وابستگانِ محبت کے دلوں میں موجِ سرور بن کر اُتر جاتیں۔ ماتحت پریاں کو کناری مخمل کا لباس زیبِ تن کئے نیلی ٹوکریوں میں برف جیسے سفید پھل رکھ کر لاتیں جن کی خوشبو سفید گلاب اور کسی نیک دل پری کے طاہر دبا کر جسم سے بھی زیادہ دلآویز ہوتی۔ کبھی کبھار پری کو زیادہ خوش کرنے کے لئے شاعر اپنا بربط بجا کر ایسے خوبصورت اشعار گاتا جنہیں اُس کا بلند پرواز تخیل ایسے مواقع کے لئے غیر فانی الفاظ کے قالب میں منتقل کر سکتا تھا۔

اگرچہ وہ ایک پری تھی لیکن اُس کے کان ابھی تک ایک خوبصورت مرد کی روح کی گہرائیوں تک پہنچنے والے گیتوں سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جب شاعر گاتے گاتے خاموش ہو جاتا اور پری اُس کے تنفس کو اپنے کان کی لو سے چھو کر بالوں میں سے گزرتے ہوئے محسوس کرتی تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ آتشِ محبت میں گھُلی جا رہی ہے۔

اب اُن کی زندگی ایک سرمدی لطف و نشاط معلوم ہوتی تھی۔ بہت دن گزر گئے لیکن کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آیا جو اُن کی خوشی و مسرت میں خلل انداز ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی پری کسی وقت اُداس اور غمگین ہو جاتی۔ جب اُس کا شاعر اپنی شاعری و موسیقی کے معجزات اُس کے سامنے پیش کرتا تو وہ اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ کر بڑی محویت سے سنتی۔ پھر اپنے خیالات میں غرق ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔

"اے ملکہ" شاعر اسے مخاطب کر کے کہتا "کون سی چیز تمہیں ملول و مضمحل بنا دیتی ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔ دنیا کی ہر آسائش ہمیں میسر ہے اور پھر اس تمام سامانِ تعیش و تنعم کے ہوتے ہوئے تم کہ اتنی با اقبال اور اتنی خوبصورت ہو، کیوں اُداس رہتی ہو؟"

پہلے پہل تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب وہ مصر ہوا تو آہ بھر کر کہنے لگی "افسوس! جو دوسروں کو کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے بالآخر خود بھی اُسی مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پیارے شاعر میں اس لئے اُداس ہوں کہ تم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا "مجھے تم سے محبت ہے"۔

شاعر نے اِن الفاظ کو دہرانے کی بجائے خوشی کا ایک نعرہ لگایا کیونکہ اپنی غیر مکمل نظم کا اختتام اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ اب پری کا اُسے نیلم و یاقوت کی سرزمین اور سوسن و نرگس کے چمنستانوں میں روکنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل تھا۔ وہ شادان و فرحاں زمین پر واپس آ گیا جہاں اُس نے اپنی نظم مکمل کر کے شائع کر دی جس کی وساطت سے معتوب ملک کے مرد اور عورتوں نے اُن سماوی اور الہامی الفاظ کو دوبارہ حاصل کر لیا جو مدت ہوئی وہ اپنے دماغوں سے فراموش کر چکے تھے۔

شہر کے پُر بہار گلزاروں میں اب پھر پہلی سی رونق اور چہل پہل تھی زرتار پردوں کے پیچھے خشک گفتگو کی بجائے محبت سے لبریز نغمے گونجتے تھے اور یہ شاعری ہی کا فیضان ہے کہ دل محبت سے سرشار ہیں اور عشاق ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو شاعروں نے اپنے بے پناہ اشعار میں نہ گائی ہو۔

(ملخص)

محمد ضیاء الدین شمسی

کلامِ جگر

جی بہت چاہتا ہے رونے کو
ہے کوئی بات آج ہونے کو

آنکلنا نہ تم کہیں سے ادھر
کوئی بیٹھا ہے جان کھونے کو

کون ہوگا شریکِ شادی و غم
کوئی ہنسنے کو ہے نہ رونے کو

کٹ گئی ساری رات آنکھوں میں
ہم سے کیا پوچھتے ہو سونے کو

ہوچکی بازپرس بھی آخر
ہوگیا، جو رہا تھا ہونے کو

وہ بشر بھی عجب بشر ہے جگر
فرض سمجھے جو رونے دھونے کو

(۲)

عمر بھر تو درد و غم سہتے ہیں ہم
موت آتی ہے تو مر رہتے ہیں ہم

ناخدا کوئی نہ کوئی غمگسار
اِک سمندر میں پڑے بہتے ہیں ہم

پوچھتا ہے کون دردِ زندگی
کون سنتا ہے اگر کہتے ہیں ہم

سوچ لیتے ہیں مآلِ زندگی
شدّتِ غم میں بھی چپ رہتے ہیں ہم

سرگزشتِ مرگ اِسے ہمدم نہ جان
داستانِ زندگی کہتے ہیں ہم

راز اپنا بھی نہیں کھلتا جگر
کچھ نہیں معلوم کیا کہتے ہیں ہم

جگر - بریلوی

ابکارِ افکار

جب تک ہم جستجو نہ کریں ہم نہیں جان سکتے کہ ہماری ذات میں کیا کیا جوہر پنہاں ہیں۔
لوگ موتیوں کے لئے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں کیونکہ موتی ساحل پر نہیں ملتے۔
اُن پہاڑوں میں جو بظاہر بالکل بے برگ وگیاہ اور سنگلاخ ہوتے ہیں بعض اوقات قیمتی دھاتیں چھُپی ہوتی ہیں۔

جاؤ، اپنے دل کے ژرف وعمیق سمندر میں غوطہ لگاؤ۔
اے لوگو! اُس کی شور انگیز لہروں سے بہت نیچے، نیچے گہرائیوں میں جہاں سکوت اور سکون کا دور دورہ ہے
تمہیں نایاب جواہر اور بے بہا موتی ملیں گے۔

تفکر اور تدبر کی کان کو کھود دو
سونا تلاش کرنے والوں کی طرح استقلال پیدا کرو
اِنہیں چٹانوں اور سنگ ریزوں کے پیچھے تمہیں وہ دولت ملے گی جس سے تم مالا مال ہو جاؤ گے۔

ہر انسان کے دل میں کائنات کے بے پایاں سمندر کا عکس پڑتا رہتا ہے۔
اور گو دنیا اُن کی آب وتاب کو مٹا دیتی ہے مگر ڈھونڈنے سے دل کی گہرائیوں میں نور اور حسن کے موتی مل ہی جاتے ہیں۔

ایلا ویلر ولکاکس

زندگی کی مثال

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور اپنی کھڑکی کے باہر اوپر سے تلے تک اِن چیزوں کو علی الترتیب دیکھتا ہوں۔
بادل۔ پہاڑی۔ مکان۔ دیوار۔ سڑک۔ دریا۔

زندگی کوئی بادل نہیں ہے۔ کیونکہ بادل کی ہستی ہلکی دھند کے سوا کچھ نہیں۔
زندگی کوئی پہاڑی نہیں ہے۔ کیونکہ پہاڑ ہی دور ہی سے خوبصورت نظر آتی ہے۔ حالانکہ زندگی قریب اور عزیز ہے۔ اور دور و نزدیک سے اُس کا منظر یکساں طور پر دل کش ہے۔
زندگی کوئی مکان نہیں ہے۔ کیونکہ مکان کو استقلال ہے اور زندگی ایک ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ بہت سی زندگیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ مگر مکان وہیں کھڑا رہتا ہے۔
زندگی کوئی دیوار نہیں ہے کیونکہ دیوار ایک حد ہے۔ اور زندگی غیر محدود ہے۔ اُس کی کوئی حد نہیں۔
زندگی کوئی سڑک نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی میدانوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ اور وہاں جاتی ہے جہاں اور نہیں گئے۔ وہ ایک پرندے کی طرح جھاڑیوں میں اُڑتی پھرتی ہے۔ اور ایک ہرن کی طرح جنگل میں چوکڑیاں بھرتی ہے۔
زندگی ایک دریا ہے ہمیشہ ایک حالت میں رہتی ہے۔ مگر پھر بھی بدلتی ہے۔ گزرتی ہے مگر پھر بھی موجود رہتی ہے۔ سیال ہے مگر پھر بھی دیواروں اور مکانوں سے زیادہ دیر باقی رہنے والی ہے۔ بہتی ہے مگر پھر بھی رہتی ہے۔ رفتنی ہے مگر پھر بھی اِس میں ایک ابدیت ہے۔
"دریائے زندگی" بہت عمدہ مثال ہے۔ یہ دریا ہی ہے جس کو فطرت نے ناپائیداری بھی دی ہے اور استقلال بھی۔

فرینک کرین

وہ سو رہی ہے

واٹرلو کی جنگ سے چند سال قبل ہمپ سٹیڈ میں ایک نوجوان خاتون اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہی تھی۔ یہ اینا لٹیشیا بابالڈ تھی۔ اور جو کچھ اُس نے لکھا وہ یہ ہے:۔

میں جانتی نہیں ہوں اے زندگی تو کیا ہے — لیکن یہ جانتی ہوں وہ دن بھی آرہا ہے
تجھ سے مجھے جدا جب ہونا پڑے گا آخر — تیرے فراق میں دل کھونا پڑے گا آخر
کب اور کس طرح ہم اے میری جاں ملے تھے — اک راز ہے یہ اب تک ہم تم کہاں مِلے تھے
اے زندگی مگر یوں دنیا میں ہم رہے ہیں — یک جان اور دو قالب ہو کر بہم رہے ہیں
دنیا کے رنج اٹھائے اور راحتیں بھی دیکھیں — آرام بھی اُٹھائے اور کلفتیں بھی جھیلیں
تیری رفاقتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں — تیری محبتیں جب آتی ہیں یاد اے جاں

اُس دم تری جدائی ہوتی ہے شاق مجھ کو ۔۔۔ بے شک رُلائے گا خوں تیرا فراق مجھ کو

صدمہ نہ یہ کبھی میں لے جاں اٹھا سکوں گی ۔۔۔ ڈھارس نہ اپنے دل کی ہرگز بندھا سکوں گی

لیکن نہ بھول جانا اک آرزو مری تم ۔۔۔ یہ بات یاد رکھنا اے میری زندگی تم

ہو کوچ جب تمہارا دنیائے جاوداں کو

چُپکے سے چھوڑ جانا اِس جسمِ ناتواں کو

واٹرلو کی جنگ کے چند سال بعد مسز بار بالڈ پھر اپنے کمرے میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہی تھی اور جو کچھ اُس نے لکھا وہ یہ ہے :-

"تم کون ہو؟"

"کیا تم مجھے نہیں جانتیں؟ کیا تم میری منتظر نہ تھیں"؟

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"میرے ساتھ آؤ نہیں خود معلوم ہو جائے گا۔"

"راستہ تاریک ہے!"

"ہاں مگر اس پر بہت لوگ چل چکے ہیں۔"

یہاں وہ ٹھہر گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ اُس تاریک راستے پر پڑلی تھی جس سے تمام بنی نوعِ انسان کو گزرنا ہے۔

منصور احمد

محبّت

نیکی میں سچا حُسن اور سچی محبت دونوں بیک وقت جلوہ پاش ہوتے ہیں۔

میرا دل زندگی میں دنیا بھر کی مخالفت کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن محبت میں تیری بے اعتنائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔

لطیف

تجلّیات

تاروں میں حُسن ہے نہ ہے خورشید و ماہ میں
کچھ ہے اگر تو دیکھنے والی نگاہ میں

منزل کی آرزو میں نہ ہے اضطرابِ شوق
منزل کو دیکھتا ہوں ہر اک سنگِ راہ میں

کچھ سوجھتا نہیں ہے وفورِ جمال سے
بجلی سی کوندتی ہے تری جلوہ گاہ میں

بزمِ خیال میں کوئی جلوہ فروز ہے
عالم سحر کا ہے مری شامِ سیاہ میں

کس کی ضیائے حُسن سے روشن ہے کائنات
کس کی ضیائے حسن ہے خورشید و ماہ میں

یادِ گناہ و اشکِ ندامت میں لطف ہے،
ورنہ نہیں ہے خاک بھی لذت گناہ میں

للہ سہل کر مری دشواریِ حیات
اے آرزوئے مرگ ہوں تیری پناہ میں

بزمِ شراب تک جو رسائی نہ ہو سکی
خاموش ہو کے بیٹھ رہے خانقاہ میں

دنیا کے خیر و شر پہ نظر ڈالتا ہوں میں
راتوں کو چھپ کے منزلِ پُر نورِ ماہ میں

یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات
گذری تمام عمر اسی اشتباہ میں

میں بھی حریفِ برقِ تجلائے طور ہوں
دل میں مرے وہی ہے جو تیری نگاہ میں

اِس جبر پر بھی ہے اُسے احساسِ اختیار
اک انفعال سا ہے دلِ عذر خواہ میں

زندہ دلی کے ساتھ مٹا زندگی کا لطف
لذّت ثواب میں نہ مزا ہے گناہ میں

جس آہ میں اثر ہی نہیں ہے وہ آہ کیا
وہ آہ کیا اثر ہی نہیں ہے جس آہ میں

اکبرؔ کو ایسے منزلِ مقصود مل چکی
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے کمبخت راہ میں

جلال الدین اکبرؔ

خیالاتِ زرّیں

بادل اور لہریں

اے ماں! لوگ جو اوپر بادلوں میں رہتے ہیں مجھے پکارتے ہیں۔ کہ

"ہم صبح جاگنے کے وقت سے دن کے ختم ہونے تک برابر کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم سنہری صبح سے، ہم روپہلی چاندنی سے کھیلا کرتے ہیں!

میں پوچھتا ہوں "لیکن میں تم تک اوپر کیسے پہنچوں"؟

وہ جواب دیتے ہیں" زمین کے کنارے پر آجاؤ۔ پھر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بڑھاؤ تو تم اوپر بادلوں میں اٹھا لئے جاؤ گے۔

میں کہتا ہوں "میری ماں میرے لئے گھر پر میری راہ تک رہی ہے۔ میں کیونکر اُسے چھوڑ کر آجاؤں؟

اس پر وہ مسکراتے ہیں اور تیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ لیکن اے ماں! میں اس سے بھی ایک زیادہ مزیدار کھیل جانتا ہوں۔ میں بادل بنوں گا اور تم چاند۔ میں دونوں ہاتھوں سے تم کو ڈھانپ لوں گا اور ہمارا کوٹھا ہمارا نیلا آسمان ہوگا۔

لوگ جو لہروں کے درمیان رہتے ہیں مجھے پکارتے ہیں کہ ہم صبح سے رات ہونے تک گانا گاتے ہیں ہم برابر چلے جاتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں۔

میں پوچھتا ہوں۔ "لیکن میں کیسے تم میں آملوں؟" وہ مجھے بتاتے ہیں کہ سمندر کے کنارے آجاؤ اور اپنی آنکھیں خوب بند کرلو تو تم خودبخود لہروں پر اٹھا لئے جاؤ گے۔

میں کہتا ہوں میری ماں یہ چاہتی ہے کہ میں شام کو گھر پر رہوں میں کیسے اُسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں"؟ پھر وہ مسکراتے ہیں اور ناچتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن میں اس سے ایک زیادہ مزیدار کھیل جانتا ہوں میں لہریں بن جاؤنگا اور تم ایک اجنبی کنارہ ہوجانا۔ میں بہے جاؤں گا بہے جاؤں گا۔ اور یونہی ہنستے ہوئے ہنسی کے ساتھ اپنے تئیں زور سے تمہاری گود ہی میں ڈال دوں گا۔

اور دنیا میں کوئی شخص بھی نہ جاننے پائے گا کہ ہم دونوں کہاں ہیں؟

سوداگر

اے ماں تو سمجھ لے کہ تجھے گھر پر رہنا ہے اور مجھے پردیس میں دور دور سفر کرنا ہے ۔ یہ خیال کر کہ میری کشتی گھاٹ پر لدی ہوئی تیار کھڑی ہے ۔ اب اچھی طرح سوچ لے اے ماں اور پھر بتا کہ جب میں وطن کو لوٹوں تو تیرے لئے کیا کچھ لاؤں

اے ماں کیا تو سونے کے ڈھیروں کے ڈھیر لینا چاہتی ہے ! وہاں سنہری ندیوں کے کنارے کھینیاں سنہری فصلوں سے بھری پڑی ہیں ۔ اور جنگل کی سایہ دار راہ میں چمپا کے سنہری پھول زمین پر بچھے پڑے ہیں ۔ میں اُن سب کو تیرے لئے سینکڑوں ٹوکریوں میں جمع کر لوں گا ۔

اے ماں ! کیا تو بڑے بڑے موتی لینا چاہتی ہے خزاں کی بوندوں کی طرح بڑے بڑے ؟ میں سمندر پار ہو کر موتیوں کے جزیرے کے کنارے پہنچ جاؤں گا ۔

وہاں نور کے تڑکے ہلکے ہلکے موتی چراگاہ کے پھولوں پر کانپ رہے ہوتے ہیں ۔ موتی گھاس پر گرتے ہیں اور موتی ہی سمندر کی آوارہ لہروں کے قریب ریت پر بکھرے ہوتے ہیں ۔

میرے بھائی کو گھوڑوں کی ایک جوڑی ملے گی جو پروں کے زور سے بادلوں میں اُڑی چلی جائے گی ۔

ابا جان کے لئے میں ایک جادو کا قلم لاؤں گا جو بغیر اُن کے جانے خود بخود لکھتا رہے گا ۔

تمہارے لئے اے ماں میں ضرور وہ صندوقچی اور ہیرا لاؤں گا جس کے لئے سات بادشاہوں نے اپنی سلطنت کھو دی !

تصنیف کا فن

تم کہتی ہو کہ ابا جان بہت سی کتابیں لکھتے ہیں لیکن جو وہ لکھتے ہیں میں نہیں سمجھتا ۔

وہ کل ساری شام تم کو پڑھ کر سناتے رہے ۔ لیکن کیا تم کو واقعی سمجھ میں آیا جو انہوں نے سنایا ؟ کتنی پیاری کہانیاں اے ماں تم ہم کو سنا سکتی ہو ! مجھے حیرت ہے کہ ابا جان ایسا کیوں نہیں لکھ سکتے ۔ کیا انہوں نے اپنی ماں سے کبھی دیووں اور پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں نہ سنی تھیں ؟ کیا وہ اُن سب کو بھول چکے ہیں ؟

کئی بار جب وہ غسل کرنے میں دیر کر دیتے ہیں تو تم سو سو دفعہ جا کر انہیں بلاتی ہو تم انتظار کرتی ہو اور کھانا اُن کے لئے گرم رکھتی ہو لیکن وہ لکھے جاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں ۔

ابا جان ہمیشہ کتابیں بنانے کا کھیل کھیلتے رہتے ہیں ۔

اگر کبھی میں ابا جان کے کمرے میں کھیلنے کو جاتا ہوں تو تم آکر مجھے بلا لیتی ہو کہ "تم کیسے شریر بچے ہو!" اگر میں ذرا سا شور بھی مچاتا ہوں تو تم کہتی ہو "کیا تم نہیں دیکھتے کہ ابا جان اپنا کام کر رہے ہیں؟" بھلا ہمیشہ یونہی لکھنے اور لکھتے رہنے میں کیا مزا ہے؟ جب میں ابا جان کا قلم یا پنسل اٹھا کر انہیں کی طرح اُن کی کتاب پر ا ب ت ج چ ح خ لکھتا ہوں تو اے ماں! تم مجھ سے ناراض کیوں ہو جاتی ہو؟ تم ایک بات بھی نہیں کہتیں جب ابا جان لکھتے ہیں۔ جب میرے ابا جان کاغذ کے کاغذ سیاہ کر دیتے ہیں تو اے ماں! تم کو ذرا بھی بُرا نہیں لگتا لیکن اگر میں کاغذ کا ایک ورق لے کر بھی ایک ناؤ بنانے لگوں تو تم کہتی ہو کہ "بچے! تم کس قدر ستاتے ہو!"

ابا جان کے کاغذ کے دونوں طرف کالے کالے نشان لگا کر دستے کے دستے برباد کر دینے کو تم کیا سمجھتی ہو؟

میرے بچے

جب میں تجھے رنگین کھلونے لا کر دیتی ہوں میرے بچے! تو میں جان لیتی ہوں کہ بادلوں میں اور پانیوں پر ایسی رنگ آمیزیاں کیوں ہیں اور پھول یوں رنگا رنگ کس لئے ہیں۔ جب میں تجھے رنگین کھلونے دیتی ہوں میرے بچے!

جب میں گاتی ہوں تا کہ تو ناچے کودے تو میں ٹھیک جان لیتی ہوں کہ پتیوں میں موسیقی کیوں ہے اور موجیں کس لئے گوش بر آواز زمین کے دل کو اپنی ہم آہنگ آوازوں سے بلاتی ہیں۔ جب میں گاتی ہوں کہ تو ناچے کودے!

جب میں تیرے حریص ہاتھوں کی طرف میٹھی چیزیں لاتی ہوں تو میں جان لیتی ہوں کہ پھول کے پیالے میں شہد کیوں ہے اور پھل اندر ہی اندر شیریں رس سے کس لئے بھرا رہتا ہے۔ جب میں میٹھی چیزیں تیرے حریص ہاتھوں کی طرف لاتی ہوں!

جب میں تیرا منہ چومتی ہوں تا کہ تو مسکرائے میرے پیارے! تو میں ٹھیک جان لیتی ہوں کہ وہ خوشی جو آسمان سے صبح کی روشنی بن کر بہ نکلتی ہے کیا ہے اور وہ مسرت کیا ہے جو نسیم بہار میرے روح و رواں کے لئے اپنے ہمراہ لاتی ہے جب میں تجھے چومتی ہوں کہ تو مسکرائے!

گلچیں

سوز و ساز

پروانہ کر کے ہمّتِ مردانہ جل گیا | دل دیکھ کر یہ جرأتِ پروانہ جل گیا
دیکھا چراغِ خانۂ آزر نے کیا کیا؟ | بھڑکی وہ آگ اُس سے کہ بتخانہ جل گیا
جلتا ہے کس لئے دلِ بے مدّعا مرا | وحشت ہے بسکہ کوبکہ ویرانہ جل گیا
جلنے میں لخت لخت کو سبقت کا شوق تھا | اِس دل کا ذرّہ ذرّہ حریفانہ جل گیا
اے برقِ حسن اب بھی وہی بے قرار یاں؟ | بس، اب وہ دل وہ عشق کا کاشانہ جل گیا
ممکن نہیں کہ بھول سکوں یہ حکایتیں | دفتر ہی گر مرے غمِ دل کا نہ جل گیا
ہر لختِ دل میں آتشِ غم ہے شرارہ بار | ہو کر ورق ورق مرا افسانہ جل گیا

آخر کھلا کہ سوز سے ناآشنا تھی شمع
اپنے ہی دل کی آگ سے پروانہ جل گیا

حامد علی خاں

جادوئے بنگالہ

ٹیگور کا سحرِ حلال

تارک الدنیا

دنیا کو ترک کرنے کا خیال اُس کے دل میں مدت سے بس رہا تھا۔

آدھی رات کو اُٹھ کر اُس نے کہا "اب وقت ہے کہ میں گھر بار سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لوں اور خدا کی تلاش میں نکل جاؤں۔ میں نے اپنی عمر بے کار کھو دی، آہ کس نے اب تک مجھے میرے اِس ارادے سے باز رکھا؟"

جواب میں خدا کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی "میں نے" لیکن اُس نے یہ آواز نہ سنی۔

سامنے پلنگ پر اُس کی بی بی اُس کے بچے کو چھاتی سے لگائے اطمینان کی گہری نیند میں بے خبر سو رہی تھی۔

تارک الدنیا نے کہا "تم ہو کون جنہوں نے اب تک مجھے احمق بنائے رکھا؟"

آواز آئی "خدا" لیکن اُس نے یہ آواز نہ سنی۔

بچہ خواب میں چلّایا اور اپنی ماں کی چھاتی کے ساتھ چمٹ گیا۔

خدا کا حکم تھا "نادان ٹھہر، اپنے اِس خیال سے درگزر" لیکن اب بھی اُس کے کان سماعت سے محروم رہے۔

خدا کی آواز تاسف میں دب گئی ——— "آہ میرا بندہ مجھ سے روگرداں ہو کر میری تلاش میں کیوں بھٹکتا پھرتا ہے؟"

میرا دل لرز جاتا ہے

تیری ایک نگاہ، اے حسین عورت! شاعروں کے ساز کے نغموں کی تمام دولت کو سمیٹ سکتی تھی۔

لیکن اُن سے تعریفیں سننے کا شوق تجھے نہیں، اِس لئے میں تیری تعریف کرتا ہوں۔

دنیا کے مغرور سے مغرور سر کو تو اپنے قدموں پر رکھوا سکتی تھی۔

لیکن جو تجھے محبوب ہیں ــــــ دولت و شہرت سے محروم ــــــ اُن کی پرستش کرنے کو تو اس پر ترجیح دیتی ہے، اِس لئے میں تیری پرستش کرتا ہوں۔

تیرے خوبصورت ہاتھوں کا مس شاہانہ ساز و سامان کی زینت کا باعث ہوسکتا تھا

لیکن اِن ہاتھوں سے تو اپنے گھر کو صاف کرنے کے لئے جھاڑو دینے کا کام لیتی ہے۔ اس لئے میرا دل لرز جاتا ہے۔

گداگر

"جو تم اپنی خوشی سے دو مجھے قبول ہے، میں اور کچھ نہیں مانگتا"

"ہاں، ہاں، اے سیرچشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

"کوئی گرا پڑا پھول ہو تو میں اُسے اپنے دل میں بساؤں گا"

"لیکن اگر کانٹے ہوں تو؟"

"میں برداشت کروں گا"

"ہاں، ہاں، اے سیرچشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو۔ تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

"اگر صرف ایک دفعہ تم اپنی محبت بھری نگاہیں اُٹھا کر میرے چہرے پر ڈال دو تو میری روح قیامت تک اِس شیریں لمحے کی یاد میں سرشار رہے گی"

"لیکن اگر صرف قہر آلود نگاہیں ہوں تو؟"

"میں اُنہیں اپنے دل میں پیوستا رہوں گا"

"ہاں، ہاں، اے سیرچشم گداگر! تمہیں کون نہیں جانتا؟ جو کچھ کسی کے پاس ہو تم وہ سب کا سب مانگتے ہو"

حامد علی خاں

ہے۔ فتح میری نہیں ہوئی بہادری پر کوئی فتح پا ہی نہیں سکتا،

"سرسوتی"

ءَ اَنتَ رَبّیِ

کیا تو میرا خدا ہے (قرآن مجید)

میں نے زمین سے پوچھا "کیا تو خدا ہے؟" زمیں نے جواب دیا "نہیں"

میں نے سمندر اور اُس کی گہرائیوں سے پوچھا۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم خدا نہیں ہیں جس کی تو تلاش کر رہا ہے۔"

میں نے ہوا کے جھونکوں اور تاروں بھرے آسمان سے پوچھا۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ "تو غلطی پر ہے۔"

میں نے چاند سورج اور ستاروں سے پوچھا مگر سب نے نفی میں جواب دیا۔

پھر میں نے اپنے جسم کے اعضا سے پوچھا "کیا تم مجھے خدا کی راہ بتا سکتے ہو؟" وہ یک لخت چیخ اُٹھے کہ اُسی نے تو ہمیں بنایا ہے۔"

آخر کار میرے دل نے گواہی دی "تیرا خدا اور تیری روح کا مالک تجھی میں تو ہے۔"

اگسٹائن

"نظام کالج میگزین"

شمسی اور قمری سال

سنہ و سال کے حساب کے بغیر دنیا میں کسی متمدن قوم کا کام نہیں چل سکتا۔ انسان کا فطری سال شمسی ہے اور فطری مہینہ قمری ہے۔ قمری مہینوں کے فطری ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مہینے کے لئے شاید دنیا کی ہر زبان کا لفظ چاند کے نام سے مشتق ہے۔ عربی میں مہینہ کو شہر کہتے ہیں۔ کلدانی میں سہر چاند کا نام تھا۔ فارسی کا ماہ۔ ہندی کے ماس اور چاند دونوں کا مرادف ہے۔ انگریزی کا منتھ صاف صاف مُون کا فرزند ہے۔ اِس سے بھی واضح دلیل یہ ہے کہ مہینوں کے ایام ساری دنیا میں ہفتوں پر منقسم ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ چاند کی حالتوں میں ہفتہ وار نمایاں امتیاز ہوتا رہتا ہے۔

فطری سال کے شمسی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ "سال" کے ناموں کو ہر زبان میں نہیں تو کم از کم عرب اور ہندوستان کی بولی میں بارش سے خاص تعلق ہے۔ ہندی کا برش اس کی برشا کال سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ عربی کا عام (برس)، اگرچہ بارش کے معنے نہیں دیتا مگر عوم (تیرنا) کو پانی سے خاص تعلق ہے۔ یہود کا پہلا مہینہ نیسان ہے اس کا قدیم نام ابیب

تھا، (ع ر ب ب) کو سامی زبانوں میں پانی سے خاص ربط ہے چنانچہ اباب پانی ہی کو کہتے ہیں۔ ابرنیساں ہماری فارسی زبان میں بہت مشہور ہے۔ سال کے بارہ مہینے فرض کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ دونوں برساتوں کے درمیان عموماً بارہ ہی مہینے گزرا کرتے ہیں۔

"معارف"

شعر کی وجہ تسمیہ

کلامِ موزوں کو شعر کہنے کی وجہ ابو عبداللہ قاسم بن سلام بغدادی امام لغت ونحو وتاریخ حسب ذیل بیان کرتے ہیں:-

یعرب بن قحطان بن عابد بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی عمر چار سو سال کی تھی، یعرب کہے جانے کی وجہ یہ تھی کہ طوفانِ نوح کے بعد زبانِ عربی اُن کی ذات سے منتشر اور شائع ہوئی، اسا جع عرب کے اندر اثنائے کلام میں موزوں مصرعے خود بخود چسپت ہو جاتے ہیں۔ یعرب نے اُس کو اپنی طباعی اور فطانت سے دریافت کیا۔ اور موزوں غیر موزوں میں فرق پیدا کر کے یہ دو شعر کہے۔

ما الخلق الا لاب و ام   حذین جھل او حذین علم

مابین خلق رائم وحلم   فی مرج طوراً و طوراً ھم

ایک مجمع میں جب اکابرین قوم جمع تھے تو یعرب نے یہ دونوں شعر پڑھے۔ چونکہ اُن لوگوں نے کبھی کلامِ موزوں سنا نہ تھا، کہنے لگے ماھذا التزتیل الذی کنا شعرنابك نقوله یعنی یہ کس قسم کی ترکیبِ کلام ہے کہ ہم نے تمہاری زبان سے پہلے نہیں سُنی۔ یعرب نے جواب دیا

وانا ایضاً ماشعرت بہ من نفسی قبل یومی ھذا میں نے بھی اِس سے پہلے کبھی ایسا کلام نہیں کہا

چونکہ یعرب نے بغیر تعلیم و تعلم کے کلام موزوں محسوس کر لیا اس لئے اس کا نام شعر ہوا۔ ایسے کلام کے مصنف کا نام شاعر رکھا گیا اور کلام کا نام شعر۔

"نگار"

تبصرہ

جمالِ ہمنشیں - خاتونِ اکرم صاحبہ مرحومہ کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مرحومہ کی ادبی قابلیت نسوانی دنیا میں مسلّمہ ہے۔ گو اُنھوں نے آغازِ شباب ہی میں انتقال کیا لیکن اُن کے خیالات میں پختگی اپنی پوری شان سے جھلک رہی ہے۔ اُن کے مضامین متانت اور سنجیدگی کی جان ہیں۔ اُن کے اندازِ تحریر میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فلسفۂ زندگی کو اِس خوبی سے حاصل کیا ہے کہ بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ فانی زندگی - تغیراتِ زندگی - نیرنگیٔ زمانہ وغیرہ مضامین نہایت عمدہ ہیں مسلمان لڑکیوں کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔ اور اِن سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ کتاب کی ظاہری شکل وصورت بھی نہایت لغریب ہے، اعلیٰ درجہ کے آرٹ کاغذ پر چھپی ہوئی ہے حجم ۸۸ صفحات اور قیمت بارہ آنے ہے۔ دفترِ عصمت دہلی سے ملتی ہے۔

دشینت اور شکنتلا - یا مثنوی سحر - ملک کے مشہور ہندو ادیب جناب اقبال ورما صاحب سحرؔ ہتگامی کی دلکش تصنیف ہے شکنتلا کا افسانہ کالیداس کی شاعری کا شاہ کار ہے۔ اِس سے پہلے بھی بعض شعرا نے شکنتلا کے اردو تراجم نظم میں کئے ہیں مگر انھوں نے کالیداس کی خصوصیات کو نظر انداز کر کے اُسی روش کو اختیار کیا ہے جو قدیم شعرا نے مثنوی کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اِسی لئے اُن سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ قصہ سنسکرت سے ماخوذ ہے، بلکہ ہند و تخیل اور معاشرت کو چھوڑ کر اُسے بالکل ایک ایرانی رنگ دے دیا ہے۔ اس کے برخلاف حضرتِ سحرؔ کے مرد و زن - گل بوٹے - چرند پرند - اداب و اخلاق - رسم و تمدن سب ہندوستان کے ہیں۔ اور اُن کی اصلیت اور دلفریبی میں مطلق فرق نہیں آیا۔ امید ہے کہ ہمارے ناظرین اِس محنت کی داد دیں گے۔ قیمت آٹھ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ :- زمانہ بک ایجنسی کانپور

معارف النغمات اس بیش بہا دلچسپ کتاب میں نغمات ہند کے عملی علمی اصول مفصل طور پر بیان کئے ہیں۔ یہ اردو میں اپنی نوع کی پہلی جامع کتاب ہے۔ شروع میں ہندوستانی موسیقی کی مختصر تاریخ ہے۔ اُس کے بعد زمانۂ حال کی طرزِ موسیقی پر روشنی ڈالی ہے اور قدیمی موسیقی سے اُس کا موازنہ کیا ہے۔ حصۂ اوّل سُر ادھیائے میں موسیقی سے بحث کی ہے۔ اور حصہ دوم راگ ادھیائے میں راگوں اور راگنیوں کو ایسی وضاحت سے الگ الگ قلمبند کر دیا ہے کہ تھوڑی سی رہنمائی سے باجے یا ستار پر اُنہیں بجایا جا سکتا ہے۔ دوسری جلد میں ہندوستان کے مشہور ماہرینِ موسیقی کی یادگار چیزیں جمع کی گئی ہیں۔ راجہ محمد نواب علی خاں صاحب تعلقدار اکبر پور ضلع سیتا پور نے اس کتاب کی تالیف سے اردو زبان اور موسیقی کی ایک بھاری خدمت ادا کی ہے۔ جو اُنہیں کا کام تھا

قیمت پانچ روپے فی جلد جناب مصنف سے ذیل کے پتے سے طلب فرمائیں "کورٹ ویکیل متصل قیصر باغ لکھنؤ"

تصاویر

۱۔حضرت ہمایوں مرحوم کی جو تصویر اس دفعہ رسالے کے صفحات کو زینت دی رہی ہے اُن کی بلند پایہ سیرت کی آئینہ دار ہے۔ اِس میں اُن کی اولوالعزمی اُن کی ہمت اُن کی شرافت اور اُن کے اخلاق صاف صاف نظر آ رہے ہیں۔

۲۔علامۂ اقبال نے کمال مہربانی سے ہمیں اپنی یہ تصویر خاص طور پر مرحمت فرمائی ہے یہ تصویر اُن کے فلسفیانہ انہماک کو خوب ظاہر کرتی ہے۔

۳۔حسنِ معصوم۔مشہور جرمن مصور ہربرٹ شمالز کا ایک شاہ کار ہے جو اس وقت نارتھلرٹن میں لارنس جرنر صاحب کے قبضہ میں ہے ہمیں یہ تصویر میاں عبدالرحمٰن صاحب اعجاز ساندوی سے ملی ہے جن کے پاس یہ ایک نایاب کتاب میں موجود تھی۔تصویر کی آنکھوں سے عفت و عصمت جھانک رہی ہے۔

۴۔وادیٔ کشمیر کی ایک ندی کے لئے ہم میاں محمد اسلم صاحب سب جج کے مرہونِ منت ہیں۔ وادیٔ سندھ (کشمیر) میں گاندربل ایک نہایت پُر فضا مقام ہے یہ تصویر گاندربل کے نالے کو ظاہر کر رہی ہے جس کا سرود ہر وقت فردوسِ گوش رہتا ہے۔

۵۔نغمۂ ساز ہماری نظم خاتونِ نغمہ ساز کی پوری پوری تصویر ہے۔

۶۔محبوبۂ یروشلم۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی غزل الغزلات کی محبوبہ کا معزلی تصور ہے یہ لاجواب تصویر ڈی جی روزیٹی کی حسن کاری کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔جو ۱۸۶۵ء میں مسٹر جارج رائے کے لئے تیار کی گئی۔تصویر غزل الغزلات کے اِس فقرہ کی تفسیر ہے:"میں اپنے محبوب کی ہوں اور وہ میرا ہے"

۷۔ننھا ادیب۔یہ ایک مشہور یورپی مصوّر کی کامیاب مصوری کا قابلِ دید نمونہ ہے جس میں اُس ننے ننھے سے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کو حیرت انگیز طور پر نمایاں کیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بچّے کے دماغ میں غیب سے مضامین آرہے ہیں۔

سرورق،سالگرہ نمبر کے سرورق کے لئے بھی ہم میاں عبدالرحمٰن صاحب اعجاز ساندوی کے بیحد شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں ایک ایسا نقشہ تیار کر کے دیا جو سادہ بھی ہے اور پُرکار بھی۔اسی ضمن میں ہمیں جناب میاں محمد رفیق صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس کے اہتمامِ طباعت میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔اور اپنے قیمتی وقت کا معتدبہ حصہ اِس کے لئے وقف کیا

فہرستِ مضامین

نمبر ۲ | بابت ماہِ فروری ۱۹۲۸ء | جلد ۱۳

تصویر:۔ قدیم مشرقی مصوری کا ایک نادر نمونہ

جہاں نما

دنیا کی سب سے بڑی کتاب

انسان کے معمولی قد سے بھی بڑی یہ ایک اٹلس ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طول اور عرض کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ اٹلس امسٹرڈم کے تاجروں کی طرف سے چارلس دوم شاہِ انگلستان کو بطورِ تحفہ دی گئی تھی اور آج کل لنڈن کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ نقشوں پر عبارت لاطینی حروف میں لکھی گئی ہے اور نقشوں کی پیمایش اُس زمانے کے لحاظ سے تعجب انگیز طور پر صحیح ہے۔ یہ تحفہ چارلس کو اُس وقت ملا تھا جب برطانیہ کی شخصی حکومت کو زوال ہُوا اور نِدرلینڈز میں اُسے دوستانہ پناہ ملی +

جاپانی رسم الخط کی تبدیلی

جاپانی زبان کے رسم الخط میں ایک مکمل انقلاب کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ قدیم طرزِ تحریر تعلیم کے لئے سدِ راہ سمجھا گیا ہے۔ جامعۂ ٹوکیو کے استادِ علم اللغات نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ملکی رسم الخط میں بچے چھ سال کی عمر سے پہلے لکھ پڑھ نہیں سکتے حالانکہ لاطینی حروف کو وہ چار برس کی عمر سے بھی پہلے بڑی آسانی سے پہچاننے لگ جاتے ہیں وزارتِ تعلیم نے ایک مجلس اِس امر پر غور کرنے کے لئے قایم کی ہے جو تحقیقات کے بعد جاپانی حروف کی بجائے لاطینی حروف کو قبول کرنے کے متعلق اپنا فیصلہ سنائے گی۔ اگر جاپانی حروفِ ابجد کی خصوصیات اور مشکلات کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ لاطینی حروف کے استعمال سے ترقیِ تعلیم میں ایک انقلاب رونما ہو جائے گا +

بے اندازہ دولت

کچھ دن ہوئے حکومت ترکی نے سٹاک ہالم کے ایک جوہری مسٹر جین جانسن کو دولتِ عثمانیہ کے خزانوں کی قیمت کا تخمینہ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ مسٹر جانسن کا بیان ہے کہ میں سابق سلطان کے روایتی خزانوں کو دیکھ کر حیران دششدر رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے جواہرات کا ایسا نادر و نایاب مجموعہ کبھی نہیں دیکھا۔ نیلم۔ یاقوت، ہیرے اور موتیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بعض ہیرے غیر معمولی طور پر سُرخ اور نیلے رنگ کے ہیں۔ ایک

خنجر ہے جس کا سارا دستہ نیلم کے صرف ایک ٹکڑے سے تراشا گیا ہے ۔

بعض موتی حیرت انگیز طور پر بڑے ہیں، خصوصاً وہ جو سلطان کی ایک عجیب و غریب قسم کی دستار پر لگے ہوئے ہیں۔ قیمتی اشیاء کے اس حیرت انگیز مجموعہ میں سب سے بے بہا سونے کی وہ کرسی ہے جسے بیس ہزار موتیوں اور یاقوت و نیلم کے کئی ہزار ٹکڑوں سے مزین کیا گیا ہے۔ دنیائے مشرق کا یہ بے مثال خزانہ جس کے متعلق سینکڑوں افسانے مشہور ہیں قسطنطنیہ کے شاہی حرم میں محفوظ ہے۔ اور اگر کوئی اس کو دیکھنا چاہے تو اُسے متعدد دروازوں میں سے گزرنا پڑتا ہے جن کی پاسبانی مسلح سپاہی کرتے ہیں۔ آخری دروازہ کانسی کا بنا ہوا ہے اور اس قدر بوجھل ہے کہ اِس کے کھولنے کے لئے تقریباً آٹھ آدمیوں کی طاقت درکار ہے ۔

ایک قابل ذکر ہندوستانی فلم

ہندوستان کی تہذیب، تاریخ اور افسانوں کو سینما کے ذریعہ سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے آج تک جتنی کوششیں بروئے کار لائی گئی ہیں اُن سب سے بڑھ چڑھ کر ایک اور کوشش آج کل زیر غور ہے جو غایت درجہ دلچسپ ہے یہ فلم ہندوستان میں تیار کی جائے گی جس کا قصہ ایک ہندوستانی تصنیف ہوگا اور تمام ایکٹر بھی ہندوستانی ہوں گے صرف اُس کے تیار کرنے میں اہتمام ایک انگریز مسٹر بروس ولف کا ہوگا جو نگرانی کے لئے ہندوستان آرہے ہیں ۔

افسانہ جس کا نام "شیراز" ہے، مسٹر نرنجن پال کی تصنیف ہے ایکٹروں میں مشہور ہندوستانی ایکٹر مسٹر ہمنسو رائے اور دوسرے وہ تمام ایکٹر ہوں گے جنہوں نے "نورِ ایشیا" کے خوبصورت اور عظیم الشان فلم میں حصہ لیا تھا۔ "شیراز" وہ شخص ہے جس نے باوجود بصارت سے محروم ہونے کے "تاج محل" کا خاکہ تیار کیا۔ دوسری قابلِ ذکر نقلیں شہنشاہ شاہجہان اور اُس کی بیگم ممتاز محل کی ہوں گی ۔

جرمنی کی یو۔ ایف۔ اے کمپنی اس فلم کو یورپ، مصر، فلسطین اور شام میں تقسیم کرے گی اور برٹش انسٹرکشنل فلمز تمام مقبوضاتِ برطانیہ میں پھیلائینگی۔ اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ یہ فلم امریکا کے سوائے ہر جگہ پیش ہوسکے گی ۔

گھڑیوں کے ڈائل

گھڑیاں بنانے والوں میں مشہور ہے کہ جیسی گھڑیاں آج کل رائج ہیں اس قسم کی پہلی گھڑی ہنری ڈِ وکنے

۱۳۷۰ء میں شاہ فرانس چارلس پنجم کے لئے بنائی تھی جس کا لقب دانشمند تھا۔ اور چارلس حقیقت میں بہت سی باتوں میں دانش مند ثابت ہوا۔ اُس نے انگلستان سے ملک کا وہ بہت سا حصہ واپس لے لیا جسے ایڈورڈ سوم نے فتح کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے فرانس کے لئے اور بھی بہت سے مفید کام کئے۔ گو اُس کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ نہ کی گئی تھی پھر بھی اُس کی عقل و دانش کی شہرت تھی اور اس شہرت کو قائم رکھنے کے لئے وہ ضروری سمجھتا تھا۔ کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ وہ کتابی علم سے بے بہرہ ہے۔ اس معاملہ میں وہ حساس بھی بہت واقع ہوا تھا۔

بادشاہ نے ہنری وک سے کہا "گھڑی وقت تو ٹھیک دیتی ہے۔ لیکن" ۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس میں کوئی نقص بتائے مگر یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے متعلق اُسے کوئی واقفیت نہ تھی " اس کے ہندسوں میں ایک غلطی ہے"

وِک نے پوچھا "حضور کہاں"؟

بادشاہ نے کہا "اس کے چار کے ہندسے کی بجائے چار ایکے ہونے چاہئیں"۔

وِک نے کہا "حضور آپ اس معاملہ میں غلطی پر ہیں"۔

بادشاہ نے کڑک کر کہا "مجھ سے کبھی غلطی نہیں ہوئی اس کو مٹا دو اور صحیح کر کے لکھو!"

بادشاہ کا حکم تھا، غلطی درست کر دی گئی اور اُس دن سے آج تک ۴ کے ہندسے کو بجائے IV کے IIII لکھا جاتا ہے +

امریکا کی فلک بوس عمارات

امریکا میں بعض عمارات اس قدر بلند ہیں کہ انہیں فلک بوس کہنا بے جا نہ ہوگا۔ نیویارک کی مشہور عمارت ایکوی ٹیبل بلڈنگ کی ۳۶ منزلیں ہیں۔ اس میں ہر وقت تقریباً بارہ ہزار آدمی رہتے ہیں۔ اور ہر روز کم از کم ایک لاکھ ستائیس ہزار آدمی اس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

۱۹۱۳ء کی خوفناک آتشزدگی کے بعد یہ ۱۹۱۵ء میں دوبارہ تعمیر ہوئی تھی۔ اُس وقت سے لے کر آج تک پھر اس میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا۔ اس میں ترپسٹھ لفٹ لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ سے روزانہ بانوے ہزار انسان اوپر چڑھتے اور نیچے اُترتے ہیں اور یہ لفٹ اس چڑھنے اور اترنے میں ایک سال کے اندر دو لاکھ پچھتر ہزار میل کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں۔

اس عمارت کی آبادی انگلستان کے قصبہ وارک کے برابر ہے اور یہ دو کروڑ ساٹھ لاکھ مکعب فٹ جگہ گھیرے

ہوئے ہے۔ اس کے مکینوں کو ہر روز تریسٹھ ہزار خطوط اور پارسل موصول ہوتے ہیں۔ اور اٹھاسی ہزار پارسل اور خطوط باہر بھیجے جاتے ہیں۔

اس کی پانچ ہزار کھڑکیاں ہیں اور دس ہزار دروازے۔ اور بدرجۂ اقل پندرہ ہزار بجلی کی بتیاں اس میں لگی ہوئی ہیں +

مسیح الملک حکیم اجمل خان کی وفات حسرت آیات

ماہِ جنوری کا "ہمایوں" طبع ہو چکا تھا جب ہمیں خبر ملی کہ حکیم اجمل خاں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

اس سدمۂ جانکاہ کا اثر صرف اُن کے اعزہ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس میں تمام عالمِ اسلام اور ہندوستان کی متحدہ قومیت یکساں طور پر شریک ہے۔ مسیح الملک کی وفات کسی ایک فردِ قوم کی وفات نہیں۔ اُن کی شخصیت کے اُٹھ جانے سے ہم نے ایک عظیم الشان طبیب، ایک زبردست رہنمائے قوم، ایک حقیقی محبِ وطن اور ایک بے مثال ادیب کھو دیا۔

طبِ یونانی جو بظاہر سکرات کے عالم میں تھی مرحوم ہی کی مسیحائی سے ازسرِ نو زندہ ہوئی۔ طبیہ کالج دہلی اُن کی مہتمم بالشان خدمات کی روشن ترین مثال ہے جو محض اُن کے عدیم النظیر ایثار پر قایم تھا اور رہے گا۔ مسیح الملک کے یونانی دواخانے کا تمام منافع جو ہر سال لاکھوں روپے ہوتا ہے اس کالج کی سُود و بہبود کے لئے وقف ہے۔

قوم کو اُن کی وفات سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اور ممکن نہیں کہ اُن کی جدائی کا داغ کبھی ہمارے دلوں سے مٹ سکے +

عالمِ خیال

کس کے خوابیدہ تخیل کی تب و تاب ہوں میں　　جو نہ شرمندۂ تعبیر ہو وہ خواب ہوں میں

جو لبِ ہستیٔ مطلق پہ بن آئے نہ رہا　　غمِ ہستی کا وہی نالۂ بے تاب ہوں میں

چشمِ عنقا سے جو انجامِ دو عالم پہ گرا　　وہی آنسو ہوں وہی گوہرِ نایاب ہوں میں

ذرّہ ذرّہ میں عیاں ہے غمِ پنہاں میرا　　سوزِ خورشید ہوں داغِ دلِ مہتاب ہوں میں

کیا کرے جانے یہ آزادگی و خود بینی؟　　جس کا بندہ ہوں اُسی سے بھی عنان تاب ہوں میں

آہ کس کس نے زمانے میں مٹایا مجھ کو

ہمہ تن شکوۂ بے مہریٔ احباب ہوں میں

حامد علی خاں

لمعات

جب کبھی مسکرا دیا تو نے
درد کو کر دیا دوا تو نے

میں اسی ابتدا کی ہوں تمہید
جس کو لا انتہا کیا تو نے

میں ہوں ممنون اے جفا پیشہ
دل کو غم آشنا کیا تو نے

اک مسرت ہے غم میں بھی حاصل
کر دیا خوگرِ جفا تو نے

صاف آتی نہیں ہے اب آواز
نزع میں آہ کیا کہا تو نے

وجہِ تسکینِ دل ہوا جب درد
درد کو کر دیا دوا تو نے

بڑھ گیا اور بھی حجابِ نظر
عام جلوہ اگر کیا تو نے

منکشف کر دیئے حیات کے راز
خوب جب آزما لیا تو نے

سن کے مجھ سے مری حکایتِ دل
کیا کیا مسکرا دیا تو نے

وجہِ ماتم ہے حاسدوں کے لئے
مجھ کو جادو نوا کیا تو نے

تیری ہمت پہ آفریں ثاقب
تھا جو دل میں وہ کہہ دیا تو نے

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

کیا؟

مجھے کچھ کہنا ہے مگر جو کچھ کہنا ہے اُسے اگر بالکل کھلے کھلے لفظوں میں کہدوں تو لوگ اسے اس قدر گول مول تصور کرینگے کہ میرا مطلب فوت ہوجائیگا ۔ لوگ لائق ہیں اور اپنی ذہانت سے معمولی سی معمولی بات کو بھی عقدِ ثریا سے ورے نہیں چھوڑتے مگر مجھے آسمان کے تارے نہیں توڑنے ۔ مجھے تو سیدھی سی بات کہنی ہے وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اور اردو سمجھنے والوں سے لیکن اسی لئے اس بات کو سات دیباچوں کے بعد پردے ہی پردے میں کہوں گا ۔

(۲)

جسم ۔ "روح! تو جارہی ہے؟ سچ مچ؟ اچھا سدھارو ۔ رستہ، سنا ہے ایسا ویسا ہی ہے، دیکھ کر چلنا ۔ جو بات بیت گئی اس کا ذکر فضول ہے مگر تو نے مجھے بہت دُکھ دیئے اور اس پر بھی ہمیشہ تجھے معاف کیا گیا ۔ اب بھی معاف کرتا ہوں ۔ میں تو آرام کرتا ہوں اور یہ جو تم نے آوارہ گردی کی ٹھانی ہے سو تمہاری مرضی! کبھوں میری طرح آرام نہیں کرتی ہو؟ کہاں ماری ماری پھروگی؟ کیا کہا کہ سفر لازمی ہے! تھا'........ ہوگا'........ ہم تو تھک چکے...... اچھا ایک آخری بات سن لے ۔ امتحان میں پڑتی ہے غلطی کرتی ہے ۔ میرے ہی امتحان میں تو فیل ہوچکی تو اور کسی کے امتحان کا تجھے کیا یارا ہے! ۔ کم بخت سو سو دفعہ تجھے رعایتی نمبر ملے کہ تو فیل نہ ہو ۔ کئی دفعہ محض سفارش سے تو اوپر والی جماعت میں بھی چڑھائی گئی مگر جس طرح امیر زادوں کی معمولی تعلیمی ترقی یہی ہوتی ہے ۔ کہ پرائمری فیل، مڈل فیل، انٹرنس فیل، نالائقی پاس اسی طرح تو بھی مذہب فیل، معاشرت فیل، سکھ فیل اور دُکھ پاس رہی ۔ اُف تم نے مجھے کیا کیا نہیں ستایا؟ جا اب دور ہو ۔ جہاں کی تو لعنت ہے وہیں جا ۔ میں اب چین سے پاؤں پھیلا کر سوؤں گا ۔

روح ۔ کیا تم سب کچھ کہہ چکے؟

جسم ۔ سب کچھ ۔

روح ۔ آج تک کیوں نہ کہا؟ کیا مجھ پر رحم کیا؟

جسم ۔ او بیوقوف! رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ کیا کہتا؟ مجھ پر تو صرف ہمعصروں کا اور تیرا ظلم تھا مگر تجھ پر مُردے بھی سوار تھے ۔

سقراط نے یہ کہا، ارسطو نے یہ بکا، ڈارون کی لن ترانیاں یوں تھیں ۔ یہ تھا تیرا شغل ۔ جسے اس جنجال میں مبتلا دیکھتا اُس پر رحم نہ کرتا تو کیا کرتا؟ ۔

روح ۔ للہ مجھے معاف کرو ۔ کاش کہیں رہ سکتی! اگر کچھ اور رہنا ہوتا تو ضرور تلافی کی کوشش کرتی مگر مجھے ان مُردوں نے کہیں کا نہ رکھا ۔ مُردوں کے فریب میں آکر زندوں کو ستاتی رہی ۔ افسوس!

(۳)

زندگی کا مُنایہ ہے کہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ضروری ایثار کی طاقت نہ رہے ۔ شباب کا مُنایہ ہے کہ گناہ کی اُمنگ باقی نہ رہے ۔ نیکی اُس شکست کا نام ہے جو ماحول کے پے در پے حملوں سے فطرتی انسانی جذبات کو روزانہ نصیب ہوتی ہے ۔ وہ جوانا مرگ جذبات جنہیں اس شکست کا اوائلِ عمر ہی میں مزا چکھنا پڑے اندر ہی اندر سانپ کی طرح بِس گھولتے رہتے ہیں ۔

(۴)

اس دنیا میں پھول اور پھل ایک ہی وقت ایک ہی درخت میں صرف کہیں کہیں ساتھ ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر پھول محض آنے والے پھل کی آرزو کا ایک شگفتہ سا اظہار ہیں ۔ اسی طرح بچپن ایک شغل بیکاری ہے ۔ شباب کے کھیل کا ایک بھڑکیلا مگر پھٹ جانے والا اشتہار ہے ۔

(۵)

پہلے موت، پھر شباب، پھر بچپن! یہ کیا الٹ پھیر ہے؟ کوئی الٹ پھیر نہیں ۔ ایک مرد خدا کو القا ہُوا کہ انسان نہیں مرتا ۔ صرف وقت مرجاتا ہے ۔ اس عارف نے اپنی ریاضت کے زور سے وقت کو از سرِ نو زندہ کیا مگر شومیٔ قسمت سے وقت کی گھڑی میں الٹی طرف چابی لگ گئی یعنی بجائے آگے بڑھنے کے وقت پیچھے ہٹنے لگا ۔ جس مرید کو اس حال سے آگاہی ہوئی اس کا ایک ہی نعرہ ہے :-

"میں خدا کی طرف اُلٹے پاؤں جا رہا ہوں!!!"

(۶)

میرا مولوی بھی یہی کہتا ہے کہ تیرہ سَو سال پیچھے ہٹ جاؤ ۔ موجودہ صدی فضول ہے اس سے پہلی لایعنی تھی ۔ اُس سے پہلی کا خیال نہ کرو ۔ جو اُس سے پہلی ہیں اُن کو بھی بُھلا دو اور پورے تیرہ سَو سال اُگل دو ۔ آمنّا و صدقنا ۔ مگر خدا کی جانب سامنی طرف کا راستہ کیا بند ہے؟ ۔

(۷)

ایک عیش نصیب حضرت کو یہ رنج ہے۔ کہ ان کا دوست غمگین ہے اور اظہارِ ہمدردی کو اولی ترین انسانی فرض سمجھ کر یہ حضرت بھی عیش کی حکمرانی چھوڑ چھاڑ آہ و بکا میں مصروف ہیں۔ یعنی ان کا آئینِ وفا یہ ہے کہ دوست خوش نہیں تو ہم بھی خوشی کو لات مارینگے۔ دراصل سارے کا سارا ایشیا ہی اسی نہج پر ہے۔ نمازی کو جب تک دنیا میں ایک بھی بے نماز نظر آتا ہے چین نہیں آسکتا اور لطف یہ ہے کہ جتنی نمازیں لمبی ہوتی ہیں جوں جوں نمازی زیادہ ہوتے ہیں، اُسی قدر یہ بیچینی بڑھتی ہے۔ یعنی ایشیا میں ایک غم یا ایک گناہ بہت سی خوشی بہت سی عبادت کو لے مرتا ہے۔ یہ کیوں نہیں ہوتا کہ تھوڑی سی عبادت بہت سے گناہوں کو لے مرے یعنی اس طرح کہ جس قوم میں ہزار میں سے ایک نمازی ہو وہ قوم اپنے تمام افراد کو ہی نمازی سمجھ لے؟ گناہ کا وار نیکی پر اس قدر کاری کیوں ہے اور نیکی کا جادو بدی پر کیوں نہیں چلتا؟ کیوں کوئی غمگین کسی عیش نصیب دوست کا خیال کرکے اپنے آپ سے یوں مخاطب نہیں ہوتا؟ "میرا دوست خوش ہے گویا میں ہی خوش ہوں۔ میرا اولین فرض یہ ہے کہ اپنا غم چھپا کر اُس کی خوشی بڑھاؤں"، اور کیوں خوشی کا شہسوار یوں نہیں کہتا "چونکہ میرا دوست غمزدہ ہے۔ اس لئے مجھے اور بھی زیادہ خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تاکہ دوست کا غم زیادہ نہ ہو"، مگر یہ کبھی نہیں ہوگا۔ صدیوں سے مل کے کریں آہ و زاریاں "والی بلائے بد ایسی بُری طرح اس رسم زدہ برّاعظم کے گلے پڑی ہے کہ اب چھٹکارا مشکل ہے۔ خود زبان چیخ رہی ہے کہ جن لوگوں میں "ہمدردی" کا لفظ ہے مگر "ہم مسرتی" کسی نے آجتک نہیں بولا اُن میں درد عام ہوگا مسرت کا نام نہ ہوگا کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ ایشیا کی دنیا کو جسمانی خوشی کے رسول کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایشیا میں روحیں ڈھلتی ڈھلتی اس قدر پتلی پڑ گئیں ہیں کہ اب تقریباً ناکارہ ہیں۔ بالخصوص اس خیال سے کہ ایشیا کے روحانی دھوبی ابھی تک پرانے طریقے سے روحوں کو عذاب کے پتھر خوف کے تختے پر زور زور سے پٹختے ہیں۔ دھوبی کا کیا جاتا ہے مگر روحیں ہیں کہ چمک اور استری تو کجا جو چرنے پھٹنے سے بچے اسے گائے چبائے جاتی ہے۔ کاش کہ مسلمان اس رسوم کی گائے کو قربان کردیں مگر آمدیم برسر مطلب۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایشیا میں ایسا ہادی پیدا ہو جائے جو پیرس کے باکمالوں کی طرح۔ . . . . [یادش بخیر۔ پہلے پیرس کو آنکھیں بند کرکے دیکھ لوں۔ ایشیا میں خوشی حرام ہے وہاں غم حرام ہے۔ یہاں کسی آنے والی دنیا کی خوشی کا تقاضا ہے کہ گریہ نیم شبی پر زور ہو مگر پیرس کے شبستانوں میں اس جانے والی دنیا کی داد میں رقص و سرود و خندۂ فراواں کی دلفریبی ہے۔ ہم اس دنیا کو لات مارتے ہیں وہ اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہیں (دنیا سب جگہ عورت ہے صرف سلوک کا فرق ہے) مگر پیرس کو اس طرح کیوں یاد کیا جائے۔] پرانی سے پرانی

روحانی قمیص کو ہر ہفتے چمکا دے مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ یارانِ وطن شدھی کی دُھن میں ہیں۔ افغانی شلوار تو خدا خدا کر کے پتلون بن چلی ہے مگر ہندوستانی تہمد کی خیر نہیں۔ آج دھوتی کل لنگوٹی۔ [سنتا ہوں کہ مدراس میں کوئی مولانا کسی پنڈت جی کے پاؤں پڑے۔ اس ہم مسرّتی کے سوانگ سے بھی خدا بچائے]

مجھے کچھ کہنا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ وہ مائیں پیدا نہیں ہوئیں جن کے بچے اسے سن سکیں۔ دنیا سے میں ناراض نہیں۔ جیسی بھی ہے اچھی ہے اور بیچاری بہتر ہونے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ دنیا والوں سے میں ناراض نہیں۔ جہاں بھی ہیں جھوٹے ہیں اور جو جھوٹا ہے سو اچھا ہے۔ مگر جب ایشیائی میلا کچیلا جھوٹ یورپ کے زرق برق دروغ میں تبدیل ہو جائیگا تو پھر دنیا میں آہ وزاری کی آواز کہاں سے آئیگی؟۔ آنسوؤں کے شیدائی پھر کہاں تیس مارخانی کرینگے؟ اس دنیا کی قسمت میں اگر ایک ابدی تبسّم بننا لکھا ہے۔ تو کیا رونے والوں نے یونہی اپنی عمریں کھوئیں؟

کیا؟ کیا؟؟ کیا؟؟؟

فلک پیما

محبت

پیارے مجھ سے تھوڑی محبت [illegible] ہمیشہ کے لئے۔

اے محبت! اے پیاری اور ننھی سی!

محبت، محبت کا مفہوم سمجھ لیتی ہے اُسے کسی ترجمانی کی ضرورت نہیں۔

تمہاری خواہشیں پاکیزہ ہوں اور تمہاری محبت گہری۔

جس کسی نے محبت کی پہلی نظر ہی کی۔

گلچیں

تکمیلِ محبّت

(۴)

سجاد ایک تھرڈ ایر کلاس کا طالب علم تھا۔ اُسے علی گڑھ میں آئے تین سال ہونے کو تھے۔ وہ علی گڑھ کی مخصوص خوبیوں سے مزین اور وہاں کی تہذیب و سیاسیات سے خوب آگاہ ہوچکا تھا۔ ایک روز وہ اسٹریچی ہال کے قریب گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ سر سید کورٹ میں کھڑا سر اُٹھائے ٹکٹکی باندھے ہال کو دیکھ رہا ہے۔ جب وہ پھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ اب یہ حضرتِ جامع مسجد کے آگے ڈٹے کھڑے ہیں اور اُسی طرح بہ غور و خوض اُس کا مطالعہ کر رہے ہیں حیران ہوا کہ کیا ماجرا ہے یہ کوئی امریکی سیاح ہیں؟ لیکن امریکی تو اتنی دیر میں ساری کی ساری دہلی اور شاید تاج محل بھی دیکھ جائیں یہ سست رفتار آدمی ضرور کوئی مشرقی خیال پرست ہیں جن کے دماغ کا کوئی نہ کوئی پرزا ڈھیلا ہوگیا ہے۔ اور بلاشبہ وہ ایک عجیب کانے آدمی تھے اور طرزِ لباس سے ایک معمولی طالب علم۔

سجاد نے کہا اِن عجیب الخلقت کا سراغ لگانا چاہیئے کہ ان کا دولت کدہ کون سے نمبر کمرے میں ہے؟ کیا عجب ہے کہ علی گڑھ کی غیر دلچسپ فضا میں ہمارے لئے اِس سے کچھ دلچسپی کا سامان پیدا ہو جائے۔

جمیل جب سے علی گڑھ میں آیا تھا اُس کے در و دیوار کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں کے کھلے وسیع کورٹ، وہاں کے ہال، وہاں کی مسجد، وہاں کے گراؤنڈ اور میدان، لباس کی یکسانیت، ترکی ٹوپیاں، طالب علموں کی یگانگت، آزادخیالی اور خودداری سے وہ غایت درجہ متاثر ہوا۔ اُس کی طبیعت سچے اسلامی جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسلامی تاریخ میں اُس نے مسلمانوں کے شاندار کارنامے گویا آنکھوں دیکھے تھے۔ امیر علی کی تصنیفات "روحِ اسلام" اور مختصر تاریخ عرب" شبلی کی "الفاروق" اور "الغزالی" عبدالرزاق کی "البرامکہ" حالی کی "مسدس" اور ایسی ہی چند اور شہرۂ آفاق کتابیں نہ صرف اُس کے مختصر سے کتب خانے میں شامل تھیں بلکہ اُس کے دل و دماغ کی زیب و زینت بنی ہوئی تھیں۔ فاروقِ اعظم کا راتوں کو گشت کرنا، صلاح الدین کا عدالت میں جوابدہی کے لئے آکھڑا ہونا، طارق کا آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے سپین میں جادھمکنا، قرطبہ و بغداد کی علمی و ادبی مجلسیں، غزالی و رومی، بوعلی سینا و ابن رشد کی مذہب آرائیاں اور فلسفہ پیمائیاں، عرب کے صحرا، الحمراء و القصر کے محلات الزہرا و ایا صوفیہ کی مساجد جو اس کے نقش میں جاگزیں ہوچکی تھیں سب علی گڑھ کے نظارے سے گویا ایک آن کی آن میں اس نوجوان خیال پرست مسلمان کی نظروں میں پھر گئیں۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عارضی طور پر اپنی سب قلبی کلفتیں بھول گیا ہے۔ اُسے ایک نئی دنیا مل گئی ہے جس میں وہ محوِ تماشا ہے۔

چند روز کے بعد جمیل کے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک وضعدار معتبر صورت طالب علم اندر داخل ہؤا۔ جمیل استقبال کو اُٹھا۔

طالب علم۔ السلام علیکم۔ کہو بھئی اچھے ہو؟ کب علی گڑھ آنا ہؤا؟

جمیل۔ (تعظیم وتکریم کے لہجے میں) جناب میں ایک ہفتہ ہؤا حاضر ہؤا ہوں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ مجھ ناواقف اجنبی پر آپ نے یوں عنایت فرمائی۔

طالب علم۔ ناواقف! ہاں ناواقف تو آپ معلوم ہو ہی رہے ہیں ورنہ علی گڑھ میں یوں ادب سے گفتگو کر کے اپنی مٹی پلید نہ کریں اور "اجنبی پنے" میں تو آپ کنجوس سیاحوں یا کسی عالم اثریات کے ہم پایہ ہیں۔ بھائی تمہاری نظر بازی ہی مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی ہے کہ مجھے بھی وہ کچھ دکھا دو جو تم نے جمعہ جمعہ آٹھ روز میں یہاں دیکھ پایا ہے۔ اور جو میں تین سال سے تلاش کر رہا ہوں مگر کہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اور باقی کیا علی گڑھ کا ایک "طالب علم اور" کیا اُس کی عنایت فرمائی کا شکریہ؛ عنایت تو تم سے فاضلِ اجل و ناظرِ اکمل کی ہے کہ مجھ سے سہ سالہ طالب علم کو اپنی بزرگانہ صحبت سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

جمیل۔ آپ کا اسمِ مبارک؟

طالب علم۔ اسمِ فاعل اسمِ حالیہ اسمِ تفضیل وغیرہ سے تو شاید کسی کو یہاں کے اسکول میں تھوڑی بہت آگاہی ہو بھی مگر واللہ اسمِ مبارک علی گڑھ کی کسی قواعد میں تمہیں نظر نہ آئے گا۔ مجھے سجاد کہتے ہیں۔ اور تمہارا وہی اسمِ مبارک؟

جمیل۔ (شرما کر) جمیل۔

سجاد۔ اچھا تو جمیل آؤ میں تمہارے دماغ سے پُرانے زمانے کی بوسیدہ تاریخ کے اوراق نکال کر وہاں کچھ جدید معلومات کا اضافہ کروں۔ بھائی اسٹریچی ہال یہ بارکیں یہ مسجد بھی سب محض گارے اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہال میں جلسے ہوتے ہیں جہاں بڑے بڑے آدمی نئی اور پرانی وضع کے چست لباس پہن کر ایک دوسرے کو دھوکا دینے آتے ہیں۔ بارکوں میں آوارہ گردی ہؤا کرتی ہے اور مسجد غریب طالب علموں سے جرمانے کی زکوٰۃ وصول کرنے کی تاوان گاہ ہے اور بس باقی یہاں مجھ سے نوجوان ہیں اور کچھ اُن کی خوشامد کرنے والے پروفیسر اور پرنسپل۔

جمیل۔ لیکن بھائی سچ بتاؤ کہ یہاں کا انتظام تو نہایت اہتمام و توجہ سے ہوتا ہوگا۔ ایک مکمل دار العلوم کا چلانا کوئی

معمولی بات نہیں۔

سجاد انتظام یہاں ہر ایک کا کیا جاتا ہے بڑی توجہ سے تکمیل یہاں ہر شے کی ہوتی ہے یہاں تک کہ سیاست کی بساط بھی بچھی رہتی ہے۔ اور یہ نرا دار العلوم نہیں یہاں فنون ولطائف و مزخرفات کی ساخت پرداخت بھی ہوتی ہے۔

جمیل لیکن آخر یہاں کے ارباب حل وعقد بڑے باتدبیر ہوں گے۔

سجاد باتدبیر؟ باتقدیر کہو تو بات بھی ہے۔ اور بھائی یہاں کے ربِ حل وعقد کے آگے تو ربِ ارض وسما کی دال بھی نہیں گلتی۔ لیکن خیر تم ابھی بچے ہو۔ تم کیا سمجھو علی گڑھ کی ان سیاسیات کو۔ بس چھوڑو یہ قصہ اور سمجھ لو کہ علی گڑھ لاہور سے کسی صورت بہتر نہیں اور بدتر نہ ہو تو غنیمت ہے۔ ہاں تم سے ہزار ڈیڑھ ہزار مسلمان نوجوان یہاں آ وارد ہوں تو شاید اس فضا میں کچھ تبدیلی واقع ہو جائے۔ لیکن خیر آؤ ہم تم کوئی کام کی بات کریں۔

یہ باتیں ہو کر دونوں دوست باہر چلے گئے اور پھر یہی معمول ہو گیا کہ سجاد اور جمیل عموماً اکٹھے رہتے۔ سجاد کی صحبت جمیل کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ یہ ضرور ہوا کہ علی گڑھ کے متعلق جو منصوبے اُس نے باندھے تھے وہ سب خاک میں مل گئے اور اس سے چند دنوں کے لئے وہ ملول و مایوس سا ہو گیا کہ میں جس بت کو اپنی پرستش کے لئے کھڑا کرتا ہوں فوراً اُس کا کوئی بت شکن آ دھمکتا ہے۔ لیکن سجاد کے اثر سے وہ کبھی کبھی اپنے خیالات کے خول کے اندر سے زبردستی باہر کو کھینچ لیا جاتا جس سے نہ صرف اُس کے خیالات کو وسعت ہوئی بلکہ دل لگی کا ایک اچھا خاصہ سامان پیدا ہو گیا۔

پھر بھی ثروت کا خیال بھلائے نہ بھولتا تھا۔

ایک روز علی الصباح سجاد جمیل کے کمرے میں آیا۔ جمیل سو رہا تھا۔ سجاد نے عمداً اُسے نہ جگایا اور اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو میز پر دیوانِ حافظ پڑا تھا۔ کھولا تو اُس صفحہ کے اندر سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ غزل تھی کہ

ترسم کہ اشک در غمِ ما پردہ در شود — ویں رازِ سر بہ مُہر بہ عالم سمر شود

گویند سنگ لعل شود در مقامِ صبر — آرے شود ولیک بہ خونِ جگر شود

کاغذ کے پرزے پر یہ عبارت لکھی تھی :۔

آہ ث . . . میری بیترسے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک وصاف !

آہ ث . . . میری بیترسے لئے محبت پُرخلوص ہو اور نرم و خاموش !

میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں

میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں

آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت کامل ہو اور پائدار !
آہ ث . . . میری تیرے لئے محبت صادق ہو اور خوددار !
تیرے پیار میں میرا دل تجھ پر نثار ہو !
تیرے خیال میں میرا ہر خیال تجھ سے سرشار ہو !
آہ اے میری پہلی دلبر ! اے تُو حسن کی شمع !
اے تو محبت کی دیوی ! اے تُو صداقت کی پُتلی !
آہ ث . . . کیا اب میرا تیرا رستہ جدا جدا کیا اب میرا تیرا نصیبہ
الگ الگ ہے ؟
اگر ہے تو
پھر بھی ث . . . خدا کرے میں تجھ سے محبت کروں اور کرتا رہوں
پھر بھی ث . . . خدا کرے میں تیری پرستش کروں اور کرتا رہوں
اور
میری تیرے لئے محبت بے غرض ہو اور پاک و صاف
اور تیری میرے لئے اُلفت بیدار ہو اور نرم و خاموش !

چُپکے سے یہ پُرزا جیب میں ڈال کر سجاد چلتا بنا۔ گھنٹے بھر کے بعد پھر آیا تو دیکھا کہ جمیل نے کمرے کا سب سامان تہ و بالا کر رکھا ہے اور کچھ تلاش کر رہا ہے۔

سجاد کوئی نوٹ گم ہو گئے یا کوئی پالتو بلی کہیں چھپ گئی ؟

جمیل (پریشان ہو کر) نہیں ایسے ہی والد کا ایک خط تھا جو ڈھونڈ رہا ہوں۔

سجاد جی وہ تمہارے والد کا خط تو میں نے تمہارے والد بزرگوار ہی کی خدمت میں واپس بھیج دیا ہے۔

جمیل (کھسیانا ہو کر) ہیں بھائی سجاد ! یہ کیا ! بھئی سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں قسم ہے۔ وہ تو ایسے ہی کچھ خیالات تھے خط نہ تھا

سجاد وہ میں اُسے پہنچا دوں گا جس کے لئے لکھا تھا۔ لیکن یار تم تو بڑے مکار و عیار نکلے۔ بالکل غیر مسلم۔ ہاں خیالات ہی تھے۔ شاید علی گڑھ میگزین کے لئے کچھ لکھا تھا ؛ ایڈیٹر تمہاری تین نقطوں والی کا گلا کاٹ دے گا جب جا کر

تمہارے باقی ماندہ مسودے پر نگاہ ڈالے گا۔

جمیل سجاد کیا کہوں!

سجاد ارے بھائی مسلم اِس طرح چھپ چھپ کر خیالات بنا بنا کر دلبر کی غیر حاضری میں روتا نہیں وہ اُسے ہر طریقے سے جیت لینا چاہتا ہے۔

جمیل تو پھر میں واقعی کچھ غیر مسلم سا ہوں۔

سجاد تمہیں میری قسم مجھے بتاؤ آخر یہ کون بھلا مانس ہے جس کی بیٹی تمہاری نظر پڑ گئی؟

جمیل تم تو مذاق اُڑاتے ہو اور اِن چیزوں کا مذاق ہی اُڑانا چاہیئے کہ اِن کی سنجیدگی صرف اُن کے لئے ہے جن کے دل محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔

سجاد جمیل میں ایک مسخرا ہوں اور دنیا کو مسخروں کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تمہاری اس رنگین نوائی (خط جیب سے نکال کر جمیل کو دے دیتا ہے) کو دیکھ کر جس کے لئے میں دل سے معافی کا خواستگار ہوں میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا رازدار سمجھو اور مجھے بتاؤ جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے۔

جمیل (ایک آہ بھر کر) سجاد تم سنجیدہ بن کر مجھے کیوں رنجیدہ بناتے ہو۔ میں اک خیال پرست ہوں اور دنیا کو خیالات و تصورات کی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا مقامِ شکر نہیں کہ تمہارے تفنن سے میری سنجیدگی کچھ کم ہوئی۔ اب تم سنجیدہ بن گئے تو میں کیا کروں گا؟

سجاد کیا اُس لڑکی کو تمہارے کسی عزیز نے دیکھا ہے اور کیا وہ اُس سے تمہاری شادی پسند کریں گے؟

جمیل یہ میری چچازاد بہن ہے۔ میرے عزیزوں کو مجھ سے بھی زیادہ اُسے دیکھنے کا موقع ملا ہے (ملاحظہ ہو کہ نگاہوں کی مجموعی تعداد وحدت سے اندازہ لگایا جاتا تو یہ سرتاپا غلط تھا) اور شادی کا کیا پوچھتے ہو۔ بھائی میرا شمار شادی پسندوں میں نہیں۔

سجاد اللہ اکبر! تم گاندھی کے پیرو کب سے ہو گئے اور اُس بھلے مانس مہاتما نے بھی شادی کے بعد ازدواجی تعلق کے خلاف لیکچر دینے شروع کئے۔ لیکن تم مہاصونی شادی سے پہلے ہی اُس کے مشاہدے سے بھی بیزار ہو گئے۔ خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو۔ بھئی اسے ہنسی ٹھٹھا نہ سمجھنا۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے جس کا اثر تمہاری ساری زندگی پر پڑنے والا ہے۔ خدا کے لئے ذرا ہوش میں آؤ۔ کہیں کسی سادھو سے پرستان کی کوئی جڑی بوٹی لے کر تو نہیں نگل لی؟

جمیل اگر یہ دیوانہ پن ہے تو شروع سے اخیر تک میری ساری زندگی محض دیوانہ پن اور میرے سارے منتہائے نظر فقط سراب نظر ہیں ۔

سجاد یقیناً، بلاشبہ ! تم تو مسلم ہو یہ غیر مسلمانہ روش کب سے اختیار کی ؟

جمیل کیا کسی شخص کو کسی دوسرے سے الفت یا محبت نہیں ہوسکتی جب تک شادی کا دلّال بیچ میں آکر سودا نہ کرائے؟ گویا مسلمان صرف شادی کرسکتا ہے بغیر محبت کے اور محبت نہیں کرسکتا مگر شادی کی حالت میں ۔ پھر دوستی بھی ایک بے معنی تعلق ہے ؟

سجاد ارے میاں ذرا کبھی لغت بھی اٹھا کر دیکھ لیا کرو ۔ دوستی مردوں مردوں اور عورتوں عورتوں میں ہوتی ہے پیار ماں کو بچے سے ہوتا ہے یا بچے کو ماں سے اور اُنس آدمی کو آدمی سے ۔ لیکن محبت یا عشق صرف مرد کو عورت یا عورت کو مرد سے ہوتا ہے اور یہ اُسی وقت جائز ہے جب عقد کی مہر اُس پر لگ جائے !

جمیل تو گویا محبت یا عشق تولیدِ جنسی کا اجارہ دار ہے اور بس ؟

سجاد بھائی جمیل میں یہ نہیں کہتا کہ اس معصوم لڑکی سے محبت نہ کرو ۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اُس بیچاری سے دل لگا کر اُس سے یوں دست بردار نہ ہوجاؤ ۔

جمیل میں دل لگانے والوں میں نہیں ۔ میرے دل میں تو محض اُس کی طرف محبت کا اک پاکیزہ جذبہ ہے ۔ وہ جس کی قسمت میں ہوگی، جسے اُس کے والدین دینا چاہیں گے اُسے مل رہے گی ۔

سجاد یہی سہی تو اسے کیوں محض اُس کے والدین کی مرضی پر چھوڑتے ہو ۔ شاید تمہیں اُس کی خوشی کے بہترین کفیل ہوسکو ۔ کیا اُسے یوں چھوڑ دینا اُس سے محبت کرنا ہے ؟

جمیل سجاد اگر یہ محبت شادی کی غرض سے ہوتی تو بھی میں اُس کے قابل کب تھا ! میرا جسم منحنی ہے میرا دل تاریک ہے نہ میرے پاس زیادہ زر و مال ہے نہ کسی رتبے یا عہدے کا رعب و داب ۔ خدا گواہ ہے میں کسی طرح بھی اُس کے قابل نہیں !

سجاد میں سمجھ گیا تم اُن بزدل ناخود شناس خیال پرستوں میں سے ہو جو اپنے تئیں کسی شے کے قابل نہیں سمجھتے اور اسی لئے کسی شے کے قابل بنتے نہیں ۔ اور اگر بنتے بھی ہیں تو اس سے دنیا یا دنیا والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ وہ انڈے کی طرح اپنے اندر ہی رہتے ہیں ۔ وہ کیا ہوئے اور کیا نہ ہوئے ۔ اُنہیں دنیا سے غرض نہیں تو دنیا کو اُن سے کیا غرض ؟ فی الحقیقت اُن کا دنیا میں رہنے کا حق ہی کیا ہے ۔ وہ اپنے فطری فرائض کو ادا نہیں

کرتے بلکہ زندگی سے جی چُراتے ہیں۔ بھائی زندہ وہی ہیں جو زندہ دل ہیں، انسان وہی ہیں جو دوسروں سے تعلقات پیدا کریں نہ کہ فقط اپنے خیالات و تصورات میں محو رہیں۔

جمیل ثروت اور مجھ سے شادی! نہیں سجاد ناممکن قطعی ناممکن۔ وہ میری ہمیشہ کے لئے میری ہے۔ وہ وہاں نہیں جہاں ہے وہ میرے دل میں موجود ہے اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ میں دنیا میں اپنا کام کرتا ہوں کئے جاؤں گا۔ مجھ سے اوروں کے لئے جو کچھ ہو سکے گا میں کروں گا۔ تمہارے نقطۂ نظر سے بھی دیکھوں تو ابھی میں طالب علم ہوں مجھے پڑھنا پڑھانا ہے۔ ابھی میں کیا ہوں کہ اپنے تئیں اُس کے لئے پیش کروں۔ لیکن میرا دل اُس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔

سجاد اچھا جمیل چھوڑو یہ قصہ بھئی آؤ باہر چلیں۔ اگر کہیں ہمارے پروفیسر آف فلاسفی مل گئے تو اُن سے اِس نفسیاتی اُلجھن کے سُلجھانے کا طریق پوچھیں گے۔

---

(۵)

محبت ایک نسوانی جذبہ ہے!

محبت حسن ہے اور حسن عورت اور اس لئے صرف عورت ہی صحیح محبت ہے!

پھر اگر عورت میں محبت نہیں تو وہ محض ایک چینی کی مورت ہے جیسے اگر مرد میں ہمت نہیں تو وہ فقط ایک آہنی بت ہے!

انسانی فطرت کے دریائے جذبات کا سرچشمہ محبت ہے جس کی نزہت گاہ عورت کا دل اور جس کا آبِ رواں عورت کے آنسو ہیں!

عورت حُسن کا پھول ہے اور اس پھول کی خوشبو محبت ہے، مرد کا چمنِ حیات اسی پھول سے آراستہ اور اُس کی فضائے دل اسی کی نکہت سے معمور و معطر ہے!

دنیا کے چمنستان میں مہک اسی پھول سے ہے اور چہک اسی پکھیرو سے۔ اور اس مہک اور اس چہک سے وہ عالمِ انبساط پیدا ہے جس کا نام بہارستانِ زندگی ہے!

دنیا میں جب پہلا انسان پیدا ہوا تو اُس نے عورت کی آنکھوں سے محبت کی زبان سیکھی۔ یہی وہ زبان تھی جس

کی بدولت خلوص کے الفاظ ہمدردی کے جملے اور ایثار و نیکی کے منظومات بزمِ تمدن میں نطقِ فطرت سے ادا ہوئے اور گنبدِ افلاک میں گونج اُٹھے!

دُنیا اک ظلمت کدہ ہے جسے محبت کی شمع منور کرتی ہے اور انسان کا دل ایک صدف ہے جس کی ساری آب و تاب صرف محبت کے دُرِّ شاہوار سے ہے۔

اور عورت جس کا سینہ محبت کا کعبہ ہے جب بھی محبت کرتی ہے تو سراپا محبت ہو جاتی ہے۔ اس شمع کا شعلہ جب بلند ہوتا ہے تو یہ شمع محض اپنا شعلہ بن کر رہ جاتی ہے۔

ثروت اک رنگین وزرّین نوشگفتہ پھول کی طرح بچپن کے گلزار میں لہلہا رہی تھی کہ جمیل ایک بلبل شیدا کی مانند اُس خوش منظر روش پر آ کر اُڑان بھرنے لگا جس کی ساری رونق ثروت کے دم قدم سے تھی۔ اپنے گل کا نظارہ دیکھ کر بلبل نغمہ زن ہوئی، اپنی بلبل کا نغمہ سن کر پھول میں وہ نکہت پیدا ہوئی جس سے دونوں کا باغِ زندگی پایان کار معطر و سرشار ہونے والا تھا۔

ثروت کے دل میں کچھ دیر سے طفلانہ موانست کی وہ لہریں سطحِ خیالات کے نیچے متحرک تھیں جن کا ابھی اُسے خود بھی علم نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی دوسرے کے لئے بھی انہیں حسنِ طفلی کی فطری شوخیوں سے علیحدہ تصور کرنا دشوار تھا۔ جب جمیل "علیم منزل" میں آ کر رہنے لگا اور دن رات اُس کی نظروں سے محبت کی کرنیں جلوہ ریز ہوئیں تو پہلے پہل بے جانے ہوئے ثروت کے دل سے الفت کی وہ رقیق ہوائیں اٹھیں جن سے زندگی کی فضا میں ایک روز دھواں دھار گھٹائیں چھا جانے والی تھیں۔

بہت سے نوجوان ثروت کے پیشِ نظر تھے لیکن قُربت و ہم نشینی کا اثر کہئے یا جمیل کی انوکھی طبیعت کی دلکشی کہ ثروت بچپن ہی سے اپنے کھیل کود میں جمیل کی صحبت میں خوش رہتی تھی۔ اب جب جوانی کی نسیمِ جانفزا چلی تو کسی کے چھپے سن کر یہ غنچۂ ناشگفتہ اِک گلِ رعنا بن کر چٹک پڑا۔

جب ثروت نے پہلے پہل جمیل کو ٹکٹکی باندھے تکتے دیکھا تو وہ نہ سمجھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ لیکن وہ ٹکٹکی ہٹنے والی نہ تھی اور نہ وہ اک نری ٹکٹکی ہی تھی کہ محض تعجب و استعجاب کا اظہار ہوتی۔ نہیں اُن نگاہوں میں اک گہرائی تھی اور اُس گہرائی میں اک سوز تھا، غایت درجہ دلپذیر و دلگداز۔

آخر ایک روز گُل کھِلا۔ ثروت کی انگلی میں اک ننھی سی خوش نما انگوٹھی تھی جسے وہ بار بار اُتار کر اُس سے کھیل رہی تھی اور جمیل اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ انگوٹھی اتفاق سے تپائی ہی پر رہ گئی۔ جب سب کمرہ چھوڑ کر باہر چلے گئے تو

جمیل نے اُسے اُٹھاکر جیب میں ڈال لیا۔ ہفتے کا دن تھا جب وہ گھر والوں سے ملنے اور گاؤں میں دو روز گزارنے کے لئے لاہور سے چلا جایا کرتا تھا۔ جمیل چلا گیا۔ پیچھے انگوٹھی کی تلاش ہوئی۔ بدرالنساء نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آخر ثروت نے کہا کہ انگوٹھی مل گئی۔ بدرالنساء نے پوچھا کہاں ہے اُس نے بات ٹالنے کے لئے کہا کہ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ کہیں ہے۔

بدرالنساء بولی تمہارے جی میں؟

فی الحقیقت وہ انگوٹھی ثروت کے جی ہی میں نکلی۔ اُسے انگوٹھی سے وہ کھیلنا اور جمیل کا وہ دیکھنا یاد آگیا۔ انگوٹھی مل گئی لیکن اُس کا جی کھو گیا۔ کئی ہفتوں سے دل کے خس و خاشاک میں ایک اَن دیکھی چنگاری سلگ رہی تھی جو اب یک لخت ایک شعلہ بن کر دہک اٹھی۔ ثروت کو معلوم نہ ہوُا کہ کیا ہوُا لیکن اُس کا جی سینے میں بیٹھ گیا اور اُس کے بدن میں ایک سنسنی پیدا ہوگئی۔ ثروت نہ جانی کہ اُس کا دل ہی اُس کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ وہ سمجھی تو یہی سمجھی کہ خدا جانے کون اُسے اپنے پروں پر اُٹھاکر بلند ترین چوٹیوں پر لے گیا ہے اور اب اُسے دور نیچے اک ٹھاٹھیں مارنے والے سمندر میں پٹخ دینے کو ہے۔ وہ چیخ اٹھنے کو تھی کہ اُسے اَوروں کی موجودگی کا احساس ہوُا وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں کواڑ بند کر بستر پر لیٹ گئی۔ موتی اُس کی آنکھوں سے ڈھلکنے لگے یہاں تک کہ آنسو چھم چھم جاری ہوگئے اور ہچکی کا تار بھی بندھ گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ روئے اور روئے جائے۔ اس سے پہلے بھی کبھی وہ ماں یا سہیلیوں کے طعنوں پر روئی ہوگی لیکن یہ رونا کچھ اَور رونا تھا۔ یہ اشکِ زار گرم و گرم رفتار تھے۔ اِن آنسوؤں میں محبت پڑی مسکراتی تھی۔ اس غمگینی میں اک دلکشی اس اندوہ میں اک انبساط کی لہر تھی۔ لیکن ثروت کو کیا پتہ تھا کہ یہ کیا ہے۔ بس اک آگ سی سینے کے اندر لگی ہوئی تھی کہ پتہ لینے کو جی ہی نہ چاہتا تھا کہ کس نے لگائی بجز اِس کے جس نے لگائی ہے وہ آکر اسے بجھا تو دے۔ جب طبیعت ذرا ٹھکانے ہوئی تو ثروت کے کان میں گویا خاموشی نے آواز دی "جمیل"۔ یہ نام اب اس قدر دلکش ہوگیا تھا کہ اُس نے بار بار آہستہ آہستہ کہا "جمیل ...... جمیل ...... جمیل ...... تُو کہاں ہے کہ میرے ساتھ آکر کھیلے"؟

اتوار کا دن چھٹی کا دن تھا لیکن آج وہ پہاڑ کی طرح ٹالے نہ ٹلتا تھا۔ جوں توں کرکے وہ کٹا اور پیر کی خوشگوار صبح خوشیوں کے شادیانے بجاتی آئی۔ جمیل آیا اور انگوٹھی کو چپکے سے وہیں رکھ دیا جہاں پہلے تھی۔ اتنے میں بدرالنساء گول کمرے سے گزریں تو تپائی پر انگوٹھی کو پڑا پایا۔ ثروت کو آواز دی وہ آئی تو کہا کہ انگوٹھی کہاں ہے اُس نے کہا اماں میں کیا ہر وقت انگوٹھی دیکھتی پھرتی ہوں کہیں میرے کمرے میں ہوگی؛ پرسوں ہی مل گئی تھی۔ جمیل نے ذرا

حیرت سے ثروت کی طرف دیکھا اُدھر ثروت بھی بن دیکھے نہ رہ سکی اور شرم سے سر جھکا لیا۔ اُس وقت جمیل کے دل کی دزدیدہ لیکن خوف زدہ مسرّت کا کچھ وہی اندازہ لگا سکتا ہے جس نے ہند کی مجبور معاشرت میں اپنی دلبر حسینہ کے متعلق پہلی بار محسوس کیا ہو کہ اُسے بھی اُس سے پیار ہے۔ بدر النساء نے ذرا جھنجھلا کر اور انگوٹھی دکھا کر کہا تو پھر اِسے یہاں کوئی چھلاوا لے آیا؟ ثروت میں دیکھتی ہوں کہ جوں جوں تم بڑی ہوتی ہو تمہاری عقل غائب ہوتی جاتی ہے۔ کسی روز دن کو تارے نہ دیکھنے لگ جانا کہیں کہہ دو اندھیری رات میں بھی مجھے چاند نظر آتا ہے۔

ثروت کیا جواب دیتی کہ وہ واقعی دن کو تارے دیکھنے لگی تھی اور واقعی اُس کی اندھیری راتیں آن کی آن میں کسی چاند کی چاندنی سے پُرنور ہو چکی تھیں۔

عرب کہتے ہیں کہ کسی شے کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ دوسروں کی نظر میں محبت والوں کا یہی حال ہوگا مگر اپنے آپ میں تو اسیرِ محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کسی شے کی محبت اُسے سرشار و بیدار کر دیتی ہے۔ اُس کی بیقراری میں اک اطمینان اور اُس کی بے اختیاری میں ایک وجدان رونما ہوتا ہے۔ اُس کے سازِ دل کے سارے تار محوِ اہتزاز اور اُس کے دماغ کی ساری قوتیں ایک برقی کل کی طرح متحرک و مرتعش ہو جاتی ہیں۔ باہمی محبت کے احساس سے روح و رواں میں گویا ایتھر کی ایک رو دوڑ جاتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو کر کمزوریاں خوبیوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔ جمیل کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کا تخیل اُسے ایک آسمانی فضا میں لے گیا ہے جو اُس کے شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج رہی ہے۔ اگر موقع ہوتا تو اُس کے نطق کی شیرینی اُس کے تخیل کی پرواز اُس کی عقل و فہم کی سلامت روی اُس وقت دنیا کو حیرت میں ڈال دیتی کہ اس نوعمر میں یہ پختگی کہاں سے آئی اور کیوں کر؟ اُدھر ثروت جو یوں بھی حسن کی ایک پتلی تھی اب ایک حسن کی دیوی بن گئی۔ عورت جب کامران محبت کی آمد آمد کا احساس کرے تو اُس کا حسن دوبالا اور اُس کی رعنائی پہلے سے بدرجہا زیادہ شیریں ہو جاتی ہے۔

ثروت نے جمیل کو دیکھا جمیل نے ثروت کو۔ محبت کی معجزنمائی نے دونوں کو ششدر کر دیا۔ ثروت کبھی ایسی حسین نہ تھی جیسی آج۔ دنیا جہان کا رنگین و زرین جمال اُسکے چہرے میں چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور اُس کی رسیلی آنکھیں جمیل کے لئے اُس کے نرم و نازک دل کی ترجمان بن گئی تھیں۔ اور جمیل جو یوں اک معمولی شکل کا لڑکا تھا آج اُس میں اس قدر دلکشی پیدا ہو گئی تھی کہ ثروت جی ہی جی میں کہہ رہی تھی کہ آج وہ کہاں سے ہو کے آیا ہے کہ وہ کچھ اَور کا اَور معلوم ہو رہا ہے۔

کیا یہی نہ تھی تکمیلِ محبت؟ اُس زرّیں ساعت میں جمیل و ثروت نے معراجِ مسرّت کو پالیا تھا!

لیکن قدرت کو محبت کی یہ آسانیاں منظور نہ تھیں۔ زمانے کو مسرت کا یہ قیام و قرار ایک نظر نہ بھایا۔ کرۂ فلک نے گردش کی اور ایک نئی صورتِ حالات پیشِ نظر کر دی۔

آیندہ دو تین ماہ میں ثروت کے لئے وہ پیام آئے جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں + بدر النساء عقاب نظر تھی اور بات بات میں بال کی کھال اُتارتی تھی۔ لڑکی کا رُخ تاڑ گئی اور ایک دن اُسے تخلئے میں لے جا کر خوب سرزنش کی اور کہا کہ ناسمجھ نہ بنو۔ تمہاری ساری عمر کا معاملہ درپیش ہے۔ اب ماشاءاللہ تم جوان ہو۔ جوان لڑکیاں گھر میں بٹھائی جائیں تو شریفوں کی ناک کٹ جائے اور ساری کی ساری آبرو خاک میں مل جائے + یاد رکھو لڑکیاں لڑکوں کی طرف نہیں دیکھا کرتیں یہ شریف حیادار بچیوں کا کام نہیں۔ لڑکے لڑکیوں کی طرف دیکھ لیں تو مضایقہ نہیں۔ پھر لڑکے پیام بھیجتے ہیں اور ماں باپ سوچ بچار کر کے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہماری لختِ جگر کے لئے کونسا نوجوان سب سے زیادہ موزون ہے؟ خوش اطوار نیک بخت لڑکی جانتی ہے کہ میرے ماں باپ سے زیادہ مجھ سے محبت کرنے والا اس دنیا میں نہ کوئی ہے نہ ہو سکتا ہے سو وہ خداوندِ کریم کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے۔

اور اِسی طرح یہ خانگی تقریریں اور ملامتیں روز بہ روز جاری رہیں۔ کبھی دھمکیاں کبھی ترغیبیں کبھی لاڈ پیار کبھی دم دلاسے یہ گوناگوں عذاب برابر جاری رہا۔

اور جمیل ابھی وہیں مقیم تھا اور ثروت کو بدستور دیکھنے پر مجبور تھا اور ثروت کی نگاہیں بھی ہمیشہ نیچی نہ تھیں۔ اگرچہ دونوں میں کبھی کوئی محبت کی گفتگو نہ ہوئی جس سے دوسرے کا مافی الضمیر علانیہ طور پر ظاہر ہو جاتا + ان پیاموں اور بحثوں سے اُدھر جمیل اِدھر ثروت بے قرار و بدحواس ہو گئے۔

آخر جمیل نے لاہور چھوڑ دیا۔ ثروت ماں سے شرافت کی صفات سن سن کر بے حال ہو رہی تھی کہ سوائے اس کے کہ شریف لڑکی بنوں میں اَور کر ہی کیا سکتی ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت میں ثروت کا کرب و اضطراب جمیل سے بھی کہیں بڑھ کر تھا۔ دن کی آہیں اور رات کی اشک باریاں اُس کی ماں سے بھی نہ چھپی تھیں گو باپ کو ان سب حالات کی مطلق خبر نہ تھی۔ لیکن ماں اپنی جنس کی کمزوری اور اطاعت گزاری سے بخوبی واقف تھی۔ اُس نے شوہر کی غائبانہ جھوٹی سچی رائے بھی لڑکی کے آگے پیش کر دی۔ چند مہینوں رو دھو کر ثروت گویا مضمحل ہو کر اپنی قسمت کے قدموں میں گر پڑی۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ جو آپ کی مرضی ہو وہی میری خوشی ہے۔ میں اپنے دل کو بھینچ ڈالوں گی مگر اداے فرض سے کبھی نہ چوکوں گی +

ماں نے آبدیدہ ہو کر بیٹی کے سر پر پیار کیا کہ میری ثروت! ہماری ساری خوشیاں تیرے ساتھ ہیں۔ خدا تجھے خوش نصیب کرے اور تُو ہمیشہ پھولے پھلے!

---

(۶)

جمیل کالج کے ایک برآمدے میں کھڑا ایف اے کی فہرستِ نتائج میں اپنی کامیابی دیکھ کر مُسکرا رہا تھا کہ سجاد نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور امتحان کی کامیابی پر مبارک باد دے کر اُس کے ہاتھ میں ایک خط دیا کہ یہ لو تمہاری دلبر کا محبت نامہ، تمہاری شبانہ روز دماغی کوفت پر انعام + والدہ کا خط تھا جمیل نے وہیں کھول کر دیکھا تو اُس میں مادرانہ شفقت کا طول طویل اظہار تھا اور اخیر میں ایک کونے میں لکھا تھا کہ منظور و ثروت کی منگنی ہوگئی ہے جمیل کا رنگ بالکل متغیر ہوگیا اور چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ سجاد نے کہا خیر تو ہے۔ جمیل نے جواب دیا ہاں یوں تو سب بخیریت ہیں۔ سجاد نے کہا پھر؟ (اور جمیل کے ہاتھ سے لفافہ چھیننے کی کوشش کی) جمیل ہٹ کر علیحدہ ہوگیا سجاد آیا تو کہا بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ تم کو مبارک ہو۔ تمہاری پیشین گوئی پوری ہونی تھی سو ہوئی۔ ثروت کی منگنی ہو گئی۔ سجاد نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا کہ سارا کمرہ گونج اُٹھا۔ پھر جمیل کی پیٹھ پر خوب زور سے ہاتھ مار کر اُس کے کندھوں پر تھپکیاں دیں اور اُچھل اُچھل کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا کہ مجھ احمق کو افسوس ہو تو ہو لیکن یار تمہیں تو امرت مل گیا۔ واللہ تمہارے صوفیانہ ٹونے ٹوٹکے بڑے کارگر ثابت ہوئے۔ بھئی میں تم پر ایمان لے آیا۔ تمہیں اُس بھلی مانس سے پاگلوں کی سی محبت تھی لیکن تم دن رات اسی فکر میں مبتلا تھے کہ کہیں اُس سے تمہاری شادی ہی نہ ہو جائے۔ سو اب اُس کی منگنی ہوچکی ہے تم بالکل مامون و مصئون ہو اور اب کسی قسم کا خطرہ مطلق باقی نہیں رہا۔ اللہ اکبر کیسی کامیابی ہے! اُدھر تعلیم کے ایف اے میں پاس اِدھر محبت کے میٹرک میں فیل۔ سبحان تیری قدرت! تو نے صوفیوں کو اپنی قدرتِ کاملہ کی کیسی کیسی نشانیاں دکھائی ہیں!

جمیل کا دل جو کبھی محبت کے میدان میں کسی پہاڑی ندی کی طرح بہتا تھا اب خشک ہو کر اُس میں مایوسی اور خشک مزاجی کے سنگ ریزے نکل آئے جن کی دل میں پوجا کرنا بھی اب منتی عقل مندوں کے نزدیک ایک اخلاقی جُرم ٹھیرا۔ اب وہ اکثر تن تنہا چہل قدمی کے لئے جانے لگا لیکن اُس کے سال میں کبھی کبھی ایسے دن آتے تھے جب وہ محض خاموشی کی تنہائی اور قدرت کی عزلت سے متاثر ہو کر دنیا و مافیہا سے بلند اور اُس کی جکڑ بندیوں سے

قطعی بالا بالا پرواز کرنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی ایسے پاکیزہ لمحات اپنا پرتو ڈالتے تھے کہ دل کی اندرونی تاریکیاں اُن سے یکسر فروزاں ہو جاتی تھیں۔ ایک روز ایک ایسی ساعت میں اُس نے قوتِ نفس کی وجدانی آواز سنی کہ اُٹھ اور جاکر اُن دوُر دور پھیلے ہوئے خزانوں کو سمیٹ لے جو مشیتِ خداوندی نے فطرت کے ہاتھوں دنیا کے کونے کونے میں چھپا رکھے ہیں!

اُس کی زندگی میں ایک تبدیلی سی آگئی۔

جمیل کے دل میں ثروت کی محبت تو جیسی تھی ویسی رہی لیکن اس بظاہر مردہ پھیرو پر اب اُس نے چمن چمن سے گلچینی کر کے رنگ رنگ کے پھولوں کا اک انبار لگا دیا کہ دنیا کے مردار خواروں کی بھیانک نظریں اُس پر نہ پڑیں۔ وہ شعر و ادب اور رقص و موسیقی کے چمنستان میں جانکلا اور اُس نے اپنا دامن ننھی ننھی پتیوں اور رنگیں پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں سے بھر لیا۔ ہر روز وہ ایک نئی بیاض کو کبھی کسی شاعر کی بوقلمونیوں کبھی کسی نثار کی خیال آرائیوں کبھی کسی نقاش کی نقش نگاریوں اور کبھی کسی فلسفی کی حقیقت نمائیوں سے زیب و زینت دیتا۔ وہ ان بیاضوں کو ایسی خوش نمائی اور حزم و احتیاط سے پیراستہ کرتا گویا وہ ان نادر الوجود مسوّدات کو کسی کتب خانے یا عجائب گاہ میں پیش کرنے والا ہے۔ یہ تھا اُس کے دل کا عجائب خانہ جس کی خالی غیر آباد عمارت کو اب اُسے اپنے ذہنی و قلبی نقش و نگار سے یکسر رشکِ عالم بنانا تھا۔ محبت کی ناکامی نے اُسے مفلس بنا دیا تھا اب علم و فن کے حصول سے اُسے ایک غیر فانی دولت پیدا کرنی تھی۔ یہ ایک بڑے دل و دماغ کا کام تھا اور جمیل اس کام میں پورا اترا۔ وہ خوش تر قوی تر اور زندہ تر ہو گیا۔ اُس کی خوشی ایک ذہنی خوشی، اُس کی قوت ایک دماغی قوت اور اُس کی زندگی ایک روحانی زندگی ہو گئی۔

کچھ عرصہ ہوُا جب حمید نے ثروت کی منگنی سے پہلے منظور کے کچھ حالات اور اُس کی راے جمیل سے دریافت کی تھی تو جمیل نے بے کم و کاست اپنے خیالات کو بیان کر کے منظور کو ہر طرح قابلِ قبول ظاہر کیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد ثروت اور منظور کی شادی کی تیاریاں ہوئیں۔ دعوتی رقعے سب عزیزوں دوستوں کو پہنچے۔ منجملہ اُن کے جمیل بھی تھا۔ نارواداری رسیدہ زاہدوں کو شاید اصرار ہو لیکن بیچارے جمیل سے ہم کیونکر اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ ثروت کے نیلام میں آخری بولی دینے والے کی خوشیوں کے جشن میں بخوشی شریک ہوتا۔ وہ معاشرتی مواقع میں رسمی شرکت سے بہت گریز کرتا تھا بالخصوص جب اس کے جذبات اس معاملے میں ایسے نازک تھے کہ ذرا سی ٹھیس سے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا ڈر تھا۔ یہ جذبات اُسے غایت درجہ عزیز تھے اور اُن کی صیانت کے لئے اُس نے اک دروغِ مصلحت آمیز کی آڑ میں اپنے تئیں بچانا چاہا۔ عین عقد کی رات اُس نے لاہور تار بھیجا کہ میں علیل ہوں لیکن اس خوشی میں سب کے ساتھ شریک ہوں گو اِس غیر حاضری میں اس نے اپنے مفصّل تہنیت نامے میں ایک بظاہر پُر خلوص معذرت بھی پیش کی لیکن منظور اور اُس

کی وجہ سے ثروت بھی اُس کی اس بے اعتنائی سے ذرا رنجیدہ خاطر ہوگئی اور یہ غلط فہمی روز بہ روز بڑھتی گئی ۔

منگنی کے چھ ماہ بعد ثروت کی شادی ہوگئی ۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی ۔ پنجاب بھر کے چیدہ چیدہ معززین شریکِ دعوت تھے ۔ بڑے بڑے ریش دار شاعروں نے سہرے پیش کئے ۔ دعوت ایسے پیمانے پر کی گئی تھی اور "تناولِ ماحضر" اس قدر مکلف و مرغن و ملذذ اور متنوع و (بقولِ شخصے) مفصل تھا کہ جتنے لوگ دعوت سے گھر کو واپس گئے اُن میں سے اکثر نے دو دو تین تین وقت کا کھانا نہ کھایا اور بعض تو دو دو ہفتے تک سند یافتہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے ٹیلیفون کھڑکاتے رہے ۔ اِدھر عزیزوں اور منتظموں میں سے کئی صاحبوں کے گلے پھولے ہوئے تھے ، آنکھیں دکھنے آگئی تھیں اور چہرے ہڑ کی طرح سوکھے ہوئے اور چھوارے کی طرح سیاہ ہو گئے تھے ۔ یعنی عملی طور پر ثابت ہو گیا تھا کہ دعوت ہر طرح سے کامیاب اور پُر اثر رہی +

علی گڑھ میں بی اے کا امتحان پاس کرکے جمیل چار سال کے بعد گھر واپس آیا ۔

اِس دوران میں جب کبھی اتفاقی طور پر اُسے "علیم منزل" میں قیام کرنا پڑتا وہ یا تو ثروت کے سامنے آنے سے پرہیز کرتا اور اگر کبھی ایسا ہو جاتا تو اپنے رویے پر ایک مصنوعی رنگ چڑھا لیتا ۔

گھر واپس آنے کے چھ ماہ بعد نعیم الدین نے کئی ہفتوں کی مسلسل کوشش کے بعد جمیل کو ریل میں اے ٹی ایس کا عہدہ دلوا دیا ۔

ایک دن جمیل کی ہمشیرہ نے اُسے اپنے بچپن کے انداز سے کہا کہ بھائی اب تو ہمیں اپنی بھاوج کا چاؤ ہے ۔ گھر آپ کی غیر حاضری میں کس قدر سُونا تھا اب اُسے آباد و شاد کیجئے ۔ جمیل نے ہنستے ہوئے کہا جمیلہ گھر میری غیر حاضری میں سونا تھا تو تم کوئی سی ایک بھاوج لے آتیں ۔ بھلا میرے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی ! جمیلہ علیحدہ ہوگئی تو خورشید بیگم اپنے بیٹے کے پاس آئی اور کہنے لگی مرے اکلوتے بیٹے ! امتحان اور معاش میں کامیاب ہو کر تم نے باپ کا گھر روشن کیا ۔ کیا تم اب اپنی ماں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ کرو گے ؟ جمیل نے مسکرا کر کہا اماں ! میں وہ برف کہاں سے لاؤں جس سے تمہیں ٹھنڈک پہنچے ؟ ماں بولی بیٹا برف کا تو سب انتظام ہو جائیگا مگر تم بھی تو ہاں کہو ۔ جمیل نے جواب دیا اماں ! ہیں جس طرح ہوں بہت خوش ہوں میں نہیں جانتا شادی کی یہ نئی بلا کیا اثر پیدا کرے گی ۔ خورشید بیگم نے بزور کہا جمیل شادی کو بلا نہ کہو اس سے تمہارا گھر آباد ہوگا اور تمہارے بزرگ باپ کی نسل قایم رہے گی جمیل یہ سن کر باہر چلا گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ پہلے کی بہ نسبت ایک زیادہ عملی آدمی بن رہا تھا ۔ اُسے بھی اُسی روز سے دُھن لگ گئی کہ اِس معاملے کو کسی طرح طے کرنا چاہئے ۔ کبھی جی سے پوچھتا کہ اگرچہ ثروت مجھے بھول چکی ہے اور اُسے بھول بھی جانا چاہئے لیکن کیا میں ثروت کو

بھولا ہوں ؛ پھر کہتا کہ اگر نہیں بھی بھولا تو اُسے بھول جانا میرا اخلاقی فرض ہے۔ کبھی سوچتا کہ تن تنہا رہنا میرے والدین کے لئے باعثِ کرب اور یوں میرے لئے بھی موجبِ اندوہ ہوگا ۔ پھر جی سے پوچھتا کہ جس طرح عمر میں اور ارادے کئے ہیں کیا اُسی طرح ایک روز فیصلہ نہ کرلوں کہ ہاں شادی کرلوں گا اور پھر والدہ سے جاکر کہہ دوں کہ برائے خدا مجھے اُس نیک بخت کی شکل تو دکھا دو۔

اِسی دوران میں ایک روز نعیم الدین باغ کی سیر کو جاتے ہوئے بیٹے کو ساتھ لے گئے اور اُس سے یہ ساری بات کی کہ میری تمنا ہے کہ اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو تم اپنی خالہ زاد بہن عذرا سے شادی کرلو۔ وہ بڑی صالح و نیک بخت اور عقلمند لڑکی ہے۔ اگر ہماری طرف سے ذرا دیر ہوئی تو اُس کے لئے پیام چلے آرہے ہیں پھر ایسی لڑکی مشکل سے ملے گی جسے تم مل چکے ہو یا دیکھ سکتے ہو۔

جمیل خاموش رہا پھر تھوڑی دیر کے بعد والد سے کہا کہ جیسے آپ کی مرضی میں آپ کے حکم پر راضی ہوں۔

جمیل اپنے ضمیر کو آئینے کی طرح صاف و روشن رکھنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کی تربیت تعلیم کے اثر اور محبت کے سوز سے اُس کا دل گداز ہوچکا تھا۔ اُس نے اُسی روز سے ارادہ کرلیا کہ اب میری تمام توجہ اور محبت صرف عذرا کے لئے وقف ہوگی !

جمیل اپنی خالہ محمود بیگم کے گھر آنے جانے لگا اور گویا موسیو کوے کے "خود تاثیری" کے اصول پر عمل کرکے عذرا کے آگے پیچھے جی ہیں اُس کا نام دُہرانے لگا اور اکثر خیال کرنے لگا کہ عذرا بڑی اچھی لڑکی ہے ۔

اور واقعی عذرا گو گلعذاروں میں نہ تھی لیکن ایک زبردست سیرت کی مالک ضرور تھی۔ وہ خاموش مزاج دور اندیش اور خود دار تھی۔ وہ تکلیفوں میں حوصلہ مند ضروریاتِ آرام و آسایش میں کفایت شعار اور لباس و خانہ آرائی میں سادگی پسند تھی۔ وہ تخیلات سے عاری اور معمولات کی عادی تھی۔ وہ دنیا کو اس طرح دیکھتی تھی جیسی کہ وہ نظر آتی ہے وہ جمیل کی طرح دنیا کے خاکے کھینچ کھینچ کر اُن میں رنگ بھرنے کی مشتاق و خوگر نہ تھی۔ لیکن گو غیر معمولی خیالات اُس کی نظر میں پسندیدہ نہ تھے وہ اپنے معمولی خیالوں اور باتوں پر اک پہاڑ کی طرح قایم تھی۔ جمیل کی طرح اُس کی فطرت میں نہ صحرا کی وسعت تھی نہ ندیوں کی روانی اور نہ سمندر کا جوش و خروش۔ اُس کے چہرے کا نام متانت تھا اور خاموشی اُس کی آنکھوں میں بستی تھی۔ اُس کے خیالات اور اُس کی پسند ناپسند کا پتہ لگانا آسان کام نہ تھا کیونکہ وہ منصوبہ بندی سے متنفر اور خیال آرائی کا مضحکہ اُڑاتی تھی جس سے یہ معلوم کرنا کہ اُس کے اپنے خیال کیا ہیں انتہا درجہ دشوار ہوجاتا تھا۔ وہ وفادار تھی اور جہاں اُس کی مخصوص ہٹ درمیان میں نہ آجاتی وہ ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار تھی۔

اپنے گاؤں میں وہ یتیموں کی سرپرستی اور رانڈوں کی دلجوئی کرتی اور غریبوں کے لئے اُس نے ایک چھوٹی سی

درسگاہ بنائی جس میں وہ اور اُس کی ایک غریب سہیلی اُنہیں لکھنے پڑھنے اور سینے پرونے کی تعلیم دیتیں۔

اُسے اردو فارسی میں خاصی لیاقت تھی اور حساب بھی اُس نے دلچسپی سے سیکھا تھا۔

عذرا کی صورت زیبا اُس کا قد چھوٹا اُس کی چال باترتیب اور اُس کی آواز دھیمی تھی۔

ملازمت ملنے کے پانچ ماہ بعد جمیل کی منگنی اور ڈیڑھ سال بعد اس کی شادی ہوگئی۔

عذرا سے مل کر جمیل گویا ایک ایسی شخصیت سے دوچار ہوا جس میں اُس میں بعض باتوں میں بُعدِ مشرقین تھا لیکن جمیل کی کمیاں عذرا کی خوبیاں تھیں اور سُت! یہ قدرت نے جو عموماً فطرتِ انسانی کی خواہشات کے جادۂ زریں پر اپنے واقعات کی ریل گاڑی کو چلانا پسند نہیں کرتی بلکہ اُسے اپنے ہی بعض ناقابل الفہم موضوعہ اصولوں کی آہنی سڑک پر رواں کرتی ہے۔ اسی لئے اِس ندرت پرست نوجوان کو ایک معمول پسند رفیق زندگی دی تاکہ روزمرہ کے افکار و اعمال کی آمد و شد میں اُن کی باہمی زندگی کا ترازو متوازن و یکساں رہے +

عذرا جمیل کو عموماً یہ کہہ کر ایک عملی زندگی کی ترغیب دیتی کہ تمہاری "سادھوانہ" قابلیت اور تمہارا "گاندھیانہ" تخیل کس کام کا ہے جب دنیا کو اُس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے۔ اگر انسان ایک خیالی نصب العین اور ایک مثالی محبت کے تخیلات میں ذہن ہی ذہن میں اپنی زندگی گزار دے تو اس دنیا میں اُس کے آنے اور رہنے سہنے کی غرض ہی کیا تھی؟ اُدھر جمیل کی طبیعت بجائے آگے بڑھ کے آنے کے پیچھے ہٹ کے چھپنے کی تھی۔ وہ اپنی خلوت سے محبت کرتا تھا۔ وہ دن کی روشنی سے گھبراتا تھا۔ اُس کی آنکھیں راتوں کی چاندنی کو ڈھونڈتی تھیں۔ پھر بھی عذرا کی "عملیت" کا اک خاموش اثر جمیل پر ہونے لگا اگرچہ اُس کی سچی عظمت کا راز اُس وقت جمیل پر کُھلا جب آیندہ بعض دشوار موقعوں پر اُس نے جمیل کو خاموشی کے ساتھ زندگی کی سیدھی راہ دکھادی۔

کیا جمیل کے دل سے ثروت کی محبت محو ہوچکی تھی؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف یہ سوال کرینگے کہ کیا انسان اپنے جذبات و تصورات کا مالک و حاکم ہے؟ اور کیا اُس کے دل کا کوئی جذبہ اور وہ بھی اک حسین و پاک جذبہ قطعی طور پر مٹ سکتا ہے؟ اور پھر کہیں گے کہ انسان کو خود اپنی ہی قلبی حالت سے صحیح آگاہی نہیں۔ وہ اپنے دل کو الٹ پلٹ کر دے بعض خیالات کو اُس میں سے نکال ڈالے لیکن اُن رنگوں کو کیونکر دھو ڈال سکتا ہے جو اس جامِ جہاں نما کے بلوریں عنصر کا جزو بن چکے ہیں؟

جمیل کی شعریت عذرا کی "فطریت" سے دوچار ہوئی۔ جمیل نے عذرا کو شاعرانہ نگاہوں سے دیکھا عذرا نے جمیل کو فطری طریقے سے لیکن دونوں کی نگاہوں میں سچی محبت تھی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ عذرا کو اُس کی ماں کی نصیحت تھی کہ آج کل کی

بعض منہ زور لڑکیوں کی طرح شوہر سے زیادہ بحث مباحثہ نہ کرنا ورنہ وہ مانتا بھی تمہاری بات نہ مانے گا۔

اُدھر جمیل ایک "امیل شوہر تھا سوائے اس کے کہ جہاں وہ اپنی فلک پروازیوں میں محو ہو جاتا وہاں عذرا عموماً اُسے زمین کی طرف کھینچ نہ سکتی تھی۔ جمیل چونکہ کمزور طبع تھا اسلئے بعض وقت وہ اِدھر اپنی اماں اور اُدھر اپنی زوجہ کی اینچا تانی میں گرفتار ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے ایسے مواقع اکثر پیش نہ آتے تھے۔

شادی کے ایک سال بعد جمیل کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام دادا نے عزیز احمد رکھا۔ اِس سے جمیل کے والدین کی نگاہ میں اُس کی بیوی کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور جمیل اور عذرا کے تعلقات اور بھی زیادہ خوشگوار و استوار ہوتے گئے۔

اِس کے دو سال بعد شیخ نعیم الدین کا انتقال ہو گیا۔ نعیم الدین نے اپنی عمر کے پچھلے چند سالوں میں زمینوں اور مکانوں کی خرید و فروخت سے کافی جائداد پیدا کر لی تھی۔ پس نعیم الدین کی وفات پر جمیل ایک خاصا متمول شخص ہو گیا۔ اب بجائے علمی مشاغل کے وہ اپنے کاروباری معاملات میں منہمک رہنے لگا۔ ملازمت سے جو وقت بچتا اُسے اُن کی نذر کرتا۔ تعجب تھا کہ باوجود تخیل پسند ہونے کے کاروباری حیثیت سے وہ ناکام نہ رہا۔ جمیل و عذرا کی سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کے باعث اُن کے پاس تھوڑی ہی دیر میں خاصا سرمایہ جمع ہو گیا۔

لیکن اس زر و دولت کا اثر جمیل کی سیرت پر بُرا پڑا۔ وہ روز بروز زیادہ زر پرست اور مادیات میں منہمک ہوتا گیا اگرچہ اُس نے کبھی خیانت سے کام نہ لیا اور نہ کسی کی دل آزاری کی۔ وہ عموماً اپنی بنک کی کتاب کا مطالعہ کرتا اور اپنی جمع کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں خوش ہوتا اور حساب کیا کرتا کہ کتنی مدت میں میرے پاس کتنا روپیہ جمع ہو جائیگا۔ اُس کی بیوی اُسے خیرات کرنے کی ترغیب دیتی لیکن علاوہ اس بات کے کہ وہ رسمی خیرات کے خلاف اپنے اصولی اعتراضات میں پناہ لے لیتا اُس میں ایک یہ عجیب و غریب عادت بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ سرزنش آمیز نصیحت پر بجائے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے عارضی طور پر عین اُس کے برعکس عمل کرنے لگتا تھا۔ اپنے کاروبار میں منہمک ہو کر اُس کی محبت کی بلند پروازی و تیزی کچھ کم ہو گئی۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُس نے اپنے خانگی تعلقات میں کسی طرح کی بے اعتنائی سے کام لیا۔ نہیں بلکہ عذرا کی مستقل مزاجی کے اثر سے اُن کی محبت روز بروز زیادہ پائدار و مستقل ہوتی گئی اور اُن کی باہمی زندگی زیادہ ساکن و مطمئن!

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیل و عذرا کی ساری زندگی اسی طرح باہمی مسرت و انبساط میں گزرے گی!

(باقی)

بشیر احمد

تحریکِ عمل

گر دیکھئے تو یاس، ہے انکارِ ذاتِ حق
امیدوارِ رحمتِ پروردگار رہ

آئیں گی تجھ کو راس نہ سرمستیاں تری
رہنا ہے اِس جہان میں اگر ہوشیار رہ

اب دشت گردیوں کے زمانے گزر گئے
ہنگامہ زائے محفلِ زیبائے یار رہ

شایانِ عاشقی نہیں مایوسئِ فراق
ہر دم رہینِ کشمکشِ انتظار رہ

جاتی رہیں گی حُسن کی بے اعتنائیاں
تو اپنے عہدِ شوق پہ خود استوار رہ

اچھی نہیں ہیں دوست یہ عزلت گزینیاں
تو حق و راستی ہے سدا آشکار رہ

یہ تیرہ خاکداں ترے دم سے چمک اُٹھے
رخشاں عمل کے چرخ پہ خورشید وار رہ

اہلِ نظر کو زندگیٔ پُرسکوں ہے موت
بحرِ جہاں میں موج صفت بیقرار رہ

پیدا ہر اک بہار میں اپنی بہار کر
اور بے نیازِ عہدِ خزان و بہار رہ

کِس نے کہا تجسّس و تدبیر چھوڑ دے
سنگِ عمل سے شیشۂ تقدیر توڑ دے

جلال الدّین اکبر

بکھرے ہوئے پھُول

اے عابد! جب رات کی نقاب پوش ملکہ واپس جانے لگتی ہے۔ جب آسمان کی آب گون چادر سے ملائک اُس کی پوشاک کے بکھرے ہوئے ہیرے چھننے لگتے ہیں تو رفتہ رفتہ افق پر سحاب کے رنگین وباریک پردے بھی پھٹ پڑتے ہیں۔ پردہ نشین ملکہ اُن میں روپوش ہوجاتی ہے اور صبح کا نور دنیا کو تابندگی بخشتا ہے۔ اُس وقت نازک نازک پھول بھی اظہارِ عقیدت میں مسکرا اُٹھتے ہیں مگر تو اُس وقت کہاں ہوتا ہے؟ مجھے سجدہ کیوں نہیں کرتا؟

اے عابد! تو جانتا ہے۔ صبح کس کو کہتے ہیں؟ صبح اُس دوشیزہ کا نام ہے جس کے دل میں معصومانہ جذبات پنہاں ہوتے ہیں اور جس کے سینہ سے دوشیزگی کا نور نکل کر، تیری آنکھ کی پھیلتی ہوئی بینائی کی طرح دنیا پر چھا جاتا ہے!

اسی لئے میں نے اس وقت کو اپنی عبادت کا بہترین وقت بنایا ہے!!!

اے عابد! اُس وقت، جب صحرائے اعظم کی دلکشی پر رفتہ رفتہ ایک ہولناک اندھیرا مسلّط ہونے لگتا ہے جب قمر اپنی بے حجاب اور عریاں روشنی کو مشرق کے اُفقی حصہ سے پھیلاتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جب اُس کی روشنی ہلکے رنگ کی زرّین شراب بن کر کائنات کے ہوش وحواس پر غالب آتی جاتی ہے۔ جب سمندر آہستہ آہستہ چاندنی کا سآ نما نور اپنی آنکھوں میں لئے ہوئے متحرک ہوتا ہے۔ اور جب آسمان پر موتی بکھر جاتے ہیں۔ تو اُس وقت تو کن تاریکیوں میں چھپ جاتا ہے؟۔

آ اور اپنے معبود کو سجدہ کر!

اے عابد! یہی وہ وقت ہے۔ جسے میں نے اپنی عبادت کے لئے پسند کیا ہے کیونکہ شام دلکش اور دل افروز مناظر کا مخزن ہے!!!

اے عابد! جب رات کی تاریکی میں نقاشِ قدرت کے تراشے ہوئے نقش ونگار جھلملانے لگتے ہیں۔ جب دنیا کے تمام پہلوؤں پر سکوت کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ اور جب فرشتوں کی آرامگاہ اور نیک روحوں کے پاک محل میں بھی سناٹا چھا جاتا ہے۔ جب چاند کی روشنی دنیا میں یکہ وتنہا رہ جاتی ہے اُس وقت تیرے کلبہ میں نیند کا تیرہ وتار اندھیرا

کیوں چھا جاتا ہے؟

آہ کیا تو اس وقت کو نہیں جانتا؟

اے عابد! اُٹھ اور سرِ نیاز جُھکا دے!

یہی وہ وقت ہے جو میری عبادت کی آخری منزل ہے اور جس وقت سکوت اور سکون باہم گلے ملتے ہیں!

اے عابد! میری عبادت کے یہ اوقات "بکھرے ہوئے پھول" ہیں۔ انہیں چُن لے! موسمِ بہار گزرا جاتا ہے۔ پھر تو ان کی لڑیاں کب پروئے گا؟؟؟

تہذیب فاطمہ عباسی

کوائفِ دل

(۱)

خو کردہ ہے دل لطفِ خراشِ جاں کا — دل دادہ جراحتِ غمِ پنہاں کا
معلوم ہے درماں کی حقیقت اُس کو — وارفتہ ہے دردِ طلبِ درماں کا

(۲)

کرتا ہے بسر ہمیشہ روتے دھوتے — ہو جائے گی تسکیں اسے ہوتے ہوتے
نادان ہے دل، کبھی سمجھ جائے گا — سو ہی جاتا ہے بچہ روتے روتے

(۳)

کرتا ہے عجیب خواہشوں کا اظہار — لاتا نہیں ہیں زباں پہ حرفِ انکار
ازبس ہے عزیز مجھ کو خاطر اُس کی — ہادی مرا دل ہے ایک طفلِ بیمار

سیّد محمد ہادی حسین

وجدانیات

اظہارِ حالِ عجز محبت سے دُور تھا — اور اُس پہ یہ کہ حُسن تمہارا غیُور تھا

نغموں میں ڈوب ڈوب گئی تھی ہر ایک سانس — تو دل کی انجمن میں گل افشاں ضرُور تھا

نسبت ہی کیا ہے طور سے انوارِ یار کو — یہ تابشِ جمال ہے وہ رقصِ نُور تھا

اُن کی ہزار ضد کہ ہمیں چھیڑ کیوں دیا — میرا یہ ایک عذر کہ دل ناصبُور تھا

رنگینیوں میں ڈوب گیا لالہ زارِ دل — ہر چند تیری برقِ تجلّی سے دُور تھا

دل کی شکستگی سے نہ گھبرایئے حضُورؐ — یہ آئینہ ازل سے یونہی چُور چُور تھا

تیری طرف سے ظلم کی غایت نہیں رہی — میں کچھ نہ کہہ سکا کہ ادب کا وفُور تھا

میں قصۂ تباہیٔ دل عرض تو کروں — تم ہنس کے کہہ نہ دو کہ تمہارا قصُور تھا

غیروں سے تھے وہ محوِ سخن سادگی تھی یہ — دیکھا نہ آنکھ اُٹھا کے مجھے یہ غرُور تھا

عاؔبد کوئی حجاب نہ تھا شامِ وصل میں
اِک پردۂ تبسّمِ پنہاں ضرور تھا

عابد علی عاؔبد

محبت کی فتح

موسم بہار کی ایک صبح کو جب کہ ناصر کی عمر آٹھ یا نو سال کے قریب ہو گی وہ اپنے باغ میں سیر کے لئے آیا اور پھول توڑ کر رومال میں جمع کرنے لگا۔ دفعتہً اُس کی نظر ایک خوبصورت تتلی پر پڑی جو گلاب کے پھولوں پر اُڑ رہی تھی۔ ننھے گلچیں کا دل اُسے پکڑنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ وہ پھولوں کو زمین پر پھینک کر تتلی کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہؤا۔ اُس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ باغ کے آخری حصّہ میں جا پہنچا۔ وہاں اُس کے کوٹ کا دامن ایک خاردار جھاڑی میں اُلجھ گیا۔ اور وہ منہ کے بل زمین پر گر کر رونے لگا۔ باغ کے سامنے والی سڑک پر سے سلیم گزر رہا تھا۔ اُس نے ناصر کو گرتے ہوئے دیکھا تو فوراً اُس کی مدد کے لئے دوڑا اور اُسے کانٹوں کے جال سے رہائی دی۔ وہ خود بھی ناصر کا ہم عمر تھا اُس کے ہاتھ کانٹوں سے زخمی ہو گئے۔ ناصر نے اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم کیسے اچھے اور بہادر لڑکے ہو کیا تم میرے دوست بنو گے؟" وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اُس کا باپ بھی ادھر آنکلا۔ ناصر نے دوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے یہ تمام واقعہ سنایا۔ ناصر کا باپ سلیم کے پاس آیا اور بولا "میاں تم کس کے بیٹے ہو"۔ سلیم نے جواب دیا۔ "جناب میرے کوئی ماں باپ نہیں، لوگ کہتے ہیں تمہارے ماں باپ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ میں چچا کے پاس رہا کرتا تھا لیکن آج انہوں نے ناراض ہو کر مجھے گھر سے نکال دیا ہے"۔

خدا نے جہاں ناصر کے باپ کو ظاہری دولت اور عزت عطا کر رکھی تھی۔ وہاں اُس کے باطن کو بھی رحم، محبت اور فیاضی کے لاتعداد خزائن بخش دیئے تھے۔ اُس نے سلیم سے اس کے مفصّل حالات دریافت کرنے کے بعد اُسے پیار کیا اور کہا کہ تم میرے پاس رہو میں تمہیں ناصر کے برابر ہی تعلیم دلاؤں گا اور تمہیں اپنا بیٹا سمجھوں گا۔

دن گذرتے گئے، سلیم اور ناصر کی عمر کے ساتھ ہی ان کی محبت بھی ترقی کرتی گئی۔ وہ بچپن ہی سے ایک غیر معمولی طبیعت رکھتے تھے۔ عام لوگوں سے ملنا جلنا انہیں سخت ناگوار تھا۔

آخر وہ دن بھی آپہنچا جب انہوں نے اپنی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیا۔

سلیم کا چچا اور چچی کسی ناگہانی حادثہ سے دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ چونکہ اُن کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لئے سلیم ہی اُن کی جائداد کا مالک ہؤا۔ لیکن وہ پھر بھی ناصر سے جدا نہ ہؤا۔ انہیں دنوں ناصر کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا۔

باپ کی موت کے بعد ناصر نے شہر کو چھوڑ دیا۔ اور اپنے گاؤں میں جہاں اُس کا آبائی مکان تھا سکونت اختیار کی۔ سلیم بھی اپنی جائداد فروخت کر کے اُس کے ساتھ ہی چلا آیا۔

یہاں اُن کے کتب خانے میں ہزارہا نادرالوجود کتابیں تھیں جو ناصر کے باپ نے اپنی تمام عمر میں جمع کی تھیں اب اِن کا محبوب ترین مشغلہ کتب بینی تھا۔ جب اُن کا دل پڑھنے سے سیر ہو جاتا تو وہ باغ میں چلے جاتے۔ وہاں کسی کُنج میں بیٹھ کر کتابِ فطرت کے مطالعہ میں محو ہو جاتے اور پہروں قدرت کی رنگینیوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے۔

انہوں نے آپس میں یہ تحریری عہد کر لیا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو دوسرا اُس کے ترکہ کا واحد مالک ہو۔

ناصر کے ہمسایہ اکرم کے ہاں اُس کا ایک رشتہ دار وحید جو شہر میں رہتا تھا ملنے کے لئے آیا۔ ایک دن دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وحید نے کہا " ناصر اور سلیم کو ایک دوسرے سے کس قدر محبت ہے اور محبت بھی ایسی پائدار ہے کہ اٹھارہ سال کے عرصہ میں اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ جب سلیم ناصر کے پاس نیا نیا آیا تھا اُسی زمانہ سے میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ میرا مکان ان کے شہر والے مکان کے نزدیک ہی واقع ہے جہاں یہ پہلے رہا کرتے تھے ان دونوں کا باہمی اخلاص نظیر نہیں رکھتا یہی وہ سچی دوستی اور حقیقی محبت ہے جسے موت کے سوا دنیا کی کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔ بلکہ سچ تو یوں ہے کہ ایسی محبت موت پر بھی فتح پاتی ہے "۔ اکرم نے یہ سن کر شرارت سے ایک قہقہہ لگایا اور بولا " تو یہ آپ بھی دنیا پر کس قدر نیک ظن رکھتے ہیں۔ اجی! یہ محبّت وحبّت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب لوگ اپنی غرض کے لئے آپس میں خوشامد سے پیش آنے پر مجبور ہیں اور آپ جیسے خوش اعتقاد اسے محبت سمجھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی شخص کسی سے بغیر کِسی قرابت کے صرف بے غرض محبت کر سکتا ہے۔ ایسا آدمی جو خواہ مخواہ کسی غیر سے محبت کرے، پاگل، مجنون، دیوانہ ہے یہ دونوں بھی جانے کس غرض کے لئے ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ موت بھی ان کی محبت پر فتح نہیں پا سکتی مگر یاد رکھئے کہ یہ خاکسار بھی اس پر فتح پا سکتا ہے "۔

وحید۔ ہرگز نہیں، حقیقی محبت کبھی نہیں مٹ سکتی، تم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔

اکرم۔ بھئی خدا کی قسم، اگر میرا نام اکرم ہے تو چھ مہینے کے اندر آپ کو دکھا دوں گا کہ یہ محبت کیا حقیقت رکھتی ہے۔

وحید۔ اُونہہ۔

وحید نے اُس کی بات کو محض یاوہ گوئی سمجھا۔ لیکن وہ درحقیقت اپنے ارادہ کی تکمیل پر تُلا ہوُا تھا۔ اُس نے وحید کے رخصت ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔

وہ اکثر ناصر کے پاس آکر بیٹھتا اور ہمیشہ سلیم کی نسبت نہایت سادگی سے ایک نہ ایک ایسی بات کر دیتا کہ سلیم کی بات کا شبہ بھی ہوجاتی اور ناصر بھی اُسے نہایت نیک نیت آدمی سمجھتا۔ کچھ عرصہ تک تو ناصر پر چنداں اثر نہ ہوُا، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے دل میں سلیم کی طرف سے نامحسوس طور پر کدورت آنی شروع ہوئی۔ گو بظاہر وہ اُس سے اسی طرح پیش آتا، لیکن اُس کے دل کی گہرائی میں کہیں بہت دور ایک مبہم شبہ کسی زخمی سانپ کی طرح تاریکی میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اب اُس نے سلیم کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا شروع کیا، اُسے سلیم کی ہر پرخلوص بات میں ایک تصنع نظر آنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا اور افسوس کرتا۔ اب اُس کا دل مطمئن نہ تھا مگر وہ کبھی واضح طور پر یہ نہ سوچ سکا کہ اُس کا اطمینان کیوں جاتا رہا۔

اکرم نے یہ کام بھی شروع کیا کہ سلیم کی ایک تصویر ساتھ لے کر گھر سے چلا جاتا اور کئی کئی دن آس پاس کے گاؤں اور قصبوں میں پھرا کرتا۔ کوئی تین ماہ کی کوشش کے بعد اُس کا مقصد پورا ہوگیا۔ اُسے عشرت خاں نامی ایک ایسا آدمی مل گیا۔ جس کی صورت سلیم سے بہت ہی ملتی جلتی تھی۔ یہ ایک ذلیل و غریب آدمی تھا جو ہمیشہ نہایت ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کر کے اپنی بسر اوقات کیا کرتا۔ اکرم نے اس سے معاملہ طے کر لیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جس شام وہ گاؤں پہنچا اتفاقاً اس روز سلیم کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ سرِ شام ہی ناصر سے رخصت ہو کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

رات کے وقت اکرم ان کے مکان میں داخل ہوُا۔ اور ناصر کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ ناصر نے نہایت فکر سے اُسے بتایا کہ سلیم کی طبیعت خراب ہے۔

اکرم۔ (تعجب سے) اچھا مگر وہ تو کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بندوق میں کارتوس ڈال رہے تھے۔ کیا آپ کا ارادہ صبح شکار کو جانے کا ہے؟

ناصر۔ نہیں تو۔

ناصر یہ سن کر بہت حیران ہوُا۔ لیکن اُس نے اپنا تعجب اکرم پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ پھر اکرم باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "سلیم صاحب نے یہ بہت ہی اچھا کیا کہ رائے صاحب والا گاؤں خریدنے کا ارادہ کیا، ایک لاکھ میں یہ گاؤں بہت ہی سستا ہے"۔

ناصر۔ کیسا گاؤں؟ ۔ سلیم نے تو کوئی ارادہ نہیں کیا۔

اکرم - اجی وہی جو یہاں سے بیس میل شمال کی جانب واقع ہے۔ رائے صاحب اسے فروخت کردینا چاہتے ہیں۔
ناصر - تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ سلیم اس کے خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔
اکرم - مجھ سے رائے صاحب کا ایک ملازم ملا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تمہارے ہمسایہ سلیم ایک روز ہمارے آقا سے اس کے خریدنے کی نسبت گفتگو کرنے آئے تھے۔
ناصر - سلیم تو وہاں کبھی نہیں گیا۔
اکرم - آپ کو شاید اس لئے معلوم نہ ہوگا کہ پچھلے دنوں جب آپ دہلی تشریف لے گئے تھے۔ انہیں دنوں مسٹر سلیم وہاں گئے تھے۔
ناصر - ہاں یہی بات ہوگی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم اٹھ کر چلا گیا۔ ناصر آج ان نئی باتوں کو سن کر سخت متعجب ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ سلیم ایک لاکھ میں گاؤں کیونکر خرید سکے گا؟ اُس کے پاس تو صرف پچاس ہزار روپیہ ہے۔ کبھی وہ سوچتا کہ "پہلے جب کبھی میں ایک دن کے لئے بھی دہلی جایا کرتا تھا تو سلیم ہمیشہ میرے ساتھ ہی جاتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ خلافِ معمول ناسازئ طبع کا عذر کرکے یہیں رہا۔ اور پھر یہ بات بھی مجھ سے پوشیدہ رکھی۔ سلیم کبھی مجھ سے اپنا کوئی راز نہیں چھپایا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اُسے کیا ہوگیا۔ خیر میں صبح یہ بات تو اُس سے ضرور دریافت کروں گا"۔
وہ انہیں خیالات میں غرق ہوگیا۔

رات کو ایک بجے کے قریب جب تمام لوگ سو رہے ہیں۔ اکرم اور عشرت، ناصر کے مکان کے سامنے کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ عشرت شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں سلیم کی ایک نہایت عمدہ اور قیمتی بندوق ہے۔
اکرم - عشرت! دیکھو اُس کی صرف ایک ہی نظر اپنے چہرے پر پڑنے دینا۔ اگر اُس نے تمہیں اچھی طرح سے دیکھ لیا۔ تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ مگر ایسی جلدی بھی نہ کرنا کہ وہ تمہیں دیکھ ہی نہ سکے۔ بس، ایک نظر میں تو وہ ضرور تمہیں سلیم ہی سمجھے گا۔ واللہ اس وقت مجھے خود دھوکا ہو رہا ہے۔ ہاں! جو تدبیر میں تمہیں بتا چکا ہوں اُس پر نہایت دانشمندی سے عمل کرنا۔
عشرت - ارے صاحب! آپ مزے سے بیٹھے تماشا دیکھئے۔ کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔ میری زندگی انہیں کاموں

میں گزری ہے ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ سلیم کی بندوق اور لباس حاصل کر لیا ۔

اکرم ۔ ہاں اسی لئے تو میں نے اپنے آدمی کو ان کے ہاں نوکر کرا دیا تھا کہ وقت پر کام آئے ۔ اچھا خدا حافظ ۔

عشرت دبے پاؤں ناصر کے مکان میں داخل ہؤا ۔ اکرم کے آدمی نے دروازہ کھلا ہی رکھا تھا ۔ عشرت اُس کے پیچھے ہو لیا ۔ وہ اُسے ناصر کے کمرے کے سامنے چھوڑ کر چلا گیا ۔ عشرت اندر داخل ہؤا ۔ ناصر گہری نیند سو رہا تھا ۔ پلنگ کے پاس ہی تپائی پر ٹائم پیس پڑا تھا ۔ عشرت نے پہلے تو بندوق کا رُخ ناصر کے سینے کی طرف کیا اور پھر ایک ہاتھ مار کر ٹائم پیس تپائی سے نیچے گرا دیا ۔ اس آواز سے ناصر بیدار ہو گیا ۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں اس کی نگاہیں عشرت کے چہرے پر پڑیں ۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ کہا " سلیم " ۔ عشرت نے بندوق کو وہیں پھینکا ۔ اور نہایت سرعت کے ساتھ کمرے سے نکل گیا ۔

ناصر چند لمحوں تک تو سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ کیا ہؤا ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بجا ہوئے ۔ اُس نے کہا " یہ سلیم نے کیا کیا ؟ وہ میری جان لینا چاہتا ہے ! اُس سے اس کا کیا مقصد تھا " ؟ ۔ اُسے فوراً اکرم کی باتیں یاد آ گئیں ۔ اُسے خیال آیا کہ سلیم میرے روپے پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ۔ اس خیال سے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی ۔ وہ سر کو پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور یوں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا ۔ " اُف ! سلیم واقعی دغاباز نکلا ۔ آہ آج مجھ پر کس قدر تلخ حقیقت منکشف ہوئی ۔ میں نے کیا دیکھا جس کے دیکھنے کی مجھے کبھی اُمید نہ تھی ۔ کیا دنیا میں محبت کا یہی بدلہ ملا کرتا ہے ؟ "

وہ اُٹھا اور سلیم کی بندوق ہاتھ میں لے کر کہنے لگا " یہ بندوق میں نے اُسے اسی لئے تحفتہً دی تھی کہ وہ اس سے مجھی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے " ۔ دفعتہً اُس کے دل میں غیظ وغضب کا طوفان اُمنڈ پڑا ۔ اس شخص کے لئے جس سے اُس نے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کی تھی لیکن جو ایسا کمینہ نکلا کہ اس نے اس محبت کی کچھ قدر نہ کی ۔ جس کی پست فطرت اس محبت کو بالکل نہ سمجھ سکی ۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر چاروں طرف سلیم کو دیکھا لیکن اسے کہیں نہ پا کر وہ اُس کے کمرے کی طرف گیا ۔

سلیم دردِ سر کی شدت سے ابھی تک سو نہ سکا تھا ۔ وہ پلنگ پر پڑا کروٹیں لے رہا تھا ۔ ناصر کو دیکھ کر بولا " اوہ ناصر ! تم نے اس وقت کیوں تکلیف کی ۔ میں بالکل اچھا ہوں ۔ یونہیں سر میں خفیف سا درد ہو رہا ہے " ۔

ناصر ۔ (گرج کر) " اب تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے ۔ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا تھا ۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا کہ ایک دغاباز احسان فراموش یوں کسی بے گناہ کی جان لے ۔ اُس نے تمہارے ہی ہاتھوں مجھے بیدار کرا دیا ۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم صبح ہی یہاں سے چلے جاؤ ۔ چونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اس لئے میں تمہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچانا چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں کچھ انسانیت ہے میں تمہاری طرح حیوان نہیں ہوں"۔

سلیم نہایت تعجب سے یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بہتیرا ہی ناصر کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔ لیکن ناصر نے اسکی ایک بات نہ مانی۔

اس واقعہ سے ایک روز پہلے ناصر کو ایک گمنام خط ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ "سلیم تمہاری جان لینا چاہتا ہے" اس کے ساتھ ہی سلیم کو بھی اس مضمون کا ایک خط ملا کہ "ناصر اب تم سے بہت اکتا گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں گھر سے نکال دے۔ چنانچہ وہ عنقریب کسی حیلے کے ساتھ تمہیں اپنے سے الگ کردے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم خود ہی اسے چھوڑ دو۔ تاکہ اُس وقت ندامت نہ اٹھانی پڑے"۔

اس وقت تو ان دونوں نے ان خطوں کے مضمون کا خیال نہ کیا۔ لیکن آج انہوں نے ان پر یقین کر لیا۔ سلیم نے ارادہ کیا کہ جس طرح ناصر نے میری محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اب میں کبھی اسے صورت نہ دکھاؤں گا۔ اُس نے فوراً وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری شروع کردی اور صبح تک بالکل تیار ہو گیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہونے لگا۔ تو اُس کی آنکھوں کے سامنے گذشتہ اٹھارہ سال کا تمام نقشہ کھنچ گیا۔ اس نے بہتیرا ضبط کرنا چاہا مگر آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک چشمہ اُبل پڑا۔ وہ بڑی دیر تک روتا رہا۔ آخر اٹھا اور یہ سوچ کر کہ آخری مرتبہ ناصر کو بھی دیکھ لوں اُس کے کمرے کی طرف گیا ناصر کمرے میں نہایت اضطراب کے ساتھ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اسے اس وقت جو روحانی تکلیف پہنچ رہی تھی وہ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ سلیم اُس کے قریب گیا اور بولا "میں اُس محبت کا جو آپ نے آجتک مجھ سے کی تھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ اب آپ مجھے محبت کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس لئے میں آیندہ آپ کو کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ اپنے بے وفا دوست کو دیکھ لوں"۔ ناصر نے کہا "سلیم! اب اس دیدہ دلیری سے مجھے زیادہ تکلیف نہ پہنچاؤ، میرا دل پک گیا ہے، اب میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔ میں بہت ضبط کر رہا ہوں جو تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ مگر تم میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مجھے اور تنگ کر رہے ہو سلیم! اگر میں تمہاری بندوق اپنے کمرے میں گری نہ پاتا تو بخدا! مجھے تم پر اس قدر بھروسا تھا کہ میں اپنی آنکھوں کا بھی اعتبار نہ کرتا۔ مجھے تم پر ایسی امید نہ تھی بلکہ میں تو یہ بھی خیال نہ کرسکتا تھا کہ تم کبھی مجھ سے جُدا ہو گے"۔

سلیم نے ایک حسرت بھری نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں سے نکل کر وہ اُس ندی کے کنارے جو اُن کے مکان کے قریب ہی بہتی تھی، درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچا۔ یہ جگہ ان دونوں کو بہت پسند

تھی۔ اور اکثر شام کا وقت وہ یہیں گزارا کرتے تھے۔ اس نے ایک وداعی نظر اُس جگہ پر ڈالی اور باچشم نم وہاں سے چلا آیا۔
سلیم کی گاڑی جب وہاں سے روانہ ہوئی تو ناصر اسے کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ جب گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ پلنگ پر گر پڑا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک وہ یونہیں رویا کیا۔ لیکن پھر اُس نے سوچا کہ میں کس قدر بیوقوف ہوں جو اپنے دشمن کے لئے رو رہا ہوں۔ اُس نے تو اٹھارہ سال کے رشتۂ محبت کو دولت کی خاطر اس بے دردی سے توڑ ڈالا اور میرے دل میں ابھی تک اُس کی محبت باقی ہے۔ مجھے اب اسے بھول جانا چاہیئے"۔

سلیم نے قریب ہی ایک قصبہ میں رہنے کے لئے مکان لے لیا۔ اب اُسے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا تھا۔ اس کا مکان جس سڑک کے کنارے واقع تھا اُس پر سے وہ اور ناصر شکار کی غرض سے کئی دفعہ گزر چکے تھے۔ سلیم تمام دن کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھا کرتا۔ اس امید پر کہ شاید کبھی ناصر ادھر سے گزرے اور وہ اسے ایک نظر دیکھ لے۔ ہر دور سے آنے والی گاڑی پر اس کی منتظر آنکھیں جم جاتیں۔ اس کے تاریک دل میں اُمید کی ایک کرن چمک اُٹھتی۔ لیکن افسوس کہ اُس کی نگاہیں کبھی کامیاب نہ ہوتیں۔

ناصر نے سلیم سے جدا ہونے کے بعد گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ وہ نہ کبھی سیر کو جاتا نہ شکار کو۔ اکرم کبھی اُس کے پاس آتا اور نہایت ہمدردی سے کہتا "آپ کیوں اس قدر افسردہ خاطر رہتے ہیں۔ آپ کی صحت بہت خراب ہو رہی ہے خدا کے لئے اپنے حال پر رحم کیجیئے"۔ وہ جواب دیتا "اکرم! میرے دل سے اُس بے وفا کی محبت نہیں نکل سکتی جس نے میری زندگی میں داخل ہو کر چند سال کے لئے اسے نہایت خوشگوار اور پر لطف بنا دیا تھا۔ خواہ اُس نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن پھر بھی میں باوجود ہزار کوشش کے اُسے نہیں بھول سکتا"۔

ایک دن اکرم نے سوچا کہ اب وحید کو اپنا کارنامہ سنانا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی اُس نے وحید کے پاس جانے کی تیاری شروع کی دوسرے روز وہاں جا پہنچا اور اُس سے کہا "لو میں نے سلیم اور ناصر پر فتح پا لی ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے جا کر دیکھ آؤ کہ سلیم ناصر کے پاس نہیں ہے"۔ وحید کو یہ سن کر سخت رنج ہوا۔ لیکن اُس نے اکرم سے اپنا رنج چھپایا اور ہنس کر کہا "بھئی بڑے حضرت ہو۔ لیکن یہ تو کہو یہ ہوا کیونکر؟"۔ اسی طرح تدبیر کے ساتھ تمام بات اُس سے معلوم کر لی کہ کس طرح اس نے سلیم اور ناصر کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اکرم کے جاتے ہی وحید نے یہ تمام واقعہ ناصر اور سلیم کی طرف الگ الگ خطوں میں لکھ دیا۔
ناصر کو جب یہ خط پہنچا تو خوشی اور رنج کی دو متضاد کیفیتوں سے اس کی عجیب حالت ہوگئی۔ کبھی وہ اس بات سے

خوش ہوتا کہ سلیم بے گناہ ہے اور وہ دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے ملنے والے ہیں اور کبھی اس بات سے اسے رنج پہنچتا کہ اُس نے سلیم کے دل کو کس طرح توڑ ڈالا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اسی دن سلیم کے پاس جاکر اس سے معافی مانگے اور اسے پھر اپنے پاس لے آئے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کے ہاتھ میں ایک خط دیا۔ لفافہ پر سلیم کی تحریر دیکھ کر ناصر نے نہایت اضطراب سے لفافہ چاک کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔ "میں دنیا میں صرف چند گھنٹے کا مہمان ہوں۔ اور مرنے سے پہلے ایک بار آپ کو دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ آپ مجھے بھول چکے ہیں اور مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ آپ سے اس استدعا کے پورا ہونے کی اُمید رکھوں۔ لیکن میں آپ کو اُس بھولے ہوئے عہد محبت کا واسطہ دیتا ہوں (جب کہ آپ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور میری ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے) کہ میری آخری تمنّا پوری کر دیجئے"۔

یہ خط پڑھکر ناصر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ رونے لگا اور بولا "سلیم! خدا نہ کرے اب تم مجھ سے جدا ہو۔ خدا تمہیں زندہ رکھے"۔

ناصر گھبرایا ہؤا سلیم کے کمرے میں داخل ہؤا اُس نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا کہ سلیم اب آخری سانس لے رہا ہے۔ ملازم نہایت افسوس سے اپنے مہربان آقا کے زرد چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ڈاکٹر اُسے وحید کا خط سنا رہا تھا۔

ناصر کی طرف دیکھ کر سلیم نے کہا "ناصر! تم آگئے، میری روح تمہیں دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، اور تمہارے ہی انتظار میں وہ میرے جسم سے اب تک جدا نہ ہو سکی۔ اب میں اطمینان سے مرسکوں گا۔ یہ موت اور یہ چند روزہ جدائی مجھے سب ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ناصر! میری روح تم سے اب بھی جدا نہ ہوگی۔ میری محبت، میری دعائیں عمر بھر تمہارے ساتھ رہیں گی"۔

وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑا ہؤا۔ ناصر نے یہ کہتے ہوئے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا "سلیم مجھ بدنصیب کو معاف کر دو۔ مجھے تم سے اسی طرح محبت ہے، اور میں نے تم سے جدا ہونے کے بعد کبھی چین نہیں پایا"۔ سلیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم بے گناہ تھے۔ ناصر نے سلیم کو پلنگ پر لٹانا چاہا۔ لیکن سلیم کے بازو اُس کی گردن کے گرد سخت ہو گئے۔ ناصر نے بمشکل اُسے اپنے سے علیحدہ کر کے بستر پر ڈال دیا۔

سلیم ایک بے جان جسم تھا، مگر اُس کے سفید ہونٹ متبسم تھے۔ ناصر نے جھک کر اُس کی نیم وا آنکھیں بند کر دیں اور اُس کی پیشانی کو چوم لیا +

ع۔ ب

تیری یاد میں

آہ بھر بھر کے تجھے یاد کیا کرتا ہوں
دل کو اس طرح سے برباد کیا کرتا ہوں

میری آنکھوں میں رہے میرا ستارہ یارب
شب کو رو رو کے یہ فریاد کیا کرتا ہوں

تیرا فرماں تھا کہ اُلفت میں مری خوش رہنا
غم سے اپنے تجھے ناشاد کیا کرتا ہوں

جب سے میں تیری محبت میں گرفتار ہُوا
ہر گرفتار کو آزاد کیا کرتا ہوں

دلِ غمگیں کو ترے شاد کرے تاکہ خدا
غم زدہ جو ہیں اُنہیں شاد کیا کرتا ہوں

سنگ دل جو ہیں اُنہیں دل سے دعائیں دے کر
اُن کی بیداد پہ بیداد کیا کرتا ہوں

شام ہوتی ہے تو میں حُسنِ تصوّر سے ترے
دل کے ویرانے کو آباد کیا کرتا ہوں

اُسے معلوم ہے کیا شے دلِ بیدل ہے بہار
آہ بھر بھر کے جسے یاد کیا کرتا ہوں

بہار

سرابِ نظر

وہ تھیئٹر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا۔

رائیلے نے اُسے پکڑلیا اور اندر داخل ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے کہا "نہیں برونو! یہاں نہیں! طرب گاہوں میں اُس کی تلاش بے سود ہے"۔

مگر شکستہ دل ملاح نے جو اپنی بیوی کی جدائی میں دیوانہ ہو رہا تھا نہایت روکھے پن سے اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے چھڑالیا اور ایک عزمِ آہنی کے ساتھ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا " تم چاندی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گنوا کر اُسے ادھر اُدھر ڈھونڈھتے پھرتے ہو اور میں جس کا خزانہ لُٹ گیا اُس کو تلاش نہ کروں"۔

برونو اپنی بیوی کو عصمت کی دیوی اور نیکی کا فرشتہ سمجھتا تھا وہ اُسے تمام گرجوں اور خانقاہوں میں آبادی کے ہنگاموں اور جنگل کی عزلتوں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ برونو کا دوست رائیلے اُس کے اس جنون میں اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رائیلے کو معلوم ہو چکا تھا کہ میڈیلون اسی تھیئٹر میں اکٹریس کی حیثیت سے کام کر رہی ہے اور اس لئے وہ برونو کو ہر ممکن طریقے سے وہاں جانے سے روک رہا تھا۔ رائیلے کو یقین تھا کہ برونو اُس بیوی کو جس پر اُسے اس قدر حسنِ ظن ہے اِس پست حالت میں دیکھ بالکل ہی دیوانہ ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ اسے دوبارہ روک سکے برونو نے ٹکٹ والے کی طرف ایک سکہ پھینکا اور تماشائیوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

روشنی کے طوفان موسیقی کے شور، زروجواہر اور رنگ وزیبائش کے وفور سے برونو کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور اُس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ ہجوم کے درمیان جہاں خود اُس نے اپنے آپ کو لا پھنسایا تھا ایک ستون کی مانند کھڑا تھا۔ اُس کا بلند و بالا قد سب سے اونچا نظر آرہا تھا، اُس کی وحشت آمیز، درد مند آنکھیں ایک زخمی شیر کی طرح ہر طرف دیکھ رہی تھیں، اس کی قمیص کا گریبان کھل کر پیچھے کی طرف ہٹا ہوا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال لہریں لیتے ہوئے اس کے گندمی چہرے کے پرشکوہ اور سخت و درشت نقوش کی مخالف سمت چلے گئے تھے۔ وہ لوگوں کے ہنستے ہوئے ہجوم کے درمیان بالکل ایک صحرائی درندے کی مانند گھرا ہوا تھا۔

سٹیج پر پریوں کے ملک کا ایک نظارہ پیش کیا جا رہا تھا اور لوگ اُسی کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا

رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک اور گھنٹی بجی۔ اس دفعہ ایک ایسا نظارہ سامنے آیا جس میں جنگل اور پانی، سیمیں چشمے اور گلاب کے تختے دکھائے گئے۔ سفید پروں والی پریاں درختوں کی ٹہنیوں پر اُڑتی پھرتی تھیں۔ اور دوشیزہ لڑکیوں کی جماعتیں جن کے لباس دنیا کے ایک ایک پھول کی طرح ترتیب دیئے گئے تھے موسیقی کی ہر ہر لے کے ساتھ مل مل کر رقص کر رہی تھیں۔ ریوبیرا کے ماہی گیر کے لئے یہ سب کچھ حقیقی حیثیت رکھتا تھا۔ اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں حیرت آمیز خوف کے ساتھ اس نظارے کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے کند دماغ میں جادو کی وہ کہانیاں چکر لگا رہی تھیں جو اُس نے اپنے بچپن میں سنی تھیں جو اُن ملکوں کے متعلق تھیں جہاں اُس کے خیال کے مطابق کسی فانی انسان کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ وہ بالکل سیدھا کھڑا تھا، حیران، بے حس و حرکت۔ آواز کے زیر و بم، حرکات کی ہم آہنگی، اور روشنی کی جوت نے جو رات کی تاریکی میں سے یہاں آکر اُس کی نظر کو خیرہ کر رہی تھی اُس کے سر کو چکرا دیا +

اِس تمام عرصہ میں اُس کی نظر رقص کرنے والی ہزاروں لڑکیوں کے مجموعی حسن میں سے ایک ایک کے چہرے پر متجسسانہ پڑ رہی تھی ——— اُس چہرے کے تجسس میں جس کو وہ آج تک نہ پا سکا تھا۔

پھولوں کی کیاریوں کو پھاندتی ہوئی اور مخملیں بادوں کو طے کرتی ہوئی ایک عورت کی سراپا شوکت صورت نظر آئی جس کا لباس کنول کے پھول کی طرح سجایا گیا تھا۔ اُس کا جسم" لباس کے پھول" کی سفید اور سبز پنکھڑیوں میں بمشکل چھپ رہا تھا۔ اُس کے سنہری بال ایک جوئے زریں کی طرح لہرا رہے تھے اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں مسرت وانبساط سے ہنس رہی تھیں۔

کوریالس جب لپک کر" پھول لڑکیوں" کے حلقہ میں آئی تو ایسا معلوم ہؤا گویا وہ ابھی اپنے اُٹھتے ہوئے شباب کی فصلِ بہار میں ہے۔ اور جب اُس نے گانا شروع کیا تو اُس پر کسی بلبلِ خوشنوا کے ہلکے ہلکے اور میٹھے میٹھے نغموں کا گمان ہونے لگا۔

معاً اُس کے نغموں کو چیرتی ہوئی ایک آواز آئی" یہ وہی ہے"!

ایک لمحہ کے لئے وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں روشنی سے چمک رہی تھیں۔ اُس کا سینہ ابھرتا تھا اور گرتا تھا۔ پھر وہ ایک ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہؤا لوگوں کے سروں پر سے پھاندتا ہؤا اور ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا ہؤا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ کھڑی تھی۔

کوریالس کے لبوں کی موسیقی گنگ ہو گئی" پھول لڑکیوں" کا حلقہ اُسے اکیلے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں مجرمانہ ہراس سے بھر گئیں۔ وہ بے قوت اور بے حرکت اُس شخص کی طرف دیکھنے لگی جس کی عزت کو

اُس نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اُدھر سازندوں پر اور حاضرین پر ایک خوف آمیز خاموشی چھا گئی۔

برونو نے اپنی باہیں اُس کے لئے پھیلا دیں۔ اور اُس کی آواز خاموشی کو لرزاتی ہوئی نکلی "میڈیلون، میڈیلون! تم جنت میں ہو اور مجھے بھلا چکی ہو! کیا یہ حقیقت ہے"؟

اُس کا سارا جسم مرجھا گیا، اُس کے اعضا کی قوت سلب ہو گئی، وہ کانپ اُٹھا اور پھر ایک سکتے کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہجوم کے شور و غل اور متحیر حاضرین کی چیخ اور پکار میں کیا طاقت تھی کہ وہ اُس کے کانوں تک پہنچ سکیں۔ وہ صرف اُس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا جسے اُس نے اس سُنسان دنیا میں ڈھونڈھ پایا تھا ——— اُس عورت کی طرف جو اُس سے اجتناب کر رہی تھی اور اُس سے خوف کھا رہی تھی۔

وہ مجرمانہ دہشت جو برونو نے اس وقت اپنی بیوی کی آنکھوں میں دیکھی اُس کے دل و جگر کو ایک خنجر کی طرح چیر گئی اُس لرزا دینے والے خوف و ہراس کے ساتھ جو اس وقت اُس کے حواس میں رواں دواں تھا ایسا معلوم ہُوا کہ اُس کے ہوش پھر بجا ہو رہے ہیں۔ اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا، اِس طرح جیسے کوئی شیر ایک جانکاہ زخم کھا کر ایک آخری بار اپنے دشمن کو دیکھنا چاہے۔ اُس نے ایک نگاہ غصّے سے بھرے ہوئے اور طیش سے وارفتہ تماشائیوں پر ڈالی اور پھر ایک دفعہ اور اپنی بیوی کو دیکھا ——— اُس کے برف جیسے سفید اعضا کو، اُس کے سینے کو جو اُس کی زریں پوشاک میں سے کھلا ہُوا اُبھر اور گر رہا تھا، اُس کے رنگ آلود حسن کو جو نزدیک سے شباب کی تمام رعنائیوں سے معرّا نظر آتا تھا۔

اُس وقت اُس پر روشن ہُوا کہ یہ جنت نہیں بلکہ دوزخ ہے اور اِس روشنی نے اُس سرابِ نظر کو جو اُس کی آدھی زندگی تک اُسے دھوکا دیتا رہا چیر کر دو ٹکڑے کر دیا۔ اُس نے اُسے پکڑ لیا، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر اُس کے نرم و نازک جسم کو بھینچ ڈالا اور ایک چیخ کے ساتھ جو تمام لوگوں کے دلوں سے اس طرح گزر گئی جیسے وہ سب یک دل و یک روح تھے اُس نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔

"تم میری بیوی نہیں ہو گو تمہاری شکل و صورت ویسی ہی ہے! آہ، اے نابکار ظالم شیطان! تو میرا منہ چڑاتا ہے۔ آہ! تو نے اُس کے ساتھ کیا کیا جس سے میری روح محبت کرتی تھی؛ تو اُس کے اعضا سے زیاں کاروں کی آنکھوں کی دعوت کرتا ہے، تو اُس کا حسن شہوت پرست ہجوم کے درمیان لٹاتا ہے اور وہ ہونٹ جو صرف میرے چومنے کے لئے تھے تو اِن تماشائیوں کے سامنے پیش کرتا ہے! مجھے بتا! وہ روح کہاں ہے جس کی میں پرستش کرتا تھا؛ وہ زندگی کہاں ہے جس سے مجھے محبت تھی؛ وہ خدا کی تھیں۔ تو اُن پر اپنا تصرف نہ کر سکتا تھا! وہ اُسی کے ہاتھ میں ہیں تو اُن پر اُس کے جسم کی طرح قبضہ نہ کر سکتا تھا!

ایک پل کے لئے وہ اِس طرح کھڑا رہا جیسے ایک جوانمرد سینے میں گولی کھا کر کھڑا رہتا ہے۔ پھر اُس کی شعلہ بار آنکھیں جنہیں اب کچھ نظر نہ آتا تھا اُن گروہ در گروہ تماشائیوں پر اٹھیں جو اب اپنی نشستیں چھوڑ چکے تھے۔ اُس کے چہرے پر اس وقت نامرادی و ناکامی کی ایک ناقابلِ اظہار شان نمایاں تھی۔ اُس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ایک زور کی چیخ نکلی، پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اُس کی پیشانی اُس کی بیوی کے سینے پر آرہی۔ اُس کے منہ سے لہو جاری ہو گیا اور اس خون سے نرگس کے وہ پھول جو اُس کی بیوی کے لباس میں پروئے گئے تھے سُرخ ہو گئے۔ جب لوگوں نے اُسے اُٹھایا تو وہ مر چکا تھا ——— وہ بیس سال سے مر رہا تھا +

"اودا"   منصور احمد

غزل

کر گئے کام ولولے دل کے — قیس ہے ساتھ ساتھ محمل کے
توبہ کر بیٹھے مے کشی سے وہ — بن گئے جام جب مری گل کے
رکھ کے آنکھوں پہ لے گئے عشاق — سارے حلقے مری سلاسل کے
اب وہ طوفانِ زندگی کیسا — موج آغوش میں ہے ساحل کے
کس قدر تُند تھی شرابِ عشق — ہو گئے ٹکڑے شیشۂ دل کے
کیوں نہ بھٹکیں مسافرانِ عدم — پھیر میں آ گئے ہیں منزل کے
موجزن ہے حیات کا طوفاں — قطرہ قطرہ میں خونِ بسمل کے
گل کھلاتی رہی چمن میں بہار — زخم جب تک ہرے رہے دل کے
اللہ اللہ رے خمارِ تبسم! — لڑکھڑاتے ہیں پاؤں قاتل کے
کردیا فاش رازِ ناخنِ غم — کھول کر عقدے میری مشکل کے
اٹھتے جاتے ہیں باری باری سے — بیٹھنے والے تیری محفل کے

چھٹ گیا دامنِ امید تپش
رہ گئے خالی ہاتھ سائل کے

شیخ عبد اللطیف تپش بی اے

محفلِ ادب

ارتقائے حقیقت

جناب رگھوپت سہائے صاحب فراق بی. اے کی یہ نظم ٹامس ہارڈی کی ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جس کے بحر و قوافی کی ترتیب وہی ہے جو اصل نظم میں ہے۔ جناب فراق کہتے ہیں کہ انگریزی نظموں کے ترجمے اردو نظم میں اکثر ہوئے ہیں لیکن غالباً یہ امر پہلی بار اس ترجمے میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ ترجمہ کا ہر مصرع اُسی بحر میں ہو۔ جس بحر میں اصل مصرع ہے۔

(۱) (نغمۂ ماہ و سال)

اب تک کُھل نہ سکا یہ راز
کیوں ہے عالم سوز و گداز
کیوں قدرت نے
کیوں فطرت نے
ہر اک شے سے چھیڑ دیا ہے درد بھرا یہ نغمۂ ساز

(۲)

بے حس و بے جان
کچھ تغییر
خواب پریشان
کی تصویر
بے خبر اس سے کہ ہے کس حال میں ذی احساس ہر اک دلگیر

(۳) (نغمۂ ترحم)

کیا ہو گی نہ یہ ظلمت دور
کیا ہو گی نہ یہ غفلت دور.
رفتہ رفتہ
درجہ بدرجہ
کیا نہ دلِ فطرت بدلے گا ہو کے محبت سے مجبور

(۴)

جو یہ حالت
یوں ہی رہی
جو یہ اذیت
کٹ نہ سکی
مٹ کے فنا ہو جائے تو اچھا ہر چلتی پھرتی ہستی

(۵) (آخری ترانہ)

لیکن کچھ ہے فضا لرزاں
جوشِ تموّج سے ہے عیاں
ساری بلائیں
غم کی صدائیں
مٹ جائیں گی اور نہ چلیں گے دُکھتے دلوں پر پھر پیکاں
فطرت کو جوش آئے گا دنیا ہو جائے گی رشکِ جناں

"نگار"

افلاطون کا فلسفۂ عشق

جب وہ عارف، جو عالمِ عینی کا گہرا مشاہدہ کر چکا ہے، کسی حُسن کے دیوتا کے چاند سے چہرے میں حسنِ حقیقی کا جلوہ دیکھتا ہے یا کسی قدِ موزوں کی دلفریبی پر نظر ڈالتا ہے، تو وہ سارے بدن سے لرز اُٹھتا ہے۔ اور اُس پر ویسی ہی مقدس ہیبت طاری ہو جاتی ہے جیسی حسنِ مطلق کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ اُس وقت وہ اُس نوجوان، اُس خدائے حُسن کی دل و جان سے عبادت کرتا ہے۔ بلکہ اگر اُسے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ اُسے احمق سمجھیں گے تو وہ اُس کے سامنے قربانی کرتا، جس طرح کسی بُت یا دیوتا کے سامنے کی جاتی ہے۔ اِس نظارہ کے عالم میں اُس پر عجیب وغریب واردات گزرتی ہے۔ اُس کے جسم کا ارتعاش جاتا رہتا ہے اس کی جگہ بے انتہا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ پسینہ میں ڈوب جاتا ہے۔ حُسن کی کرنیں آنکھ کی راہ اُس کے وجود میں اُتر جاتی ہیں اور مرغِ روح کے گرد ایک جال سا بنا کر اُس کے بازوؤں کو گرما دیتی ہیں۔ یہ گرمی ساری سختی اور جمود کو جن سے پروں کے نکلنے میں رُکاوٹ تھی پگھلا دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بازوؤں کی جڑیں حرارت سے غذا پا کر پنکھ بن جاتی ہیں اور پنکھ میں پر جم آتے ہیں۔ کیونکہ روح میں کسی زمانہ میں پر لگے تھے۔ وہ مجسّم بال و پر تھی۔ غرض روح گرمی سے کھولنے اور اُبلنے لگتی ہے اور جس طرح بچوں کے مسوڑوں میں دانت نکلتے وقت گُدگدی اور ٹیس ہوتی ہے۔ اسی طرح روح میں بھی پر نکلتے وقت میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے اور تپک اور ٹیس۔ جب کبھی اُسے معشوق کے حُسن کا نظارہ نظر آتا ہے۔ اُس کے آرزو کی کلی کھل جاتی ہے حُسن کی حرارت سے گرما کر وہ درد سے نجات پاتی ہے اور خوب ہنستی کھیلتی ہے لیکن محبوب سے جدا ہوتے ہی وصل کی پیاسی روح پھر تڑپنے لگتی ہے۔ بازوؤں کی جڑیں سُوکھ کر بند ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے پنکھ حرکت نہیں کر سکتے۔ اب مقید آرزو اور جکڑے ہوئے پر و بال نبض کی طرح اُچھلتے ہیں اور زنجیروں کو توڑ کر نکلنا چاہتے ہیں۔ اس لئے روح جس میں ہر طرف سے نشتر چبھ رہے ہیں درد سے بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر کسی چیز سے فرحت ہوتی ہے تو معشوق کی یاد سے۔ لذت اور درد کے یوں مل جانے سے روح اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتی ہے، نہ رات کو نیند آتی ہے نہ دن کو چین آتا ہے۔ آرزو کی بے تابی کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے۔ جہاں حسن کے مالک کو ایک نظر دیکھنے کی اُمید ہو۔ جب روح اُسے دیکھ لیتی ہے اور آرزو کو نکلنے کی راہ مل جاتی ہے۔ تب جا کر قیدیوں کو رہائی اور تازہ ہوا میں سانس لینا نصیب ہوتا ہے۔ روح کانٹوں کی خلش سے نجات پاتی ہے اور چند لمحوں کے لئے بے پایاں مسرّت کے مزے لیتی ہے۔

"تعلیم و تربیت"

ایک تاریخی انکشاف

گذشتہ سال کے ماہ ستمبر میں۔ رومۃ الکبریٰ کے جو سکّے انگلستان میں برآمد ہوئے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے

انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان میں روما کے عہدِ حکومت کے سب سے بڑے ماہر پروفیسر آر۔ جی۔ کولنگ وڈ، کا خیال ہے کہ ان سکوں کا وجود انگلستان میں روما کے دورِ حکومت کی تاریخ کو پلٹ دے گا۔ اور دوسری تاریخ لکھنی پڑیگی کیونکہ مؤرخین نے اپنے قیاسات کی بنا پر جو تاریخ لکھی ہے وہ غلط ہے اور جو نتائج انہوں نے مرتب کئے ہیں وہ قطعی بے دلیل ہیں۔

پروفیسر موصوف کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ تاریخِ انگلستان کا سنگِ بنیاد اُکھاڑ پھینکا جائے گا، اور جدید معلومات کی روشنی میں نئی بنیاد رکھی جائے گی۔

علمِ تاریخ کے شیدائی منتظر ہیں کہ دیکھیں تجدیدِ تعمیر کس ڈھب سے ہوتی ہے اور انگلستان کی قدیم تاریخ کے بدل جانے سے وہاں کے محققین اور ماہرین کے کمالات کی قلعی کس شان سے اُترتی ہے۔

"شمع"

قرآنِ پاک عرب عیسائی کی نگاہ میں

فلسطین میں سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ مدرسین کی کانفرنس اس غرض سے منعقد کی گئی تھی کہ فلسطین کے مدارس کا نظام ونصاب مقرر کیا جائے۔ اس کانفرنس میں استاذ انیس صیداوی نے جو مسیحی ہیں اور یافہ کے مدرسہ ثانویہ کے مدرس اعلیٰ ہیں یہ تجویز پیش کی کہ سرکاری مدرسوں کے اعلےٰ درجوں میں قرآن کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ تاکہ عیسائیوں کی آئیندہ نسل قرآن کی بلاغت کے فائدہ سے محروم نہ رہے اور اُن کی زبان درست ہو اور ملکۂ زبان حاصل ہو۔

سامریوں کی تورات

سامری فرقے کے اُن موسیوں کے پاس جو نابلس (شام) میں رہتے ہیں، حضرتِ موسےٰ کی پانچوں کتابوں کا سب سے قدیم نسخہ موجود ہے۔ جو مطبوعہ اور مشہورہ نسخہ سے جو موجودہ یہودیوں کے پاس ہے مختلف ہے۔ سامریوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ نسخہ حضرتِ موسےٰ کی اولاد میں سے ایک کا لکھا ہوا ہے، اور یہ بنی اسرائیل کے کنعان میں داخل ہونے کے تھوڑے دن بعد لکھا گیا تھا۔

"معارف"

چینی مزدوروں کے گیت

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا بیچتا ہے اور چاول خریدتا ہے، ہمارے خالی پیٹ بھرنے کے لئے۔

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کے کپڑے پھٹے رہتے ہیں مگر ان کو پیوند لگانے کے لئے کوئی کپڑا نہیں ملتا۔

میری بڑی بہن کپڑا بنتی ہے، میرا بڑا بھائی کپڑا بیچتا ہے۔ کپڑا کون خریدتا ہے؛ وہ امیر آدمی جو سامنے رہتا ہے بدیسی کپڑا سستا ہے، دیسی کپڑا سخت ہے۔ بدیسی کپڑا عمدہ ہے امیر آدمی اُسی کو خریدتا ہے۔ دیسی کپڑا کوئی نہیں پہنتا میرا بھائی اور میری بہن بھوکے مرتے ہیں۔

(۲)

تم چاول بوتے ہو، میں کپڑا بنتی ہوں، وہ اینٹیں بناتا ہے۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔ ہینگ ہو۔

آٹھ گھنٹے کام، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے مطالعہ، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کے سے دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پڑھنا سیکھو۔

کتابیں پڑھو، مزدور احمق نہیں ہے، پڑھو اور سیکھو، سیکھو اور پڑھو۔

آٹھ گھنٹے مطالعہ، آٹھ گھنٹے آرام، آٹھ گھنٹے کام، سب جو محنت اور مشقت کرتے ہیں انسانوں کا سا دماغ پیدا کرنا چاہتے ہیں +

تبصرہ

تجلّی سفید رنگ کا سرمہ ہے جو آنکھوں کے تمام عوارض کے لئے مفید تسلیم کیا گیا ہے۔ جناب موجد نے اس سرمہ کا ایک پیکٹ ہمارے پاس بھیجا تھا جسے ہم نے دو تین ضرورت مند اشخاص میں تقسیم کر دیا۔ استعمال کے بعد سب نے تعریف کی ہے۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو وہ ایک مرتبہ ضرور اس سرمہ کو آزمائیں۔ قیمت پانچ روپے فی تولہ ہے۔ تین ماشے سے کم روانہ نہیں کیا جاتا۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر کارخانہ تجلّی۔ شاہ دولہ گیٹ۔ گجرات (پنجاب)

HUSAN-I-USAF SOAP
حسن یوسف
حسن یوسف سوپ
حسن یوسف ہیر آئل
حاجت نہ استرے کی نہ محنت حجام کی
بال عمر بھر نہیں اگتے
شرطیہ

فہرستِ مضامین

جلد ۱۳ | بابت ماہِ مارچ ۱۹۲۸ء | نمبر ۳

تصویر:۔ چھٹی کی ایک رسم۔

اِعلان

طلبہ کے لئے ہمایوں کے چندہ میں تخفیف

ہمایوں اُردو زبان کا بہترین رسالہ ہے۔ اِس کے ظاہری اور باطنی محاسن پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ ملک بھر کے علما و اُدبا کی تحریریں ہر مہینے "ہمایوں" کے اوراق کی زینت بنتی ہیں۔ اِس کے علاوہ اُس کی عنانِ ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے۔ صحتِ زبان اور سلامتِ ذوق کے اعتبار سے یہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اِسی لئے اِس کی اشاعت کا ایک معقول حصّہ سکولوں اور کالجوں میں جاتا ہے۔ ہم طلبہ کے فائدہ کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ اگر وہ مارچ کے مہینے میں "ہمایوں" کے خریدار بنیں گے تو اُن سے سالانہ چندہ پانچ روپے کی بجائے صرف تین روپے لیا جائے گا جو دراصل "ہمایوں" کا ششماہی چندہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ وہ اِس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ ۳۰ مارچ کے بعد کسی فرمائش کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

مینیجر رسالہ "ہمایوں"
۲۴۔مزنگ روڈ۔ لاہور

جہاں نما

فطرت کا انتقام

تہذیب نے حواسِ انسانی کو کُند کر دیا ہے

فطرت جو چیز ہمیں عطا کرتی ہے اُس کی قیمت وہ وصول کرلیتی ہے۔ مہذب انسان اب تہذیب کی قیمت ادا کر رہا ہے۔

فطرت نے انسان کو ادنیٰ حیوانوں کی بہ نسبت زیادہ پیچیدہ اور زیادہ گہرے دماغی آلات عطا کر رکھے ہیں مگر اب وہ اُن کی قیمت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ تہذیب کے اس عطیہ کے لئے اگر وہ عطیہ کہلائے جانے کے قابل ہے ہم جو کچھ ادا کر رہے ہیں وہ ہمارے ہوش و حواس ہیں۔ جس قدر ہمارا دماغ ترقی کرتا ہے اتنا ہی ہمارے حواس ہمیں جواب دیتے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر وہ بیکار ہو رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہاں ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے۔

ہاتھیوں کی ایک ٹولی جنگل کی زمین کو پامال کر رہی ہوتی ہے کہ یکایک کہیں سے سانبھر کے ڈکرانے کی آواز آتی ہے، ہاتھی ہوا میں اپنا سونڈ اٹھا کر سونگھتا ہے۔ وہ اپنے کان کھڑے کر کے سنتا ہے مگر اُسے کوئی آواز نہیں آتی۔ ایک لمحہ کے بعد تمام ہاتھی بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اُن کو کچھ نظر نہیں آیا نہ انھوں نے کوئی آواز سُنی مگر پانچ میل کی دُوری سے انھوں نے اپنے دشمن، انسان کی بُو پالی۔

قدیم زمانوں میں جب انسان اپنی دشمن قوتوں سے بھری ہوئی دنیا میں آوارہ پھرتا تھا، اُس دنیا میں جس میں وحشی درندے اور اُس کی اپنی نوع اُس کے درپئے آزار رہتی تھی، تو اُس کی قوتِ شامہ بہت تیز تھی۔ اُسے اپنے دشمن کی بُو دُور ہی سے آجاتی تھی۔ وہ ہوا ہی سے معلوم کرلیتا تھا کہ دشمن کونسے راستوں سے گزر گیا ہے۔ مگر مہذب انسان اپنے حواس کو استعمال نہیں کرتا۔ اسی کی سزا قدرت اب اُسے دے رہی ہے۔

دریائے ٹیمز میں طغیانی آئی تو چوہے اپنے بلوں میں سے نکل نکل کر بھاگنے لگے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے طوفان کی آواز سُن لی ہو یا ممکن ہے کہ اُن کو پانی کی بُو آگئی ہو۔ کچھ بھی ہو یہ چھوٹے چھوٹے حقیر جانور تجربہ کار انسان سے جسے طوفان نے آلیا جہد للبقا کے لئے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے۔ وہ سیلاب زدہ مکانوں کے پردوں کے ساتھ چمٹ گئے درآں حالیکہ انسان پانی میں ڈوب رہے تھے۔

یہی حال ۔ ہماری سماعت کا ہے ۔ کسی امریکی وحشی کے ساتھ جنگل میں چلے جاؤ، تم اُس کی باتیں سُن سُن کے حیران ہو گے کہ وہ کبھی کہیں دُور سے صرف ہرن کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تمہیں اُس کا پتا دیتا ہے اور کبھی کسی دریائی بچھڑے کے دانت کٹکٹانے کی آواز کی خبر دیتا ہے ۔

وہ کیا چیز ہے جس نے تمہارے کانوں کو اس وحشی کے کانوں سے مختلف بنا دیا ہے ؟ اس کا جواب "تہذیب" ہے! کُتے کی سیٹی کو بجاؤ، اُس سیٹی کو جس کی آواز انسانی کان نہیں سن سکتے ۔ تمہارا کُتا اُسے سن کر دوڑ آتا ہے ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ باوجود اپنے گھریلو پن کے قدرتی زندگی بسر کرتا ہے ۔ اور اسی لئے اُس کے کان ہلکی سے ہلکی آواز سے بھی آشنا ہیں تہذیب نے انسان کے بعض حواس کُند کر دیے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ اُس کی قوتِ شعور صحیح طور پر اپنے فرائض انجام نہیں دیتی ۔

صدارتِ جمہوریہ امریکہ

ریاست ہائے متحدہ کی سینات نے ایک قرارداد منظور کی ہے کہ کوئی وطن پرست شہری تیسری مرتبہ صدر منتخب ہونے کی کوشش نہ کرے ۔ ساتھ ہی یہ ترمیم بھی پیش کی گئی کہ مسٹر ہربرٹ ہوور جماعتِ جمہوریہ کی طرف سے صدارت کے اُمیدوار ہوں گے ۔ رکیلوِن کولج پہلی دفعہ انتخاب کے ذریعہ سے صدر مقرر نہ ہوئے تھے بلکہ صدرِ منتخب کے انتقال پر وہ نائب صدر کے عہدے سے ترقی کر کے صدارت تک پہنچے تھے ۔ دوسری مرتبہ وہ منتخب ہوئے ۔ سینات کی قرارداد غالباً صدرِ موصوف کے تیسری مرتبہ منتخب ہونے کے خلاف ایک آواز ہے ۔ سینات کو دستور میں کوئی ترمیم کرنے کا اختیار حاصل نہیں مگر اُس کی اس قرارداد سے ایک غیر تحریری روایت کا اجرا ہوگا کہ دو مرتبہ سے زیادہ کسی شخص کو صدر منتخب نہ ہونا چاہئے ۔

گوشۂ ہائیڈ پارک

لندن کا سب سے بارونق حصہ

لندن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ پکیڈلی سرکس سمجھا جاتا تھا لیکن ماہِ جولائی کے ایک خوشگوار دن میں جب گزرنے

والی گاڑیوں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ گاڑیاں گوشۂ ہائیڈ پارک کی سڑکوں سے گذریں - ان کی تعداد ۱۴۸۴۵۵ تھی اس کے بعد ٹریفالگر کا چوک اور ماربل آرک تھے - پکیڈلی سرکس میں سے جو چوتھے درجے پر تھا ۶۰۷، ۹۳ گاڑیوں کا گذر ہوا +

اس شہر کے متعلق بعض دوسرے اعداد و شمار بھی نہایت عجیب و غریب ہیں - مثلاً لنڈن میں ٹیلیفون کے تاروں کی مجموعی لمبائی ۱۹۸۹۵۹۴ میل ہے - اور ہر سال ٹیلیفون پر ۶۲۲۹۰۰ ۵۱ مرتبہ گفتگو کی جاتی ہے -

لندن کے بازاروں کی مجموعی مسافت ۲۲۲۱ میل ہے - اور ٹریم وے کی لائن کا طول ½ ۳۵۷ میل - لندن میں ۹۳۴۹ ۵ ہوٹل اور قہوہ خانے وغیرہ ہیں - اور وہاں کی پولیس کے آدمیوں کی تعداد ۲۰۰۵۸ ہے - سالانہ ۴۱۰۱۹ حادثات پیش آتے ہیں - ایک سال میں وہاں ۲۳۷۱۳ معاملات کی تفتیش ہوئی اور ۴۹۱۹ مقامات پر آگ لگی +

دل کو مضبوط بنانے کا طریقہ

دل کو مضبوط بنانے کا دراصل ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ مسلسل، باقاعدہ اور کافی ورزش کی جائے - ورزشوں میں بلندیوں پر یا سیڑھیوں پر چڑھنا سب سے زیادہ مفید تصور کیا گیا ہے - جس شخص کی نبض ایک مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھنے سے پچاس سے ساٹھ ستر بول تک پہنچ جاتی ہو اُسے چاہئے کہ وہ ہر روز سو مرتبہ سیڑھیوں پر چڑھے اور اُترے - ایک مہینے تک یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک ایسا کرنے سے اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اب اس مشقت کے باوجود اُس کے دل کی حرکت معمول سے نہیں بڑھتی بلکہ ورزش نے اُس کے اِس جاں بخش عضو کو ایک لوہا کوٹنے والے لوہار کے عصبات کی طرح مضبوط بنا دیا ہے اور اس میں طاقت اور قوتِ برداشت حیرت انگیز طور پر پیدا ہو گئی ہے +

اسی قدر نہیں بلکہ دل کی کمزوری کی وجہ سے عضلات میں جو گرانی پیدا ہو جاتی ہے - اور سوءِ ہضم کے باعث جو بے آرامی محسوس ہوتی ہے اُس کے انسداد کے لئے بھی یہ طریقہ نہایت مفید ہے - سیڑھیوں پر چڑھنے اور اُترنے سے صرف ٹانگیں ہی مضبوط نہیں ہوتیں بلکہ چھاتی بڑھتی ہے - دل انحطاط سے بچ جاتا ہے - معدہ کے عصبات اور ہضم کرنے والے اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں - اور تمام جسم کھائی ہوئی غذا سے پورا پورا فائدہ حاصل کرتا ہے +

چھٹی کی ایک رسم

جننے کے بعد چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھاتے ہیں۔ اور زچہ اور بچے کو بناؤ سنگار کرا کے باہر چوکی پر کھڑا کرنے لاتے ہیں۔ ماں بچے کو گود میں لے کر آتی ہے۔ دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لئے ساتھ ہوتی ہیں۔ دائی آٹے کی چومک[1] اُٹھائے آگے آگے چلتی ہے۔ ماں بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھکر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پکڑی ہو کر سات ستارے گنتی ہے۔ اُس وقت دونوں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر قوس بنا دیتے ہیں۔ تاکہ اوپر سے جن اور پری کا گذر نہ ہو سکے۔ گویا آج سے جن و پری کے سایہ کا خوف دور ہو جاتا ہے۔ اِدھر ماں تارے دیکھنے جاتی ہے اُدھر لڑکے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور بسم اللہ پڑھ کر چھت میں تیر لگا کر گویا فرضی مرگ مارتا ہے چنانچہ اس رسم کا نام ہی مرگ مارنا پڑ گیا ہے۔ مرگ مارنے کا نیگ ساس داماد کو دیتی ہے۔

زچہ تارے دیکھ کر پلنگ پر آ بیٹھتی ہے۔ پلنگ کے آگے دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ چوکی میز کی طرح لگا دی جاتی ہے۔ اُس پر تورہ (چوبہ) چنا جاتا ہے جس میں پکی ہوئی سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے ہیں۔ سات سہاگنوں کے ساتھ مل کر زچہ رانی ذرا ذرا سا چکھ لیتی ہے۔ جسے چوبہ چکھانہ کہتے ہیں۔ مبارک سلامت سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ گانا شروع ہو جاتا ہے:۔

جچا جب دیکھنے کو آئی تارے	ستارے چرخِ گرداں نے اُتارے
ہوا فرزند یہ سب کو مبارک	کہو لڑکے کا باوا مرگ مارے
چھٹی کی دھوم جو پہنچی فلک تک	قمر اور مشتری دونوں پکارے
خدا نے کیا خوشی دونوں کو دی ہے	دمامے بج گئے گو بجے نقارے

اس کے بعد زچہ کے آگے کے تورے اور چومک میں روپے ڈال کر دائی کو دیتے جاتے ہیں +

ماخوذ از "رسومِ دہلی"

منصور احمد

---

[1] آٹے کا ایک چراغ چومو بنایا جاتا ہے۔ اُس میں چار بتیاں اور گھی ڈال کر جلاتے ہیں +

عدالتیں

پنجاب میں چار قسم کی عدالتیں ہیں

اوّل دیوانی عدالتیں۔ ان کے دروازوں پر دس بجے سے چار بجے تک متواتر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد مفصلہ ذیل قسم کی آوازیں دی جاتی ہیں

چلو پکوڑی چند اور قرض محمد

چلو کروڑی مل اور فاقے خاں

چلو لالہ گروی مل اور میاں مرہون الٰہی

یہ چل چلاؤ غدر کے بعد سے شروع ہوا ہے اور شاید قیامت تک رہے۔ ان عدالتوں کے ہر فیصلہ کا دارومدار بارِ ثبوت پر ہے۔ عجب دیوانے لوگ ہیں کہ خواہ مخواہ بوجھ تلے دبتے ہیں مگر یہ ثبوت کا بوجھ بعض دفعہ ججوں کی توجہ سے آناً فاناً اِدھر کا اُدھر جا پڑتا ہے۔ اِن دیوانی عدالتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ گاؤں میں رسم ورواج چاہے کچھ بھی ہو عدالت میں بعض دفعہ مسل میں وہ ایسا بدلتا ہے کہ خود وہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض دفعہ سیدوں میں بیٹیاں لاوارث اور برہمنوں میں نواسیاں جائز حقدار قرار دی جاتی ہیں۔ مگر سب سے طرفہ داستان ان دیوانی عدالتوں کی یہ ہے کہ ان میں سچ (یا سچ نما جھوٹ) کے لئے بھی میعاد مقرر ہے۔ بارہ سال کے بعد سچ چاہے وہ کتنا ہی صادق کیوں نہ ہو جھوٹ ہو جاتا ہے اور بعض سچ تو بہت ہی جوانا مرگ ہوتے ہیں، تین سال سے زیادہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے +

دوم فوجداری عدالتیں۔ انہیں دیوانی عدالتوں پر یہ فوقیت ہے کہ ان کے بعض شائقین آواز کے محتاج نہیں۔ اپنے ساتھ لوہے کی زنجیر کے سرے پر ایک پولیس کا سپاہی اٹکا لیتے ہیں اور خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔ اِن شائقین کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ اِن پر بڑے سے بڑا بیرسٹر بھی، چاہے وہ لارڈ ریڈنگ ہی کیوں نہ ہو جرح کا سوال نہیں کر سکتا اور ان کو جھوٹ بولنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ بعض دفعہ تو بڑے بڑے گھمنڈا سنگھ اور طرّے باز خاں اس قانونی حق کا فائدہ اُٹھاتے ہیں مگر عام طور پر یہ حق نتھو خیرے، رَوپے اور نندے کے لئے مخصوص ہے۔

سوم مال کی عدالتیں۔ ان کا مرتبہ اول الذکر ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ ان میں اکثر گاؤں کے گاؤں کو طلب

کرلیا جاتا ہے۔ دیگر عدالتوں میں تو انسانوں کی قسمت کا الٹ پھیر ہوتا ہے۔ یہاں زمین کی تقدیر گردش میں رہتی ہے۔ یہ عدالتیں اکثر خود بھی چکر میں رہتی ہیں۔ بُدھو پور کا مقدمہ منگل پور، منگل پور کی جمعبندی سنسان پور، سنسان پور کی فرزندی پور۔ دریاؤں کی برد و برآمد کی طرح پنجاب کے دریا سمجھدار ہیں جسے فائدہ پہنچانا ہو اس کی زمین پہلے بُرد کر دیتے ہیں) ان عدالتوں میں جو ایک دفعہ بہ نکلے پھر وہ نکلتا ضرور ہے مگر عرصہ کے بعد۔

چہارم اندھیری مجسٹریٹوں کی عدالتیں۔ یہ سب سے انوکھی ہیں کیونکہ ان میں صلح صفائی کے بلاتنخواہ واعظ جلیس ہوتے ہیں۔ مار پیٹ کا مقدمہ ہو کہ نقضِ امن کا اندیشہ ہو کہ اغوا کی واردات ہو سب کے لئے ایک ہی مجرب تلقین ہے یعنی راضی نامہ۔ ان سب عدالتوں کا جو گرانقدر مجموعی احسان اہلِ پنجاب پر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ پنجاب کی عدالتیں پہلا سبق یہ سکھاتی ہیں کہ انسان اس دنیا میں صرف اپنے لئے زندہ نہیں چنانچہ ان کے فیضان سے گاؤں والوں کی کمائی سے عرضی نویس، وکیل، وکیلوں کے منشی، عدالتوں کے اردلی، اہلمد، ناظر، پولیس کے سپاہی، دیوانی کے پیادے، قید خانے کے برقند از علیٰ قدرِ مراتب اپنا اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انگلستان کے خود پرست لوگ اس رواداری کے قریب نہیں پھٹکتے۔ گو وہاں ایسی موٹی عقل کے ہیں کہ رشتہ داری، قرابت، دوستی، دشمنی انہیں کسی کا کچھ پاس نہیں بلکہ ایسی عقل کی مار ہے کہ اکثر ملزم خود اقبالی ہو جاتے ہیں۔ دوسرا سبق روحانی ہے۔ ہر مذہب کی روحانی تعلیم کا نصب العین ایک ہی ہے یعنی فنا فی اللہ ہو جانا۔ پنجاب کی تمام عدالتوں کی تقدیس اس ایک بات ہی سے ثابت ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان نصب العین کی پوری تکمیل اپنے ذمہ لے رکھی ہے یعنی اس طرح سے کہ پہلے اہلِ مقدمہ پوری طرح فنا ہوتے ہیں اور پھر یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں کہ خدا کی مرضی، گویا فنا فی اللہ ہو گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ جتنی عدالتیں زیادہ ہونگی اسی قدر روحانی ترقی کی رفتار تیز ہوتی جائیگی اس لئے ملک کے رہنماؤں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ اور کاموں کو چھوڑ کر تمام کوششیں اس مرکزی اصول پر جمع کی جائیں کہ ہندوستان کی روحانیت کا تقاضا ہے کہ ہر گاؤں میں ہر قسم کی عدالت قائم ہو اور ہر عدالت کے ہر حکم کی اپیل در اپیل ہو سکے۔ اس اصلاح میں ہر قسم کی اصلاح آ جائیگی اور تمام انٹرنس فیل بلکہ مڈل فیل بزرگ بلا دِقت ملک کی خدمت میں لگ جائینگے۔

تیسرا سبق اقتصادی ہے بشرطیکہ کوئی غور کرے۔ مثلاً کہاں دریائے سندھ کے پاس چھچھ کا علاقہ کہاں لاہور کا مشہور بیرسٹر سر ولیم راٹیگن مگر چونکہ ذاتِ باری کو منظور نہ تھا کہ چھاچھی لوگ پکے مکانوں میں آسودہ ہو کر رہیں اس لئے اللہ تعالٰے نے لاہور میں چیف کورٹ قائم کرا دیا۔ چنانچہ چھاچھی جو پہلے قتل کے بدلے صرف قتل کرتے تھے چیف کورٹ قائم ہونے پر قتل کے ساتھ قتل کے علاوہ اپیل کے ساتھ وکیل کرنے لگے اور سابق مسٹر راٹیگن کے گھر چاندی کی نہر

پر ملی۔ صرف مسٹر راٹیگن ہی نہیں بلکہ بابو پرتول چندر چیٹرجی (بعد میں سر پرتول چندر) بھی اسی زمرہ میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عدالتیں تو اللہ جل شانہٗ کا الف لیلہ والا الہ دین کا عجیب و غریب چراغ ہیں۔ جس وکیل، بیرسٹر نے اس چراغ کو درست طریقے سے مل لیا۔ اس کے محل تیار ہو گئے۔ اس زندہ اور جاری معجزے کو دیکھ کر جو شخص ذاتِ حق پر یا کم از کم برٹش گورنمنٹ پر ایمان نہ لائے اس کا اقتصادی مذہب باطل ہے۔ عدالتوں میں دہقانوں کے روپیہ کے لئے وہ مقناطیسی کشش قائم ہو گئی ہے کہ ان کے ہوتے کوئی گاؤں کا رہنے والا اپنے آرام و آسائش میں مستغرق ہو ہی نہیں سکتا۔ صاف مشیت معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ہر قسم کی نعمتیں شہریوں کو عطا ہونگی اور اس کے بعد مناسب موقع پر گاؤں والوں کو عقل دی جائے گی کہ وہ فارغ ہو کر افسوس کریں۔

اب یہ مضمون ختم ہوتا ہے مگر پڑھنے والوں سے اس امر کی داد کی توقع ہے کہ عدالتوں کے ذکر میں انصاف کا لفظ بھول کر بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ مرزا غالب مرحوم کے شعر

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

میں "تیرا" خداوند تعالےٰ کی طرف راجع ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ انصاف مطلق ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ انصاف کو مخاطب کر کے یوں یہ شعر نہ پڑھا جائے

لُٹ لُٹ کے ہر کچہری میں دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یا روحانیت کا اظہار یوں کیوں نہ کیا جائے

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں میں جج کو

بعض کوتہ اندیش لوگ اکثر واویلا کرتے ہیں کہ مسجدیں غیر آباد ہیں اور مندر سنسان۔ کیا انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ پنجاب میں نئے عبادت خانے جہاں لوگ شوق سے چڑھاوے لے کر جائیں بھرپور آباد ہیں یعنی عدالتیں*

"فلک پیما"

طوفانی رات

برسات کی گھٹائیں طوفاں اُٹھا رہی ہیں — سنسان جنگلوں میں ہلچل مچا رہی ہیں
خوابیدہ بستیوں کا بازو ہلا رہی ہیں — سنسار میں ہزاروں موتی لُٹا رہی ہیں

اک حشر موج زن ہے بارش کی رات کیا ہے
دنیا لرز رہی ہے، اک دو کی بات کیا ہے

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رہ رہ کے آ رہے ہیں — باغوں کی بھینی بھینی خوشبو لُٹا رہے ہیں
خوابیدہ دل میں لاکھوں ارماں جگا رہے ہیں — صہبائے بیخودی کے دریا بہا رہے ہیں

آ جا رہے ہیں ہر سُو نغمے سنا سنا کر
جنگل میں سنسنا کر، بستی میں گنگنا کر

پُر شور بادلوں میں بجلی چمک رہی ہے — پارے کی ایک مچھلی گویا لپک رہی ہے
کندن کی طرح جس سے ہر شے دمک رہی ہے — ہر آنکھ خیرگی کے مارے جھپک رہی ہے

چونک اٹھے جنگلوں میں غفلت زدہ چرندے
جاگ اُٹھے گھونسلوں میں سوئے ہوئے پرندے

بادل گرج گرج کر ہر سُو مچل رہے ہیں — کاجل کی تہ میں لاکھوں موتی اُگل رہے ہیں
چُپ چاپ بہنے والے دریا اُبل رہے ہیں — موجیں اُبھر رہی ہیں طوفاں اُچھل رہے ہیں

برسات کی رگوں میں ہیجان آ رہا ہے
سرسبز وادیوں میں طوفان آ رہا ہے

اک شور مچ گیا ہے خاموش بستیوں میں — دھندلی بلندیوں پر تاریک پستیوں میں

کچھ لوگ الجھ رہے ہیں مینا پرستیوں میں — کچھ محو ہیں شراب گلگوں کی مستیوں میں
کچھ نیند کے نشے میں کروٹ بدل رہے ہیں
کچھ ڈرتے ڈرتے اپنے گھر میں ٹہل رہے ہیں

دریا چڑھاؤ پر ہیں، تالاب بھر رہے ہیں — جنگل ہرے ہوئے ہیں گلشن سنور رہے ہیں
باغوں کے ننھے پودے دھل کر نکھر رہے ہیں — بادل گرج رہے ہیں چوپائے ڈر رہے ہیں
یہ ابر ہے کہ ہر سُو اٹھتا ہؤا دھؤاں ہے
یا آسماں پہ چھایا اک اور آسماں ہے

مدہوش ہیں مناظر پُر شور ہیں صدائیں — نغمہ سرا رہی ہیں دھندلی بھیگی ہوئی فضائیں
یہ ابر کی گرج ہے یا توپ کی صدائیں — ساتوں طبق زمیں کے کیونکر دہل نہ جائیں
پھل پھول گر رہے ہیں پتے بھی جھڑ رہے ہیں
لاکھوں درخت اپنی جڑ سے اُکھڑ رہے ہیں

اُودی گھٹا نے ہر سُو دریا بہا دیئے ہیں — دنیا پہ کالے کالے پردے چڑھا دیئے ہیں
سوئے ہوئے ہزاروں فتنے اُٹھا دیئے ہیں — اپنی کڑک سے لاکھوں محشر جگا دیئے ہیں
باغوں میں ہر جگہ اک طوفاں بکھر رہا ہے
ہر ذرہ کانپتا ہے ہر پھول ڈر رہا ہے

بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے — ہر ذرّہ ذرہ پر اک ہنگامہ سا بپا ہے
مینہ کی جھڑی لگی ہے۔ اک شور سا مچا ہے — محشر سا موجزن ہے، طوفان سا اُٹھا ہے
یہ رات، یہ سیاہی، یہ ابر، یہ اندھیرا
گویا کبھی نہ ہوگا دنیا میں اب سویرا

کیشوداس عاقل

تکمیلِ محبّت

(۷)

منظور و ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے +

منظور جو جمیل کا دوست تھا اور منظور جو ثروت کا شوہر تھا فی الحقیقت دو مختلف الطبائع شخص تھے + کچھ یہ وجہ تھی کہ جمیل پندرہ سال کی عمر میں ابھی ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا اُسے دنیاداروں کی سیرت کا صحیح صحیح اندازہ نہ ہو سکتا تھا اور کچھ یہ سبب تھا کہ منظور کی سیرت تھی ہی کچھ مستور و متلون - وہ گورنمنٹ کالج میں تاریخ کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا اور تاریخ ہی کی طرح اُس کی طبیعت میں عجیب و غریب نشیب و فراز تھے +

وہ اپنے دوستوں سے کبھی دوستی رکھتا تھا اور کبھی بے اعتنائی برتتا تھا - وہ کبھی نہایت خوش مزاج ہوتا تھا اور کبھی اپنے آپ سے بھی بیزار - اُس کا جسم پُرصحت اور اس کی شکل وجیہ و دلکش تھی جس پر عینک نے سونے پر سہاگہ کردیا تھا - اُس کا لباس کبھی نہایت پُرفیشن اور کبھی نہایت مکروہ ہوتا تھا - اور اُس کے دوستوں میں اس "پروفیسریت" کا خوب مذاق اُڑایا جاتا تھا +

اُس نے علیم الدین کے گھرانے میں بڑے شوق سے شادی کی تھی کہ اِس میں اُس کی عزت افزائی تھی اور ثروت سے بھی اُس کا برتاؤ نہایت پُرخلوص و پُرمحبت تھا لیکن وہ جبلتاً نسوانی صحبت سے گریز کرتا تھا اور عادتاً اپنے دوستوں یاروں کی محفل میں رات رات بھر بیٹھے رہنے کا مشتاق تھا - یا پھر اُسے اپنی "ہسٹری" (تاریخ) کا خبط تھا - جب کبھی وہ اپنے بوسیدہ مسودات اور گبن اور الفنسٹن کی "عظیم الجثہ" کتابیں نکال کر انہیں اپنے دفتر میں پھیلا دیتا اور کام کرتے کرتے روشنائی کے بعض چھینٹے ساتھ کے "پلنگ کمرے" میں بھی ڈال دیتا تو ثروت کو اس علمی بدتمیزی پر بہت غصہ آتا - شادی کے تین سال کے بعد منظور نے کالج کا کام کرنا کم کردیا کہ اب وہ ایک کرائے کے گھوڑے کی طرح اپنے مقررہ راہِ عمل سے بخوبی آگاہ ہوگیا تھا اور اُسے بغیر زیادہ کوفت کے نہایت رسمی طور پر سُستی سے طے کرتا تھا - وہ چند دوستوں کی خاموش عملی ترغیب سے ناچ، وہ ناچ جو انگریزی تفریح گاہوں میں صرف تعلیم یافتہ اصحاب کی ضیافتِ طبع اور محض ذوقِ فن کی ترقی کی خاطر دیکھا جاتا ہے اور راگ رنگ، وہ جو فقط احباب کی مخفی شبانہ صحبتوں میں بعض آوارہ گرد نوجوان دوستوں سے سُنا جاتا ہے اور تھوڑی سی شراب اتنی جتنی کہ انگریزی وضع کی سوسائٹی میں نہ صرف ممنوع ہے بلکہ وضعداری میں داخل اور فیشن کاری کے لئے

لازم ہے اور جوئے کی وہ متمدن شکل جس سے شناسائی ہر کلب والے کے لئے "کلبیت" کا جزو لاینفک ہے ان سب چیزوں سے تھوڑا تھوڑا اور عموماً بالکل حدِ اعتدال کے اندر وہ محظوظ و متمتع ہوتا رہا۔ لندن اور پیرس میں ہم نہیں جانتے کہ اُس نے عیش و عشرت میں حصہ لیا یا نہیں لیکن جب ولایت جانے سے پہلے اور بعد کے بڑے بڑے پارسا اور بشر میلے اصحاب ولایت میں عموماً آں کارِ دیگر می کنند کی تصویر بنے رہتے ہیں تو بیچارے منظور ہی نے کیا جرم کیا ہے کہ ہم اُس کے بعد کی عشرت پسندیوں سے (اور وہ بھی اُن عشرت پسندیوں سے جن کو عشرت کہنا تازہ ترین شائستگی والوں کے نزدیک تنگ خیالی اور جہالت کا مرادف ہے تو ان آزاد خیالیوں سے ہم) "قدیمانہ" بیزاری ظاہر کر کے اُسکی تاریخ زندگی کے "ولایتی زمانے" میں اُس کے رویے کی چھان بین کریں +

انصاف سے بعید ہوگا اگر ہم منظور کے چال چلن میں کسی قسم کا شک و شبہ کریں۔ وہ اُن بہت سے "انگلستانی" ہندوستانیوں کی مانند تھا جو ندرت پسندی کے مرض میں مبتلا ہو کر فیشنی جدت کے پیرو اور شایستہ رنگ رلیوں کے نام لیوا ہوجاتے ہیں اگرچہ اُن میں سے اکثر بہیمیت کی انتہائی کمزوریوں کا شکار ہونے سے بچے رہتے ہیں +

منظور کی یہ روش اُس کے خسر کو ناپسند تھی لیکن وہ مجبور تھے کہ اپنے داماد پر زیادہ زور نہ ڈال سکتے تھے۔ ثروت کو کلب میں آنے جانے سے عار نہ تھا شریف مردوں سے ملنے جلنے میں اعتراض نہ تھا لیکن وہ دورِ حاضر کی تمام عشرت پسندیوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اپنے شوہر کو اُن میں حصہ لینے سے روکنا چاہتی تھی + مگر بدقسمتی سے وہ اب منظورِ نظر نہ رہی تھی۔ ثروت کی شادی کو اب نو برس ہونے کو تھے لیکن اُس کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا نہ ہونے کی کچھ زیادہ اُمید تھی۔ منظور ثروت سے محبت کرتا تھا اُسے دل سے چاہتا تھا مگر وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کے باپ کو پوتے کی خواہش تھی جس سے اُس کی نسل قائم رہے اور اپنے بیٹے کا گھر بے چراغ دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ منظور دوسری شادی کرلے لیکن منظور کی خوش نصیبی سمجھئے کہ اُس نے اپنی مغربی تعلیم سے اتنا فائدہ ضرور اُٹھایا کہ کثرتِ ازواج کے معاملے میں کبھی لغزش نہ کھائی۔ ہاں یہ ہوا کہ ثروت کی طرف روز بروز اُس کے جذبات سرد اور اُس کا رویہ بے پروا ہوتا گیا اور ثروت شادی کے تین چار سال کے بعد زیادہ تر اپنے میکے ہی میں رہنے لگی +

ثروت کی زندگی روز بروز زیادہ غمگین و اندوہ ناک ہوتی گئی۔ وہ اپنے باپ کو اپنے شوہر کی عادات پر خاموش رہنے کی ترغیب دے سکتی تھی لیکن جس نعمت سے خدا ہی نے اُسے اب تک محروم رکھا تھا اُسے بغیر تائیدِ الٰہی کے وہ کیونکر پاسکتی تھی؛ رونا دھونا اُس کا کام اور آہیں بھرنا اُسکی فطرتِ ثانی ہوگئی۔ وہ عبادت کی طرف مائل ہوتی گئی۔ ہر روز قرآن مجید پڑھتی اور صبح کی نماز ادا کر کے گڑگڑا کر خلوص دل سے دعائیں مانگتی کہ بارِ خدایا یا مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے منظور اور شادی کر

لے تو اُسے اک بچہ عنایت کرے اور یا مجھ عاجز کی گود ہری بھری کردے کہ مجھ سے محبت میں یہ بے اعتنائیاں نہیں دیکھی جاتیں۔ مجھے غربت کی اٹواٹی کھٹواٹی پسند ہے مجھے کلفت کے درد و کرب مقبول ہیں مگر محبت کا گلا نہ گھونٹ سکنے والے دار و رسن مجھے کسی صورت منظور نہیں۔ پھر آہ بھر کر چپ ہو جاتی کہ خدایا مجھے معاف کریں کیا کہہ رہی ہوں؟ مجھے کیا منظور نہیں؟ جو کچھ بھی تو مجھ کو دے وہ سب مجھ کو بسر وچشم قبول کرنا ہے۔ جس روز سے میں منظور کے دل کی ثروت اور منظور میرا منظورِ نظر بنا اُس روز سے جو بھی میرے اُوپر گزر جائے وہ سب مجھے بصد شوق منظور ہے!

ثروت جس کی ظاہری شکل وصورت کو دستِ قدرت نے تکمیلِ حسن کے سانچے میں ڈھالا تھا اب زمانے کی گردش اور دنیا کی مصیبتوں نے اُس کی فطرت کو اپنے شکنجے میں دبا کر اُس کے باطن کو صدق وصفا کی جِلا دی۔ ممکن تھا کہ دنیا کے عیش وعشرت میں پڑ کر وہ محض حسن کی اک دلکش پتلی ہو جاتی لیکن اب زندگی کے درد و کلفت نے اس غمگین حسینہ کو فرشتوں کی سی سیرت سے آراستہ کر دیا!

دن گزرتے گئے۔ راتیں لمبی ہوتی گئیں۔ ہفتے مہینے ہو گئے۔ مہینے سال بن بن کر نظر آنے لگے! لیکن اُمید کی صورت نظر شاید نہ آنی تھی نہ آئی +

اِس اندوہ والم میں ثروت کو تسلی دینے والے یا اُس کے والدین تھے اور یا گذشتہ دو سال سے جمیل وعذرا +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شادی کے وقت سے جمیل اور منظور و ثروت میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ شادی ہو کر نہ صرف دونوں کا نصیبہ جُدا جُدا ہو گیا بلکہ اُن کے گھرانوں میں بھی مغائرت سی ہوتی گئی۔ عزیزوں میں جب غیریت پیدا ہونے لگتی ہے تو وہ عموماً اجنبیت کی حد سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ ایسا ہی یہاں ہوا۔ اُدھر منظور و جمیل کی دوستی کا بھی اب کچھ نشان باقی نہ رہا تھا کہ جمیل کا منظور کے پاس آنا جانا باقی رہتا۔ لیکن باپ کی وفات کے بعد جمیل علیم الدین کو اپنا باپ سمجھ کر اُن کی انتہائی عزت کرتا تھا اگرچہ اُسے اُن سے نہ کوئی غرض تھی نہ کوئی واسطہ۔ اُدھر علیم الدین جن کی اپنے داماد سے چشمک تھی اِس نوجوان سے ہر طرح مروت کے ساتھ پیش آتے تھے اور اکثر "علیم منزل" میں اُس کے آتے رہنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح جمیل اور عذرا کی آمد و رفت یہاں ہونے لگی +

جمیل اگرچہ ثروت و منظور کی ناچاقی سے باخبر تھا لیکن اب ثروت کو بار بار دیکھ کر اور اپنے چچا علیم الدین کے ذریعہ سے مختلف حالات سے آگاہ ہو کر وہ اپنی گذشتہ بے مروتی اور روکھے پن پر بے انتہا نادم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور عذرا اب اکثر "علیم منزل" میں آنے جانے لگے +

عذرا اور ثروت کی گہری دوستی ہو گئی۔ ثروت کو اُس کے غم ومصیبت میں ایک نہایت سچے دل والی سہیلی مل گئی۔

جس کے آگے وہ بے تکلف اپنا دکھڑا کہہ سکتی + عذرا گھر جا کر یہ سارا حال جمیل کو سناتی اور کہتی کہ تم اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہو انسانیت کا تقاضا ہے کہ تم کبھی کبھی اُس سے ہمدردانہ گفتگو کیا کرو۔ بچپن کے دنوں میں تمہارے دل میں اُس کے لئے اِک معصوم الفت کا جذبہ اٹھا۔ اُس کے بعد اُس کی اور تمہاری زندگی الگ الگ ہوگئی لیکن کیا وہ الفت اس قدر بودی تھی اور یہ اُس الفت کا ردِّ عمل ہے کہ پھر اِس کی بجائے اک ضد آمیز بے اعتنائی تم میں پیدا ہوگئی، سرد مزاج طبیعتیں عموماً رشک و حسد سے پاک ہوتی ہیں۔ عذرا کے دل میں حسد کے جذبات مطلق نہ تھے۔

عذرا شروع میں بظاہر ایک معمولی سیرت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ پُر تخیل وجدت طراز جمیل کی عقلی و ذہنی عظمت کے مقابل میں اُس کی شخصیت بے حقیقت نظر آتی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ باوجودیکہ بعض باتوں میں اُس کی اور جمیل کی فطرت میں زمین آسمان کا فرق تھا اُس نے جمیل کی زندگی کو عملی طور پر راستی کی اُس راہ پر لگا دیا جس سے ممکن ہے کہ وہ اپنے سرکش تخیل کے باعث بھٹک جاتا +

عذرا کے اس قابلِ تحسین اعتمادِ محبت کا اثر نہایت اچھا ہُوا۔ جمیل سے ثروت کی طرف برادرانہ الفت کا اظہار ہونے لگا اور ثروت کی جانب سے جمیل کی طرف خواہرانہ شکر گزاری کا بیان +

عذرا نے دونوں بچھڑے ہوؤں کو پھر ملا دیا اور ملانے والی کی شکر گزاری میں ملنے والوں کے جذبات نے وہی رنگ اختیار کیا جو انہیں اختیار کرنا چاہئے بھی تھا +

ثروت کی زندگی ابھی غم و افکار سے تیرہ و تار ہو رہی تھی لیکن خدا کا ہزار شکر تھا کہ اب کبھی کبھی اِس ظلمت کدہ میں عزیزانہ ہمدردی کی شیریں کرنیں چلی آتی تھیں!

ثروت اکثر کہا کرتی پیاری عذرا! میں تمہارے احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ خدا گواہ ہے کہ اگر کبھی ضرورت پڑی جو خدا نہ کرے کبھی تم کو پڑے تو میں اپنی ناچیز خدمت تمہارے لئے پیش کروں گی۔ اب تو میرے پاس صرف ایک سچی محبت کا ناچیز تحفہ ہے اور بہن! وہ حاضر ہے!

∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

---

(۸)

ننھا عویو ایک دن اپنے رنگین کھلونوں سے کھیل رہا تھا کہ اُس کی آیا نے اُسے گود میں لے کر پیار کیا اور

کہا میرے بچے! تیری ماں آسمان کے دیس چلی گئی!

عزیز نے کہا " ہاں! وہ مجھے آسمانی پریوں کی کہانی سنایا کرتی ہیں کہ وہاں بلور کے پہاڑ ہیں جن پر زمرد کے درخت لہلہاتے ہیں۔ اُن پہاڑوں سے شہد کی سرخ اور سفید نہریں بہتی ہیں اور اُن درختوں میں رنگ رنگ کے یاقوتی پھول کھلتے ہیں۔ وہ میرے لئے وہاں سے ایک ننھی منی پری لائیں گی جس کے ساتھ مل کر میں اس گھروندے میں رہوں گا اور ان کھلونوں سے کھیلوں گا۔ وہ آئے تو میں اُسے اپنے سارے کھلونے دے دوں اور کھانے کو پیڑی دوں کہ پھر جانے کو اُس کا جی نہ چاہے "۔ آیا کا جی بھر آیا۔ اُس نے بچے کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اُس کے آنسو ٹپ ٹپ بچے کے رخسار پر گرنے لگے جو اس نے جلد جلد پونچھ دیئے۔ بچے نے شوخی سے کہا " رحیمہ آج تیسری بار تم نے میرا منہ دھویا ہے۔ امی جان آئیں گی تو میں ضرور کہوں گا کہ اگر اتنی بار منہ دھونا ہو تو وہ خود ہی دُھلا دیا کریں۔ رحیمہ تمہارے ہاتھ بڑے سخت ہیں امی جان کے ہاتھ بڑے پیارے اور نرم ہیں"۔

اتنے میں سامنے سے ثروت آگئی اور اُس نے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔

عذرا تین ماہ کی شدید علالت کے بعد آج دم توڑ چکی تھی اور دوسرے کمرے میں بچے سے تھوڑی ہی دُور بے حس و حرکت پڑی تھی۔ بہت سے عزیز وہاں جمع تھے۔ جمیل عذرا کے بستر مرگ پر سر جھکائے بیٹھا تھا اور آنسو زار قطار اُس کے چہرے پر رواں تھے۔

جب موت کا وقت قریب آیا تو عذرا نے ثروت کو اپنے قریب بلایا اور کہا " میری پیاری بہن! تم کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں جاتی ہوں مگر اپنے لختِ جگر کو چھوڑے جاتی ہوں۔ وہ اب تمہارا بچہ ہے، ثروت اب تم اُس کی ماں ہو۔ دیکھنا میرے لال کو دُکھ نہ پہنچے۔ جب وہ پوچھے کہ امی جان کہاں ہیں تو تم کہنا کہ میں ہی تمہاری امی جان ہوں جو پریوں کے ملک سے اک پری بن کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ خدا حافظ بہن!"

عذرا کی موت سے جمیل کی زندگی تہ و بالا ہو گئی۔

عذرا جس سے جمیل نے شروع میں محض ایک نوع کی رسمی شادی کرنے کا ارادہ کیا تھا ایک ایسی شخصیت رکھتی تھی جس کے خاموش اثر سے بڑے بڑے خیال پرست بتدریج خود بخود عملی انسان بن جاتے ہیں۔ جمیل کی طبیعت شادی سے پہلے بھی کج روش نہ تھی لیکن اُس کی فطرت ابھی زمین پر پاؤں نہ رکھتی تھی، اُس کی جودت ابھی اُسے فلک پیمائیوں پر مجبور کرتی تھی۔ اگرچہ تکمیلِ تعلیم کے بعد اُس نے عارضی طور پر اپنے تئیں تخیل کے زور و ترغیب سے دنیا کے معمولات کا خوگر بنا لیا تھا۔ عذرا سے اُس نے یہ سبق سیکھا کہ بغیر زورِ تخیل کے بھی انسان یہ معمولی زندگی بسر کر سکتا ہے اور ایسے

ہی اُسے زندگی بسر کرنی چاہئے۔ انسان ایک متنفس ہے کوئی پر وار فرشتہ نہیں، کھاتا پیتا بولتا چالتا ہے اَوروں کے ساتھ مل کر رہتا اور اَوروں ہی کی مدد سے کسبِ معاش و کسبِ کمال کرتا ہے اس لئے انسان کا پہلا فرض اپنی دنیائے معاشرت سے وابستہ رہنا، اُس کی خدمت کرنا اور اُسے برابر ترقی دیتے رہنا ہے۔ جب تک معاشرتی دستور تبدیل نہ ہوں یا کر نہ دیئے جائیں اُس وقت تک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی بد امسجد بنانا نہ صرف بے سود ہے بلکہ قطعی ضرر رساں! جمیل کی فطرت میں جو کمیاں یا زیادتیاں تھیں عذرا نے اُن کی اصلاح کی اور اُسے سیدھے رستے پر لگا دیا +

اِس کے علاوہ عذرا نے جمیل کی خانگی زندگی کو خوشگوار بنا دیا تھا اور اُس کے گھر بھر میں ایک ننھے منے چراغ سے چکاچوند کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ اِس سے بڑھ کر اُسے دنیا کی زندگی میں اَور مل ہی کیا سکتا تھا کہ اِک وفادار بیوی ہو جو رنج وراحت میں اُس کی شریک اور نشیب و فراز میں اُس کی مُشیرِ کار بن کر زندگی کے اک ایسے جادۂ رواں پر اُس کی رہنمائی کرے جس پر وہ سلامت روی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہو +

سچ یہ ہے کہ عذرا جمیل کی طبیعت کے پریشان اجزا کا مضبوط و متناسب سانچا تھی۔ جب سانچا ٹوٹ پھوٹ گیا، تو اجزا پھر پریشان اور پریشان تر ہو گئے +

غم کی گھٹائیں اُس کے دِل پر چھا گئیں اور رنج و محن کی بجلیاں اُس کے خرمنِ حیات پر رہ رہ کر گرنے لگیں۔ راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ آرام و آسائش سے طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ بےچینی نے دل میں گھر کر لیا۔ رونے سے آنکھوں کا ستیاناس ہؤا۔ فکر و الم سے اعصاب میں کبھی اضمحلال اور کبھی انتہائی بے کلی پیدا ہونے لگی۔ اب کون تھا جس سے اس کربِ اندوہ کا تذکرہ کر کے وہ جی ہلکا کرتا۔ اُس کے خمیر میں تھا کہ جی کی بات کہے تو کسی ایسے دوست سے جو کسی اور کا دوست نہ ہو۔ اب کون باقی تھا جو فقط اُسی کا دوست اور محض اُسی کا رفیقِ زندگی ہو رہتا؟

جمیل کو اِس ظلمت سے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ سُوجھی۔ اُس کی ماں نے اُسے بہت تسلی دینی چاہی لیکن بیوی کے بارے میں ماں کی تسلی اُسے بُری معلوم ہوتی تھی۔ اُسے تسلی صرف وہی دے سکتا تھا جسے عذرا کی موت کا اُتنا ہی رنج ہو جتنا اُسے خود تھا۔ اِس لئے اب وہ عموماً اپنی خالہ کے ہاں آنے جانے لگا۔ عذرا اپنی ماں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ عذرا کی موت سے اُس کی ماں بیچاری دیوانی سی ہو گئی، گھر بار سے، دوستوں عزیزوں سے اُس نے روگردانی کر لی۔ لہٰذا اگرچہ جمیل کو کچھ عرصہ اپنی غم زدہ خالہ سے اِس مشترک غم میں ایک دلی مصاحبت ہو گئی لیکن اِس کا اثر اُس پر بجائے اچھا ہونے کے بُرا ہؤا۔ کیونکہ جمیل ایک غایت درجہ حساس شخص تھا اور وہ اپنے غم کو نہ صرف جسمانی و قلبی بلکہ عقلی و ذہنی طور پر بھی محسوس کرتا تھا۔ غرض غم جمیل کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا۔ باپ بھی سر پر نہ تھا کہ پدرانہ شفقت اور بزرگانہ

سطوت سے کچھ اثر ڈال سکتا۔ ماں کو جمیل کا روز بروز رنجیدہ دیکھنا زہرِ قاتل تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ نرم دل ہو چکی تھی۔ اب بیٹے کے رنج و غم سے اُس کی طبیعت بالکل گداز ہو گئی اور سب عزیزانہ رنجشیں اور گلے شکوے بھول بھلا گئی ✦

عزیز کبھی ثروت کے پاس ہوتا تھا اور کبھی اپنی نانی اماں کے پاس اور کبھی کبھی اپنی دادی اماں کے ہاں بھی چلا آتا تھا۔ ماں نے سوچا کہ اِسی گھر میں جس میں اُس کے بیٹے نے بیوی کی محبت دیکھی ہے ہر وقت وہی محبت بیٹے کی آنکھوں میں پھرتی ہوگی۔ بہتر ہے کہ کسی طرح وہ کچھ عرصہ یہاں نہ رہنے پائے ✦ لہٰذا وہ علیم الدین کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ آپ اب جمیل کے باپ کی بجائے ہیں۔ غم سے اُس کا حال بُرا ہو رہا ہے۔ ذرا آپ ہی اُسے سمجھائیے۔ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے اور اُس پر آپ کے کہنے کا بڑا اثر ہے۔ علیم الدین نے کہا بہن! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری خواہش ہے کہ جمیل یہاں میرے پاس آجائے اور کچھ عرصہ "علیم منزل" ہی میں رہے۔ ماں نے بخوشی منظور کیا ✦

ایک روز جمیل کے پاس اُس کے چچا آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا! میں چاہتا ہوں تم ہمارے پاس آجاؤ کم از کم کچھ عرصہ تو ضرور میرے قریب آکر رہو کہ مجھے کئی باتوں میں تمہاری مشورت کی ضرورت ہے۔ عزیز بھی مجھے اس قدر پیارا لگتا ہے کہ جب کبھی گاؤں چلا آتا ہے تو صبح کو میرا جی کام کاج کو نہیں چاہتا۔ وہ علی الصباح میرے بستر پر آجاتا ہے اور کبھی میری مونچھیں نوچتا ہے کبھی میرے گالوں پر تھپڑ مارتا ہے۔ وہ ثروت کے ساتھ رہتا ہے اور اُسے ہی امی جان پکارتا ہے لیکن اکثر پوچھتا رہتا ہے کہ میرے ابا جان اب امی جان کے پاس کیوں نہیں آتے؟

چچا کی پُرخلوص شفقت سے جمیل کا دل بھر آیا۔ اُس کے منہ سے کچھ بن نہ پڑا۔ بستر باندھ سامان لے ساتھ ہو لیا۔ چچا نے کہا جمیل ذرا اپنی کتابیں بھی ضرور ساتھ لے چلو کہ مجھے اُن سے دلچسپی ہوگی۔ بہن نے کتابیں بکس میں بند کر کے ساتھ کر دیں ✦

ثروت جمیل کے غم کا حال سُن سُن کر غمگین و ملول ہو رہی تھی جب آیا تو دیکھا کہ پہچانا نہیں جاتا۔ بچہ گود میں تھا آنسو نکل پڑے اور اپنے کمرے میں چلی گئی ✦

جب سے جمیل "علیم منزل" میں آیا سبھی نے یہاں تک کہ منظور نے بھی جو گاہے گاہے سُسرال میں آیا جایا کرتا تھا اُس کی خاطر مُدارات اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ثروت عموماً عزیز کو اُس کے پاس لے آتی۔ منظور کبھی اُسے یونیورسٹی کے جدید ترین حالات سناتا اور کبھی اُن دِنوں کا تذکرہ کرنے لگتا۔ جب پہلے پہل جمیل کی اُس سے دوستی ہوئی۔ علیم الدین کبھی جمیل کی کوئی پسندیدہ کتاب باہم مل کر پڑھنے میں اُسے مصروف کر لیتے اور بدر النساء کبھی اُس سے گھر کے بیرونی انتظامات کراتیں اور کبھی منظور کی بے رُخی اور ثروت کی غمگینی کا ذکر چھیڑ دیتیں ✦

لیکن ان سب حیلوں حوالوں سے جمیل کی طبیعت ٹھکانے نہ ہوئی۔ وہ دوسروں کا دل رکھنے کے لئے اُن کے ساتھ باتیں کرنے اور ہاں میں ہاں ملانے کی کوشش کرتا لیکن اُس کے دل بہلاؤ کی صورت عموماً پیدا نہ ہوسکتی +

آخر ایک دن ثروت عزیز کو لئے اُس کے پاس آئی۔ عزیز رو رہا تھا اور بڑے بڑے آنسو اُس کے پیارے چہرے پر جاری تھے۔ جمیل نے بے چینی سے پوچھا کہ کیوں میرے لال! کیوں روتے ہو؟ ثروت نے الگ ہو کر چپکے سے جمیل کے کان میں کہا کہ بھائی! بچہ کسی بات پر مچل رہا تھا کسی نالائق خادمہ نے جھنجھلا کر اُسے کہہ دیا کہ تیری امی یہاں ہوتی تو تُو یہ شرارتیں نہ کرتا۔ اسی پر وہ امی جان امی جان پکارتا میرے کمرے کی طرف دوڑ آیا +

جمیل آب دیدہ ہوگیا اور بیٹے کو گود میں اُٹھا کر کہنے لگا میرے چاند! جب تک تیری امی جان تجھے منع نہ کیا کریں جو تیرے جی میں آئے کئے جایا کر۔ کوئی اَور ڈانٹ ڈپٹ کرے تو تُو میرے پاس دوڑ آیا کر +

پھر کیا تھا؟ عزیز ذرا ذرا سی بات پر بجائے ثروت کے پاس جانے کے جمیل کے پاس اپنی پیاری پیاری شکایتوں کی کہانی سنانے آجاتا اور اپنے ابا سے مل کر اپنے بچپن کے کھیل کھیلنے لگ جاتا +

اِس طرح جمیل کے لئے اک چھوٹا سا مشغلہ پیدا ہوگیا لیکن بچے سے اوجھل ہو کر وہ اکثر غم و اندوہ میں مستغرق رہتا۔ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن ثروت حسبِ معمول عزیز کو اپنی گودی میں اُٹھائے آئی اور جمیل کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی "بھائی! میں تم سے کچھ باتیں کرنی چاہتی ہوں + میں بچپن میں تم سے کھیلا کرتی تھی۔ اب اِس پیارے بچے سے کھیلتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ ابھی سے چشم بد دور اس قدر فہیم و ذکی ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا بچہ نہیں دیکھا۔ تمہارے رنج و غم کے متعلق یہ کبھی کبھی سوال کر بیٹھتا ہے تو میں نہیں جانتی کہ اِسے کیا جواب دوں؟ بھائی! اگر تمہارے غم کا ذرا سا سایہ بھی اِس پھول پر پڑ گیا تو یہ مرجھا کر رہ جائے گا۔ یہ تمہاری عذرا کی یادگار ہے یہ ہُو بہو اُس کی تصویر ہے اور اُس کی تصویر بھی دلپذیر و بے نظیر۔ چینی کی اک مُورت عقل کا اک کھلونا سا معصومی کا اک پُتلا سا! اب تمہاری خوش دلی ضروری ہے اِس کی خوشی کے لئے!

اور بھائی دنیا میں غم کسے نہیں؟ کون ہے جس کے دل میں درد کی کسک نہیں؟ کون ہے جس کی زندگی میں رنج و محن کی آندھیاں برپا نہیں؟

بھائی میرا دُکھ تمہارے غم سے کم ہے لیکن پھر بھی دُکھ ہے اک پُرانا دُکھ دُور نہ ہونے والا +

جمیل (کانپ کر) ثروت بہن! میرے دل کی تمنا ہے کہ تمہارا پُرانا دُکھ بھی میرے حصے میں آجائے۔ جہاں اتنا بارِ غم ہے وہاں ایک اَور بھی سہی۔ مجھے تو اب غم سے محبت ہوگئی ہے۔

ثروت برائے خدا غم سے یوں محبت نہ کرو۔

جمیل (آہ بھر کر) بہن! پھر اور کس سے کروں؟ محبت تو محبت والی کے ساتھ گئی۔ اب میرے لئے محبت کا زمانہ ختم ہو چکا اب میری محبت فقط میرے خیالات تک محدود رہیگی! اور تمہارا دکھ! معاف کرنا آج میرے منہ میں زبان ہے۔ تمہارے دُکھ نے مجھے اور عذرا دونوں کو ملول کر رکھا تھا، آج عذرا کا اور اپنا دونوں کا ملال میرے سینے میں ہے تمہارے لئے میری بہن! خدا تمہیں اتنا ہی شاد و آباد کرے جتنا اُس نے مجھے اندوہ ناک و غمگین بنا دیا ہے +

ثروت میں نا چیز بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ جو خدمت بھائی کی مجھ سے ہو سکے گی میں اُس کے لئے حاضر ہوں! بچپن کے دن گزر گئے لیکن بچپن کی یاد باقی ہے۔ عذرا چلی گئی لیکن وہ محبت جو وہ مجھ سے کیا کرتی تھی میرے پہلو میں چھوڑ گئی۔ عذرا جیتے جی میرے غموں کی غمگسار رہتی۔ مگر اُس نے میرے لئے وہ ننھا سا تحفہ چھوڑا جو میری زندگی کی تنہا مسرت ہے +

جمیل مجھے خوشی ہے کہ عزیز کے دم سے تم بھی کچھ خوش ہو۔ عزیز سے تمہاری محبت کا میں کیا صلہ دے سکتا ہوں، کچھ نہیں!

ثروت دے سکتے ہو بھائی دے سکتے ہو! بس یہی کہ خوش رہو اور خدا کے حکم پر شاکر! برائے خدا تم تنِ تنہا نہ رہا کرو گھر میں ہو تو تمہارا اک چاند سا لڑکا ہے اور پھر ہم سب حاضر ہیں۔ باہر جاؤ تو ہر جا قدرتِ خداوندی کا جلوہ ہے اور خود خدا کا ہر طرف سامنا ہے! بھائی! گھر میں تنہا نہ بیٹھا کرو اِس سے کبھی کبھی باہر چلے جانا بدرجہا بہتر ہے کہ وہاں عُزلت میں ایک صحبت ملتی ہے جو محبت کی پیامی ہے!

∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

---

(۹)

جمیل خواب دیکھ رہا ہے!

باغ میں چاندنی رات ہے۔ فضا میں یہ کیفیت ہے گویا کسی نے چاندی کا بُرادہ ہر سو بکھیر دیا ہے۔ زمین پر یہ عالم ہے گویا موسیقی عطر کا جامہ زیبِ تن کئے محوِ رقص ہے۔ اک عالیشان عمارت کا سامنا ہے، تالابوں اور آبشاروں کا سلسلہ ہے۔ اِسی نسیان و حسن کے چمن میں ایک ننھے سے جھرنے کے قریب دو کمسن ایک دوسرے کا ہاتھ سنبھالے بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں ——— کہ اتنے میں ریل گاڑی شالامار کے بڑے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ چند احباب و اقربا ایک نوجوان کو رخصت کرنے آئے ہیں . . . . ٹرین چل پڑتی ہے، چلتی ہے۔ دِن

گزرے جاتے ہیں لیکن وہ بدستور چلے جاتی ہے۔ نوجوان سمجھتا ہے کہ اب تک تو زمین کی ساری وسعت بھی ختم ہونے کو ہوگی، ناآ
کی بار تو فی الحقیقت وہ کسی اور کرۂ زمین کو جارہا ہے۔ یہ سوچ کر ڈر سے کانپنے لگتا ہے ـــــــــــ کہ آن
کی آن میں اپنے سونے کے کمرے میں میز پر بیٹھا یہ لکھ رہا ہے:۔

"پیاری! میرے لئے تو کبھی سن رسیدہ نہ ہوگی۔ پیاری! میرے لئے تو ہمیشہ ہی نوجوان ہے، اس لئے
کہ پیاری! میرے لئے تو ہمیشہ ہمیشہ اک دوشیزہ ہے! اے نیک و پاک! اے سچے دل والی! اے
ہمیشہ وفادار! اے بندۂ پروردگار! تیرا حسن تیری نیکی ہے اور تیری نیکی تیرا حسن!

جب میرا دل ابھی ایک نوخیز پودے کی طرح نرم و نازک تھا تو تیری محبت کی نسیم اُس کے چمن میں آئی
اور وہ اُس کے جھولے میں جھولا۔ تجھے شاید علم نہ تھا کہ تیرا وجود میرے لئے کیا معنی رکھتا تھا؟ تجھے شاید پروانہ
تھی کہ تیرے معصوم حسن نے کسی کی دنیا کو کیونکر تہ و بالا کرنے کا سامان پیدا کردیا؟ شاید برسوں بعد تجھے پتہ چلا
کہ میں تیری خوبی و محبوبی کا دلدادہ تھا! (یہاں جی ہی جی میں اپنے سے بھی چوری چوری چاہتا ہے کہ کوئی
آئے اور کسی طرح اِس لکھے ہوئے کو دیکھ پائے)

پھر میں عیش و تنعم کا دلدادہ ہوگیا اور تو کلفت و اندوہ کا شکار! میں تیری محبت سے ناآشنا ہوگیا
اور تیرے حال سے یکسر ناآگاہ!

لیکن آج بھی برسوں کے بعد" ـــــــــــ یہ لکھتے لکھتے رُک جاتا ہے پھر یک لخت قلم میز پر پھینک
کر کاغذ کو پرزے پرزے کردیتا ہے اور "ہائے" کہہ کر ـــــــــــ جاگ اُٹھتا ہے!

کمرے میں گھُپ اندھیرا ہے۔ گھر میں خاموشی چھائی ہے۔ باہر درخت سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کتے
کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے!

جمیل کے روح و رواں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اُس نے ایک ایسی گہری سانس لی کہ اُس کے نظامِ عصبی کے کونے کونے
میں اک برقی سا ارتعاش دوڑ گیا + اُس کی پیشانی عرقِ شرم سے پُرنم ہوگئی اور بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے +
اُس وقت اُس کی حالت اُس حساس شخص کی سی تھی جو بغیر کوئی ظاہرہ گناہ کئے جی کے اندر ہی اندر اپنی لغزشوں سے
یک لخت آگاہ ہوکر ساری دنیا کے آگے ہاتھ جوڑ دینے کو تیار ہو +

بیچارا جمیل! اُسے خالق کے بنائے ہوئے اپنے مجبور و مقہور نفس پر کتنا اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے مدفون جذبات
کے اِس جبری انکشاف کا سدِ باب کرسکتا + بچپن کی یاد تو خیر معصوم تھی نوجوانی کا قصہ بھی کچھ ایسا مذموم نہ تھا لیکن وفادار

عذرا کی موت کے بعد شادی شدہ غم زدہ ثروت سے خواب میں بھی یہ مُخاطبت کبھی طرح روا نہ تھی + وہ نظری گناہ کا مرتکب نہ تھا لیکن اِس باب میں خیالی گناہ بھی اُس کے لئے سوہانِ روح تھا +

وہ بولا ثروت نے جو کہا درست کہا۔ مجھے اپنے غموں میں مغموم نہ رہنا چاہئے۔ ان غموں نے مجھے سیدھی راہ نہیں دکھائی۔ مجھے اب کسی اَور نامعلوم سرزمین کی طرف رُخ کرنا چاہئے جہاں کوئی ہم خیال رہنما مدت سے میرا رستہ دیکھ رہا ہے !

(۱۰)

دوسرے روز جمیل علی الصباح جب ثروت نماز پڑھ رہی تھی باہر لارنس باغ کی طرف اور وہاں سے شالامار کی جانب چل کھڑا ہُوا۔ وہاں پہنچا تو عجب عالم تھا کہ سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم، میدانی پرندے چہچہا رہے تھے، باغبانی پھول لہلہا رہے تھے۔ درخت جھومتے تھے اور سبزہ و گل کو چومتے تھے +

جمیل پر محویت کا اک عالم طاری ہوگیا + نہروں میں پانی کی روانی اور باغِ کہن میں درختوں کا سناٹا اُسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ وہ دنیا کے قریب تھا لیکن دنیا سے گویا کوسوں دُور۔ وہی دن رات کے زمین و آسمان اُس کے پیشِ نظر تھے لیکن اُسے کچھ ایسا محسوس ہُوا گویا زمین پر وہ اور آسمان پر ربِ دوجہاں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا اور کچھ کہتا ہے۔ نہیں نہیں بلکہ اُس کی جلوہ پاشیاں عطرِ حسن بن کر زمین پر اپنی گنگا جمنی بارش کر رہی تھیں۔ وہ پرندوں کے رنگین پر وہ پھولوں کی نازک پنکھڑیاں وہ روشنی کی سیمین و زریں کرنوں میں پرتو افگن ہو رہا تھا۔ نسیم سرگوشیاں کر رہی تھی، چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور پانی بھی بار بار یہ راگ اَلاپ رہا تھا کہ وہ یہاں ہے اور یہیں ہے ! جمیل نے سوچا کس قدر دلکش ہے یہ آسمان اور یہ فضا یہ زمین اور یہ سبزہ زار، کتنے حسین ہیں یہ پھول پتے کتنی شیریں ہے پرندوں کی یہ چہکار، پھر دنیا کیسے اپنے جادۂ منضبط پر رواں و گرداں ہے۔ سورج کس قدر بڑا چاند کس قدر پیارا اور تارے کس قدر دور دراز ہیں + یہ منظر ہمارے پیشِ نظر ہے اور ہم وہی اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف ہیں منہمک ہیں۔ زندگی کے بحرِ ذخار میں ہمارے جسم و جان کی کشتی ڈگمگا رہی ہے لیکن چلی جاتی ہے جب تک کہ ڈوب نہیں جاتی + اور ہمارے دن رات کی خواہشوں اور کوششوں میں ہمارے روزمرہ کے حالات و واقعات میں اسباب و نتائج کا اک عجیب و غریب سلسلہ قائم ہے + یہ سب کچھ راست ہے اور راستی کی جانب رواں ہے + جمیل نے بآوازِ بلند کہا میرے رنج و محن اور میری کلفتیں بھی سب اے میرے رحیم و رحمٰن میری لغزشوں کی سزائیں او میری ترقی کی راہیں ہیں +

وہ اِن خیالات میں محو و مستغرق تھا کہ یک لخت خدا جانے کیوں اک عجیب شوخی کے ساتھ وہ اچھل پڑا! اور یکسر مسرور و شاداں ہوگیا اور بول اٹھا میرے اچھے دلبر! تُو جو کچھ کر رہا ہے میری بھلائی کے لئے ۔ تو جدھر مجھے لے جا رہا ہے اِسی لئے لے جاتا ہے کہ میں جلد سے جلد تجھے پالوں اور تیرے پیارے چہرے کا دیدار کروں، تیرا وہ چہرہ جو حسین و دلکش ہے تیرا وہ چہرہ جو دلپذیر و دلفریب ہے۔ ہائے تو مجھے اِس بھری دنیا سے اٹھا لے اور اپنے قدموں میں جگہ دے میرے پیارے آقا! ———

لیکن نہیں مجھ کو ابھی یہیں رہنا ہے تیرا حکم یہی ہے یہی تیری تمنا ہے مجھ سے ۔ تو چاہتا ہے کہ میں اس تہ و بالا جہان میں تیرا کام کروں جب تک کہ کام میرے لئے ہو + میں کیوں نہ کروں گا کہ اب اِس کام کی کلفتیں بھی میری مسرتیں ہیں + مجھے تو نے بھیجا ہے کہ بُرا بھلا جو کچھ مجھ سے بن پڑے میں کروں ۔ تیری اس دنیا میں ہزاروں دُکھی ہیں میری اپنی ہی پہنچ میں صدہا غمگین و رنجیدہ بیسیوں بیچارے متکبر و سرکش انسان ہیں جنہیں میری ہمدردی اور میری ناچیز رہنمائی کی ضرورت ہے ۔ دنیا مجبورِ غم اور پامالِ فساد ہے اور میں ہوں کہ اک اپنا خود غرض الم لئے ہوئے سر بہ گریباں ہوں + پیارے! میں کیا جانوں تیری خلوت میں میرے لئے کیا کچھ رکھا ہے؛ ہاں مجھے کامل یقین ہے کہ یہاں سے دُور بہت دُور رنگ و بُو کی اک پاکیزہ دنیا میں میرے بے تاب بچپن کی بھولی بھالی تمنائیں میری جوانی کی پُرجوش بے قراریاں اور میری بعد کی تباہ کن مایوسیاں اُس بچی طفلانہ مصاحبت اُس گہری پائدار محبت سے پھر دوچار ہوں گی جو میری مصیبت و ناکامی کے طوفانِ آتشیں میں سے گزر کر اب تیری حضوری کے سکون و اطمینان میں میرا انتظار کر رہی ہے +

کس قدر کیف آور ہوگی وہ گھڑی جب اِک آسمانی فضا میں جہاں دنیا کے شور و غل کی رسائی نہیں میں عصمت و عفت کی آنکھوں سے اُس معصوم و مامون محبت کا نظارہ کروں گا جس کی کلی باغِ عالم کی مسموم ہواؤں میں پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا جاتی ہے ۔ کس قدر شیریں و رنگیں ہوگی وہ ساعت جب میری محبت اِن آنی جانی کامرانیوں سے آزاد ہو کر اُس ازلی حسن کی قوسِ قزح کے جھولے میں جھولے گی جو کائنات کے افق پر اپنا پرتو ڈالے ہوئے ہے!

یہ سب تیرے تحائف ہوں گے میرے لئے تو کیا اے چاند سے مکھڑے والے اے بچوں سے دل والے! تو جو میری سچی خوشیوں کا امانت دار ہے کیا میں تیری رضا پر راضی نہیں + نہیں تیری خوشنودی اور تیری اُس محبت کی تمنا میں جس کے لئے برسوں سے میں سرگرداں ہوں میں اپنی زندگی کو بدل ڈالوں گا، اپنے نصب العین کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھوں گا اور تیرے اُس جلوے سے تیری اُس صورت سے روز و شب دوچار رہوں گا جسے میں نے آج دیکھ پایا ہے + تُو ہے اور میرے لئے ہے جب تک کہ میں تیرے لئے ہوں ۔ تُو میرے سامنے ہے جب تک کہ میں تجھے دیکھتا رہوں ۔ تُو مجھ سے ہمکلام ہے جب تک کہ میں تجھے سنتا اور تجھ سے بولتا رہوں +

جمیل کی اُس روز سے عجیب کیفیت ہوگئی۔ کوئی عالمِ طبیعیات کوئی ماہرِ نفسیات اُسے شاید دیوانہ کہتا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ دیوانہ نہ تھا۔ اُسے ہر نظارے ہر شے اور ہر شخص میں ایک نور محسوس ہونے لگا۔ وہ تمام چہروں اور تمام شخصوں میں ایک ہی رحیم و زندہ محبت کرنے والے خدائے قدیر کی شخصیت کو جاری و ساری دیکھنے لگا ۔

کیا یہ نہ تھی اُس پاکیزہ محبت کی تکمیل جو کبھی بچپن کے چمن میں ثروت کے معصوم حُسن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی؟

اُسے کسی شے سے نفرت نہ رہی اُسے ہر ایک سے محبت ہوگئی۔ وہ ہر بات کی تہ کو پہنچنا چاہتا وہ ہر کام میں قدرت کی کوئی غرض دیکھتا ۔ بعض وقت وہ گزرتے ہوئے آدمیوں ہی کو بغور دیکھنے لگتا اور اُن کے چہروں کو استعجاب سے دیکھتا اور سبحان اللہ کہہ اٹھتا ۔ اُس کا خیال ہوگیا کہ کوئی شخص بُرا نہیں صرف اُسے اپنی یا کسی دوسرے کی رہنمائی کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے حقیقی سود و زیاں کو سمجھ لے ۔

اِس انقلاب روحانی اور اس وجدانِ قلبی کے ساتھ اُس کا کرب و اندوہ اطمینان و مسرت میں تبدیل ہوگیا ۔

لیکن وہ نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ دن رات اُسے یہ دُھن لگ گئی کہ کسی طرح اپنے عزیزوں اور دوستوں اور اَور بھی جتنے لوگوں کو ممکن ہو وہ دلبرِ حقیقی کا پیغامِ محبت اور سچی خوشی کا سیدھا عملی راستہ دکھا دے ۔

اور یہی اُس کا کام ہوگیا۔ اب وہ قلبی غم سے ناآشنا اور جسمانی کلفت سے ناآگاہ تھا۔ کیونکہ اگر کبھی (اور یہ کم اتفاق ہوتا) اُسے کوئی تکلیف یا مصیبت پڑتی بھی تو وہ یہ سمجھ کر اَور بھی مسرور و مطمئن ہوجاتا کہ یہ پیغام ہے میرے خدا کا میرے لئے ۔ اِسی طرح اس نے اَوروں کو قول و عمل سے نیکی و مسرّت کی تعلیم دی ۔

ہر کوئی اُس کے حلم و خلوص اور محبت و خیرطلبی سے بغایت متاثر ہُوا۔ اور اُس کا تھوڑا بہت اثر اُن تمام اشخاص پر ہُوا جن سے اُس کا واسطہ پڑا ۔

وہ رُوٹھے ہوئے عزیزوں کی غلط فہمیاں دور کرتا۔ غم ودرد پر عقل و اعتقاد کا مرہم لگاتا۔ غربا و مساکین اور مدارس و مجالس کے لئے مناسب خیرات دینے کی ترغیب دیتا ۔

گو وہ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا اُس کے خیالات اک قسم کی گہری عبادت اور اُس کے تصورات اک نوع کی سچی معرفت تھے جن میں دل کے اندر ہی اندر وہ روز و شب محو رہتا ۔

وہ تارک الدنیا نہ تھا اِس لئے عقل پسند اُس کی حقیقت بینی کو مذہبی جنون نہ کہہ سکے ۔ وہ حریص و غرض مند نہ تھا اس لئے مذہبی لوگ اُس کی اصلاح و ترقی کی تحریکات کو حرص و ہوا سے تعبیر نہ کرسکے ۔

وہ عزیز جن کا اُس سے دن رات واسطہ پڑتا تھا اُس کی نیک روش سے متحیر رہ گئے ۔ غصّے کا اُس کی طبیعت میں

شائبہ بھی نہ رہا۔ رشک وحسد سے وہ اجنبی ہو گیا۔ غرور کبھی اُس کے دل میں بھی محسوس نہ ہُوا +

اُس کی طبیعت کی کمزوریاں قوتیں ہو گئیں۔ وہ زر پرستی سے بیزار ہو گیا اور فقیروں اور نوکروں پر بھی اُس کی شفقت بھری نظریں پڑنے لگیں +

وہ بارہا اپنی گزشتہ لغزشوں کا علانیہ اعتراف کرتا تھا، اور اب بھی روزمرہ جو غلطیاں اُس سے سرزد ہوتی تھیں وہ فوراً اُن کا جی میں یا ضرورت ہو تو دوسروں کے سامنے اعتراف کرکے آیندہ کی اصلاح وبہبود کی طرف مائل ہوتا۔ اُس کا قول تھا کہ طُول طویل ندامتیں لاحاصل ہیں۔ اور استغفار سے ترکِ گناہ بدرجہا بہتر ہے !

اُس کی تبدیلیٔ فطرت اور تبدیل شدہ شخصیت کا سب سے نمایاں اور زبردست اثر "علیم منزل" میں رونما ہُوا +

ثروت جمیل کے اِس انقلابِ قلبی پر شروع شروع میں بہت خوش ومطمئن ہوئی لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے وہ حیران ومبہوت ہوتی گئی + کیا یہی وہ جمیل تھا جو بچپن کے دنوں میں اُس سے محوِ بازی رہتا تھا؛ جس کی نگاہیں عنفوانِ شباب کے زمانے میں برابر اُس پر جمی رہتی تھیں، جس کی پھر مدتوں اُس نے شکل بھی نہ دیکھی، جو بعد میں شاید دنیادار سا بن گیا اور اب یہ کیفیت ہے کہ اُس کی نگاہیں ہمدردی اُس کا چہرہ محبت اور اُس کی گفتگو کوئی آسمانی پیام معلوم ہوتی ہے +

اُس کی تنہائی سے کبھی اُس کا جی بھر آتا لیکن پھر اُس کو مطمئن دیکھ کر وہ اُس کا منہ تکنے لگتی کہ یہ کیسا انسان ہے جو تنہائی میں بھی یوں اطمینان رکھتا ہے +

ایک روز وہ نہ رہ سکی اور اُس سے کہنے لگی "میرے اچھے بھائی! میں تمہیں مطمئن دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ میں نے آج تک کسی میں یہ بات نہیں دیکھی جو تمہاری بات بات میں عیاں ہے !

جمیل نے شرما کر جواب دیا: مجھ سے کیسی عداوت سوجھی ہے کہ آج تم میری تعریف کرنے لگی ہو۔ بہن! میں اس مدح سرائی کے قابل نہیں +

ثروت نے کہا افسوس! تم یہ کہتے ہو بھائی! اگرچہ تم خوب جانتے ہو کہ میں نے آج تک کبھی تمہاری بے جا تعریف نہیں کی لیکن اب تو میں تم کو دیکھتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خدایا عزیز کے سر پر اُس کے اچھے باپ کو سلامت رکھیو +

ثروت کے دل پر تو عزیز کے باپ جمیل، بچپن کے ساتھی جمیل کی نیک شخصیت کا اثر ہونا ہی تھا۔ وہ کبھی اُس کے لئے خلوص سے دعا کرتی اور کبھی ایک لمبی سرد آہ بھرتی جس کی حسرت کے خدا جانے کیا معنی تھے۔ وہ تو روز بروز جمیل کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی رہی لیکن تعجب یہ تھا کہ منظور بھی آہستہ آہستہ اُس کا حلقہ بگوش ہوتا گیا +

منظور جو کبھی سالوں ہوئے گورنمنٹ کالج میں جمیل کا سب سے گہرا دوست تھا ثروت سے شادی کرنے کے بعد جمیل

سے بالکل بے اعتنائی برتنے لگا اور یہ بے توجہی روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ آپس میں وہ بول چال کے روادار بھی نہ رہے لیکن عذرا کی موت کے بعد جمیل کے غم واندوہ سے کس پتھر کا دل تھا کہ موم نہ ہو جاتا۔ اور پھر اُس کے روحانی انقلاب کے بعد منظور پر بے تیریزاُس کا نفسی اثر پڑا۔ وہ گویا اک سُورج تھا جس کے آگے نشاط وہوس کی تاریکیاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکیں۔ وہ گویا اک برقی قوت تھا جو آن کی آن میں دیکھنے والے کی روح وروان میں سرایت کر گئی +

ایک روز جمیل نے منظور سے کہا "بھائی! مجھے معاف کرنا میں نے اک مدت تک تمہاری دوستی کا حق ادا نہ کیا۔ تم مجھ سے روٹھ گئے اور میں نے تم کو منایا تک بھی نہیں" +

منظور کی پیشانی پر پسینہ آگیا اور اُس نے جواب دیا "جمیل! کیا کہتے ہو؟ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہو؟ معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے نہ کہ تم کو۔ تم نے مجھے اِس گھر کی راہ دکھائی اور میں نے تمہارا رستہ نہ دیکھا + بھائی! آؤ پھر دوست اور بھائی بھائی بن جائیں۔ تم زندگی کی پیچیدگیوں میں میری کلید مراد ہو + جمیل! میرے پیارے بھائی! تم نے مجھ سے معافی مانگ کر میری زندگی کی تنہا مسرت مجھ سے چھین لی + تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر کتنا نادم ہوتا رہا ہوں۔ آج تم نے خود موقع دیا کہ میں اپنے تئیں تمہارے سپرد کردوں + جب سے تم یہاں آئے ہو میں اپنی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہوں" +

جمیل نے کہا "ہر چند میں تمہاری عنایات کے قابل نہیں ہوں لیکن تمہاری دوستی اب پھر میرے دل میں موج زن ہے۔ البتہ اس پر ایک تاریک بادل چھایا ہوا ہے جو سچ پوچھو تو تمہاری ساری زندگی کو بھی تیرہ وتار کر رہا ہے + منظور کیا یہ ثروت کا قصور ہے کہ اُس کے ہاں ابھی تک بچہ پیدا نہیں ہوا۔ اُس کی بدقسمتی پر تمہاری بے اعتنائی! آہ! تمہارے نزدیک یہ کیونکر روا ہو سکتی ہے؟ + کہتے ہیں مغرب میں عورت سرکش ہے تو کیا یہاں مرد ظالم وجابر نہیں؟ پھر جب خدا و انسان دونوں ہی عورت کے خلاف سازش کرلیں تو اُس بیچاری کی خبر لینے والا اُس کے ساتھ انصاف کرنے والا کون ہو؟ بھائی! عذرا جب تک زندہ رہی مجھ میں اُس میں سچی محبت قائم رہی میں نے مقدور بھر اُس کی دلجوئی کی پھر بھی جب سے وہ مجھے اِس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی ہے دن میں بیسیوں بار میں اپنے تئیں ملامت کرتا ہوں کہ حیف ہے مجھ پر فلاں روز میں نے اُسے یہ کیوں کہا اور اُس کے لئے وہ کیوں نہ کیا! منظور خدا گواہ ہے کہ میری زندگی کی دلی تمنا یہ ہے کہ تم دونوں کو دوبارہ متحد اور باہمد گر وابستہ دیکھوں +

منظور نے کہا بھائی! میں اس درخواست سے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا ہوں لیکن جو ستم ثروت پر میں آج تک ڈھا چکا ہوں اُس عذاب دہی کی تلافی اب کیسے کروں؟ +

جمیل بولا:- پچھلے گناہوں کو آئندہ نیکیاں ہمیشہ دھو ڈالتی ہیں۔ اور محبت کو تو پچھلے گلے شکوے بھول جانے کی خاص

عادت ہے۔ میرے اچھے بھائی! اپنے چاند کی چاندنی کو اپنے دل میں بس جانے دو۔ اس زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ یہ راتیں گئی پھر واپس نہ آئیں گی!

اُسی رات منظور ثروت کے کمرے میں گیا۔ ثروت حیران ہو گئی کہ آج اس غیر معمولی وقت پر آنے کے کیا معنی ہیں؟

ثروت خیر تو ہے؟

منظور میری پیاری ثروت میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔

ثروت کاہے کی؟

منظور اپنی عمر بھر کی بے پروائیوں کی۔

ثروت (آنکھوں میں آنسو بھر کر) کبھی مرد بھی عورت سے معافی مانگتے ہیں؛ معافی تو صرف بیچاری عورت کے لئے بنی ہے آخر وہ کیا وجہ ہوئی کہ آج تم مجھ بدبخت کے پاس آ گئے؟

منظور اب جمیل پہلے کی طرح میرا دوست ہے اور تم پہلے کی طرح میری رفیقِ زندگی۔ پیاری ثروت! کیا تم مجھے معاف نہ کرو گی؟

ثروت میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ مرد بھی قصور کرے تو معافی ہمیشہ عورت ہی مانگتی ہے + لیکن منظور تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے؟ میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیا تم یہ بھول گئے؟

منظور بیوی رفیقِ زندگی ہوتی ہے محض تولیدی کل نہیں ہوتی۔

ثروت حضور کہیں سے آج بہت سی عقل سیکھ کے آئے ہیں یہ کیا ماجرا ہے؟

منظور یہ سب جمیل کی عنایات ہیں ہم پر۔

ثروت (آہ بھر کر۔ کچھ توقف کے بعد) اب تم پھر مجھے وہی پرانے منظور معلوم ہوتے ہو۔ میں تو وہی بدقسمت ثروت ہوں مگر ہوں تمہاری بیوی جو تم سے مرتے دم تک وابستہ رہے گی!

منظور نے ثروت کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک میاں بیوی میں محبت کی باتیں ہوتی رہیں +

ثروت کے لئے یہ رات شبِ برات سے کم نہ تھی۔ مصیبت کے دھوآں دھار بادلوں میں سے چاند نے پھر اپنی جھلک دکھائی تھی۔ اُس کا کھویا ہوا موتی پھر اُسے مل گیا تھا +

جب منظور چلا گیا تو ثروت کا دل جمیل کے لئے اک اُداس شکر گزاری کے جذبۂ الفت سے لبریز ہو گیا اور رنگین خوشی کے آنسو اُس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے +

جمیل نے جو بچپن میں ناکامِ محبت تھا جس نے عین شباب میں دستِ اجل کا صدمہ سہا اُس نے اب اپنی زندگی کی تنہائی میں بچھڑے ہوئے دلوں کی باہمی مصالحت و قربت کا سامان پیدا کر دیا +

جمیل کے لئے ثروت کی خانگی مسرت خوشی کا باعث ہوئی لیکن جمیل کو دنیا کی کونسی خوشی حاصل تھی جس سے ثروت مسرور و مطمئن ہوتی +

---

(۱۱)

اِس کے دس ماہ بعد ثروت کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جمیل کے کہنے پر نکہت رکھا گیا +

جمیل کی دعا سُنی گئی۔ ثروت کا ایثار درگاہِ حق میں قبول ہؤا۔ منظور کا استغفار پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا!

اس کے دو ماہ بعد جمیل سخت بیمار ہو گیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر راہیِ ملکِ عدم ہؤا +

---

(۱۲)

تیرہ سال بعد کا واقعہ ہے!

وہی تیرھویں کا چاند آسمان پر جلوہ گر تھا۔ وہی تارے کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔ اُسی طرح کچھ ننھی ننھی بدلیاں فضا میں منڈلا رہی تھیں + شالامار کے وسطی خطے میں آبشار و چادرِ آب کا زور اور فواروں کے ٹپکتے ہوئے پانیوں کا یہ شور تھا کہ ساون بھادوں کے قریب کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی!

فضا میں اک جانفزا خاموشی کا عالم طاری تھا۔ باغ میں اک دلکش شورش کے شادیانے بج رہے تھے + ایک نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے آخری خطۂ باغ میں آبجو کے کنارے کنارے محوِ گلگشت تھے:

نوجوان نے کہا۔ "میری پیاری تُو باغِ حیات میں میرے دل کے پھول کی نکہت ہے"!

حسینہ نے کہا۔ "میرے عزیز تُو دنیا بھر میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے"!

ثروت نے اِک چنبیلی کے پودے کی آڑ میں یہ شیریں گفتگو سُن پائی۔ پہلے وہ ذرا مُسکرائی پھر کچھ آبدیدہ ہوئی لیکن آخر مسرت کی اک برقی رو اُس کے روح و رواں میں دوڑ گئی +

اِس کے چار سال بعد عزیز و نکہت کی شادی ہو گئی +

یہ تھی تکمیلِ محبت!

بشیر احمد

درسِ توکّل

تجھے کیا فکر ہے اے دل، تجھے کس بات کا کھٹکا
خدا کا نام لے، اُٹھ اور سرگرمِ سفر ہو جا
اگر دشوار ہے منزل تو ہونے دے، نہ تو گھبرا
نہیں زادِ سفر ممکن، نہ ہو اس کی کچھ پروا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

تذبذب تا بکے اب شانِ استقلال پیدا کر
تلاشِ رہبرِ منزل نہ کر، خود اپنا بن رہبر
بھروسا رکھ خدا پر اور اپنے دست و بازو پر
تجھے کیا غم، اگر کوئی نہیں ہے ہم سفر تیرا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

یہ مانا راستہ پُرخار ہے اور دُور ہے منزل
نئی افتاد ہے ہر ہر قدم پر اور نئی مشکل
مگر صدقِ طلب کے روبرو اوہام ہیں باطل
کوئی سنگِ گراں رستہ میں حائل ہو نہیں سکتا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

نہ کر کچھ فکرِ تنہائی، نہ گھبرا شامِ غربت سے
ہر اک منظر نظر کش ہے زیادہ صحنِ جنت سے
مبدّل ہو گا یہ رنجِ سفر اک روز راحت سے
یقیناً کامیابی کا بندھے گا تیرے سر سہرا
خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

بس اب عزمِ سفر کر بے نیازِ این و آں ہو کر
قدم آگے بڑھا اپنا تو میرِ کارواں ہو کر
لگا دے راہ پر سب کو عناں گیرِ جہاں ہو کر
بتا دے بے تکلّف سب کو یہ گُر کامیابی کا
خُدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را

ابُوالفضل ےؔ از چاندپوری

تصویرِ وفا

(۱)

[illegible] نے اپنے سامنے والی دوشیزہ سے اک ذرا نظر ملائی تھی کہ اس کا منچلا دل اس کی سرور آفرین نظروں میں ہچکولے لینے لگا۔

اپنی بے اختیار سانس کو بہزار دشواری قابو میں کرتے ہوئے اس نے کہا۔ " آہ تم نے! تم نے بڑی محبت کا ثبوت دیا ——— بڑا ایثار برتا۔ اور پھر یہ سب کچھ میرے لئے! ——— تمہاری محبت کے صدقے۔ بڑا احسان کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر بفرضِ محال تم خسرو کو منظور کر لیتیں؟ ——— وہ اپنے باپ کے سارے کاروبار اور جائداد پر عنقریب بلا شرکتِ غیرے پورا اختیار حاصل کرے گا۔ پھر خیال تو کرو تم کتنے بڑے مالدار کی بیوی ہوتیں "

"مگر مجھے مالدار بننے کی کبھی تمنا ہی نہیں ہوئی۔ ہر [illegible]! میں تو اپنی زندگی کے دامن کو نمایشی اطمینان و آسایش سے بچا کر مسرتِ حقیقی کی گلکاریوں سے مزین دیکھنا چاہتی ہوں جو تم ہی انصاف سے کہو کتنی متبرک اور انمول شے ہے ——— اور پھر بھلا اس شخص سے جس سے مجھے کوئی انسیت ہی نہ ہو اپنی قسمت وابستہ کرنے کے بعد کسی خوشی کا وہم و گمان ہونا میری نادانی نہ ہوتی؟ ——— لیکن سچ کہنا۔ تمہیں [illegible] کی قسم کیا واقعی تم کو مجھ سے محبت ہے؟"

وہ یہ کہہ کر مسکرا دی ——— اس ادا سے جس میں شاعرانہ مبالغہ سے برطرف واقعی ایسا معلوم ہوا کہ صدہا بجلیاں کوند گئیں۔ [illegible] موقعے ایسے گزر چکے تھے کہ اس نے یہ سوال محض اس لالچ اور تمنا سے کیا تھا کہ وہ اس کا حسبِ دلخواہ جواب ایک بار پھر اسی زبان سے سُنے جو اس کی ساری آرزوؤں اور ارمانوں کا حاصل تھا ——— کہنے کے ساتھ ہی وہ شرمائی لجائی ایک دلفریب ادا کے ساتھ سامنے والی میز پر جھکی اور الھڑپن کی لاپروائی سے اپنا نازک مرمریں ہاتھ پھیلا دیا۔ اس کی سبک انگلی میں ایک خوشنما ہیرے کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

مذہبی اصول کے مطابق صبح ہی ان کی شادی ہوئی تھی ——— وہ شادی جو اب تک صیغۂ راز میں تھی اور ہر طرح خفیہ طور پر عمل میں لائی گئی تھی۔ دونوں نو آموزِ الفت۔ نوعمر۔ بیس بائیس کا سن۔ ناتجربہ کار۔ دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ——— مگر رشتۂ محبت میں اس طرح جکڑے ہوئے کہ کوئی دنیاوی ہستی ان کو جدا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکتی تھی۔

خفیہ شادی کا لازمی نتیجہ لڑکی والوں کی ناخوشی کا اظہار تھا۔ لڑکا حقیقتاً خوشحال نہ تھا۔ کہنے کو وہ اپنے آپ کو فوٹوگرافر

مصور۔ سب ہی کچھ کہتا اور مہینے میں پچاس ساٹھ اس ذریعہ سے کما بھی لیتا مگر وہ خود اس کے ذاتی مصارف کے لئے کافی نہ ہوتے تھے چہ جائیکہ اب ایک اور شریک زندگی کے اخراجات! ۔ ظاہرا کوئی صورت اضافۂ آمدنی کی بھی نہ معلوم ہوتی تھی ۔

لڑکی کا باپ! شہر کا بڑا سوداگر۔ مسلّمہ رئیس ۔ وہ اور اس کے گھر والے روپے کی قیمت اور اس کے اصراف کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے ۔ دوشیزہ! خود بے حد حسین تھی ۔ نازک اندام ۔ چھریرہ جسم ۔ لمبے لمبے سیاہ بال ۔ بتیسی ۔ جیسے مخملی ڈبیا میں سچے موتیوں کی دو قطاریں ۔ بڑی بڑی ۔ سیاہ پلکوں والی مخمور آنکھیں ۔ گلابی کاغذی ہونٹ ۔ غرض یہ کہ اس کی شباب آفریں ہستی کسی کی آغوش تمنا سے ہم کنار ہونے کی تلاش سے مستغنی تھی ۔ سینکڑوں تھے جو ہر دم اس پر پروانہ وار نثار ہونے کو [illegible] ایسے بھی تھے جو اس کی ایک ادائے تبسم پر نقدِ دل ۔ نقد جان ۔ سب ہی کچھ قربان کرنے پر آمادہ تھے ۔ مثالاً مذکرہ بالا خسرو کو لیجئے ۔ وہ واقعی اس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا ۔ اس کے والدین بھی اُس کو سر آنکھوں پر لیتے ــــــ مگر لڑکی! ۔ محبت کی دیوی ۔ محبت کی پجاری ۔ اور محبت ہی کی بھوکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ سب طرف سے آنکھیں موند کر اس نے ایک غریب نادار مصور کو محض محبت کے نشہ سے بے خود ہو کر اپنا سرمایۂ حیات سپرد کر دیا اور ہمیشہ کے لئے کر دیا ۔ گو عام اصطلاح میں مشہور یہی ہوا کہ وہ اس کے ساتھ "بھاگ" گئی ۔

اس طرح یہ دونوں ناتجربہ کار ہستیاں اپنا اسباب وغیرہ لپیٹے شام کی گاڑی سے کہیں باہر چلے جانے کو تیار تھے یا یوں کہیئے کہ اپنے لئے تخلیقِ مصائب کا سامان پیدا کرنے میں "اپنی کلہاڑی اپنا پاؤں" کا مصداق کر رہے تھے ۔ مگر پھر بھی ان کے دل ہمت افزا ۔ ان کی پیشانیاں خندہ تھیں ۔ محض اس لئے کہ ان کی ہر حرکت اور ارادے میں خلوص اور محبت کی نورانی شمع روشن تھی ۔

ایک غیر معروف ہوٹل کے گوشہ والی میز کے سامنے دونوں بیٹھے تھے ۔ دو ایک پلیٹوں میں معمولی طور پر جو کچھ سامان رکھا تھا وہی ان کی برات کا کھانا تھا ۔ اور لڑکی کے ہاتھ کی انگوٹھی ان کا سارا جہیز ۔

دوشیزہ نے اک حیا آموز ادا کے ساتھ کہا ۔" ہرمز! تم جانتے ہو ۔ مجھے تم سے محبت ہے ۔ میں اس وقت دنیا کی ساری عورتوں میں غالباً سب سے زیادہ خوش نصیب اور مسرور ہوں ۔ مجھے اپنی کامیابی پر بجا ناز ہے "۔

ہرمز ۔" عزیز ترین تہمینہ! تم انشاءاللہ ہمیشہ یوں ہی شاد رہو گی ــــــ مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ ۔ . . . . . وہ لوگ مجھے تم سے جدا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے "۔

تہمینہ ۔ (اوئی) کون ؟

ہرمز ۔ کون! تمہارے والد تمہارے . . . .

تہمینہ۔(سر ہلا کر) وہ اپنی کوششوں کو بے سُود پا کر خود ہی بیٹھ رہینگے ——— تم دیکھنا خدا نے چاہا تو وہ مجھے تم سے ہرگز علیحدہ نہ کر سکیں گے۔

ہرمز۔پھر بھی ایک قسم کی لڑائی تو جاری رہے گی۔

تہمینہ۔رہے! مگر میں تو تمہاری مدد کے لئے ہر دم سایہ کی طرح ساتھ ہوں۔ہرمز! تم کو قدرت نے غیر معمولی ذوقِ مصوری ودیعت کیا ہے۔مجھے یقین کامل ہے کہ تم اس دور میں ایک نہ ایک دن مصوری کا درخشندہ ستارہ بن کر چمکو گے اور خدا نے چاہا تو ضرور چمکو گے اس وقت کے لئے۔ اس ساعت کو قریب تر لانے کے لئے۔میں۔میری تمام کوششیں۔میری تمام دعائیں تمہاری کامیابی کے لئے وقف ہونگی۔

ہرمز۔پیاری تہمینہ . . . . (جوش مسرت میں اسکی آنکھیں ڈبڈبا آئیں)

دونوں وہاں سے اُٹھ کر اس کمرہ کی طرف چل دیئے جو انہوں نے شبِ عروسی گذارنے کے لئے کرایہ پر حاصل کر لیا تھا اور جو ہر عروسانہ آرایش سے بے نیاز تھا۔ دروازہ پر پہنچتے ہی ان کو معلوم ہؤا کہ ان کے انتظار میں کوئی اندر بیٹھا ہؤا ہے۔باہر موٹر کھڑا تھا۔دوشیزہ نے پہچان لیا ——— موٹر اس کے گھر کا تھا۔

تہمینہ۔انہیں ہمارا پتہ چل گیا۔ہرمز! شاید والد صاحب آئے ہیں۔

ہرمز۔بر سر تقدیر...... میں تیار ہوں۔ (اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں)

کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی ان کو معلوم ہؤا کہ آنے والا تہمینہ کا باپ نہیں ——— بلکہ ماں تھی۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوگئی؟" تہمینہ کی ماں کا پہلا اور گھبرایا ہؤا بے ساختہ سوال تھا۔

تہمینہ۔اماں جان! ہم لوگوں کو جدا کرنے کے لئے واقعی اب وقت ہاتھ سے جاتا رہا ——— میں ہرمز کی ہو چکی۔

تہمینہ کی ماں کی نظروں میں بجلی سی کوند گئی۔بدن میں ایک سنسنی ایک رعشہ محسوس ہؤا۔لیکن اس نے انتہائے ضبط کو کام میں لا کر ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئی۔اس کے چہرہ سے انتشار اور ہیجان بیّن طور پر نمایاں ہونے لگا۔ اس نے تہمینہ کی طرف ایک بار جھٹکے سے مڑ کر کہا۔"میں تمہارا خط پاتے ہی تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔میں نے تم کو ایک بار ٹیلیفون پر اس ہوٹل کا نام لیتے سنا تھا ——— دکھاؤ۔تمہاری شادی کا سرٹیفکیٹ کہاں ہے؟"

ہرمز نے اپنی جیب سے سرٹیفکیٹ نکال کر خاموشی کے ساتھ بڑھا دیا جس پر تہمینہ کی ماں نے سرسری سی نظر ڈال کر ہی واپس کر دیا اور بولی۔"تم جانتے ہو! میری تہمینہ ابھی بیس کی بھی پوری نہیں ہوئی ہے"۔

ہرمز۔"جی ہاں ——— سچ پوچھئے تو میرا بھی ابھی اکیسواں ہی سال شروع ہے۔مگر ہم دونوں محبت کا عہد و پیمان کر

چکے ہیں اور آپ سے بصد التجا درخواست کرتے ہیں کہ برائے خدا ہم کو جدا کرنے کی کوششوں سے درگذر یئے۔

تہمینہ کی ماں۔ "سمجھ لو! تمہارے خلاف چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ قانوناً تمہاری شادی ناجائز قرار پا سکتی ہے یا نہیں مگر . . . . اس کے باپ نے تو طے کر لیا ہے کہ وہ اب اس کی شکل نہ دیکھیں گے۔ تم نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تم محبت کا دعوے کرتے ہو مگر میری لڑکی کو اس حال پر پہنچانے میں مجھے تمہاری محبت اور الفت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔ اس نے اب تک آرام و آسایش کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پائی ہے۔ لیکن اب تو ظاہری اسباب اس کے لئے بجز فاقہ کشی اور کچھ نظر نہیں آتے۔

ہر مر۔ جی نہیں۔ خدا نے چاہا تو ایسی نوبت ہرگز نہ آنے پائے گی۔ میں اس کے لئے . . . .

تہمینہ کی ماں۔ بس بس! اپنی فضول گوئیوں سے میرا وقت خراب نہ کرو۔ میں جس غرض سے آئی ہوں اس کی تکمیل کے بعد جلد سے جلد واپس جانا چاہتی ہوں۔ تہمینہ کے باپ نے لڑکی سے ہاتھ دھو لیا۔ ان کا خیال ہے کہ تم دونوں نے ان کو بڑا صدمہ پہنچایا اور زبردست فریب دیا۔ آیندہ کے لئے تم خود مختار ہو۔ تم پچتاؤ گے ــــ دیکھنا تم دونوں آخر کار پچتاؤ گے۔ مگر تہمینہ کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ آج سے اس کے لئے میرے گھر کے دروازے بالکل بند ہو گئے۔ اب وہ تا حیات اس مکان میں واپس نہیں جا سکتی۔ اس نے جو کچھ کیا۔ اب بھگتے۔ ہم نے جس محبت سے پرورش کیا جس محنت سے تعلیم دی۔ اور جس شفقت سے پالا پوسا اس کا صلہ خوب مل گیا۔ اس ناشدنی نے اپنی آبرو دو کوڑی کی کر لی . . . . ہاں۔ ایک غریب مصور کے ساتھ شادی کر کے ہماری عزت خاک میں ملا دی +

ہر مر۔ محترمہ! میں شاید ہمیشہ مفلس نہ رہوں گا . . . . . . میں . . . .

تہمینہ کی ماں۔ مجھے اپنی لڑکی کی خاطر شاید یہی دعا کرنی پڑے گی کہ تم مفلس قلاش نہ رہو۔ تم پر جو کچھ بھی افتاد پڑے۔ تمہاری جو کچھ بھی خانہ خرابی ہو۔ مگر تم اب میرے گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ میں تم دونوں کو اس کا پورا یقین دلا دوں ــــ رہی میں۔ گو میں دکھیا۔ بدنصیب اور بے غیرت ہوں مگر پھر بھی تم دونوں کے ساتھ آخری سلوک کئے جاتی ہوں (اپنے بٹوے سے نوٹ نکال کر) لو تہمینہ۔ یہ تین ہزار کے نوٹ ہیں۔ تمہارے باپ کو ان کا علم نہیں مگر میں . . . .

تہمینہ نے اپنا سر ہلا کر نوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بولی۔ "اماں جان! مجھے ان کی ضرورت نہیں ــــ آپ کی دعا چاہئے"۔

ماں۔ نادان لڑکی! دیکھ ہوش میں آ جا۔ تجھ کو ان کی ضرورت پڑے گی۔ اور پھر پڑے گی ــــ تو ابھی دنیا داری

سے ناواقف ہے۔

تہمینہ پھر بھی مغرورانہ انداز سے ہرمز کے پاس کھڑی رہی اور استغنا کے ساتھ بولی "مجھے اُن کی ضرورت ہرگز نہ ہوگی۔ میں نے ہرمز کے ساتھ شادی اس لئے کی ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس کا مستقبل خواہ روشن ہو یا تاریک مگر میرے دل کی تسکین اور جان کا آرام ثابت ہوگا۔ گو یہ امر میرے لئے ایک مستقل صدمہ بن جائیگا کہ میرے قدیمی گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔ اور میں آپ یا ابّا جان کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی ــــ مگر خیر! ــــ میرا دل یوں مطمئن رہے گا کہ مجھے اپنے خاوند سے محبت ہے۔ آپ کا روپیہ لینا اس کی صریحی توہین ہی نہیں بلکہ اس کی محبت پر غیر اعتمادی کا اظہار ہوگا اس لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں ــــ اور فقط اسی لئے انکار کرتی ہوں"۔

تہمینہ کی ماں نے طیش میں ایک بار اچھا، کہا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی ــــ مگر قبل اس کے کہ وہ قدم باہر رکھ سکے تہمینہ نے سامنے آکر بے تکلف اس کے گلے میں دونوں ہاتھ ڈال دیئے اور گلوگیر آواز میں بولی "اماں جان ..... روپے کی بجائے مجھے ایک آخری پیار دیتی جایئے .... اور اماں .... وعدہ کیجئے ..... کہ آپ مجھے دعائے خیر سے اسی طرح یاد رکھیں گی جس طرح ہر شب کو سوتے وقت میرا آخری کام آپ کی یاد اور آپ کا تصوّر ہوا کرے گا .... اور .... اور اماں ..... کبھی کبھی مجھے یاد ضرور کر لیا کیجئے گا ...... کیونکہ ..... پھر بھی میں آپ کی ...... اولاد ہی تو ہوں"۔

بہت ممکن تھا کہ کسی معمولی سے معمولی سبب کے تحت میں اگر عزیزوں رشتہ داروں میں اس کی رسوائی ہوتی یا دوست آشناؤں کے دائروں میں سُبکی ہوتی تو تہمینہ کی ماں اس کو تاحیات درگزر کرنے کا وہم بھی نہ کرتی مگر یہاں اب سوال ماں کی محبت کا آگیا تھا۔ بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کی اکلوتی جوان لڑکی یوں جوشِ محبت میں اس کے گلے سے لگی، آنکھوں میں آنسو بھرے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس کو بھیچ بھیچ کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر رہی ہو اور پھر اس کا دل مانے؟۔ آخر وہی ہوا جو اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ تہمینہ کی ماں جوشِ اُلفت سے بیتاب ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کو بے تابانہ چمٹا لیا اور اسی وجدانِ بےخودی میں ایک نہیں بلکہ بے شمار پیاروں کی بوچھاڑ اس کے رخسار۔ اس کی پیشانی۔ اس کے ہونٹوں اور شانوں پر کر دی۔ پھر ایک بار محبت آمیز نظریں ہرمز پر ڈال کر بولی "ہرمز! دیکھو اس نے محبت کی خاطر بڑا زبردست ایثار کیا ہے۔ اس نے اپنے سارے موجودہ عیش و راحت اور شاندار مستقبل کو قربان کیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو"۔

شاید یہ الفاظ ہرمز کے دل پر گہرا اثر کر گئے۔ کیونکہ تہمینہ کی ماں کے چلے جانے پر اس نے تہمینہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ اور آواز بے قابو۔ "میں اس کا اہل ثابت ہوں گا ــــ تہمینہ ..... میں ضرور ہونگا۔

تم نے میری محبت میں جو کچھ قربانیاں کی ہیں ان کے عوض اگر میں کبھی عدمِ التفات یا عدمِ توجہ کا مرتکب بنوں تو ـــــ خدائے برتر مجھے سزا دے۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہارے قابل نہ تھا۔ اور تو کچھ نہیں مگر ہاں اس وقت یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھ سے جس قدر محنت۔ مشقت ہو سکی ......"

تہمینہ نے شوخی سے اپنا نازک ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ کر کچھ آگے کہنے سے روک دیا اور بولی۔ "ہرمز۔ بس بس۔ ہوش کی باتیں کرو۔ میں خدا کی قسم بالکل مطمئن ہوں ـــــ اور بے حد خوش بھی۔"

---

(۲)

بیس سال کے بعد!

یہی محبت کے نام پر جینے والا جوڑا۔ ایک خوش نما۔ خوش وضع۔ اور خوش آراستہ فوٹوگرافی کی دوکان میں حسد آفرین انداز سے کھڑا تھا عورت چالیس برس کی عمر پر پہنچنے کے بعد بھی خوبصورت ضرور کہی جا سکتی تھی۔ مگر اس کے ماتھے پر خفیف جھریوں کی نمود رخساروں کی سرخی میں زردی کی جھلک۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اس کے دل کی افسردگی اور قلبی اضطراب و انتشار کی شہادت دیتے تھے۔

ہرمز کو اپنے فن میں بالآخر کامیابی نصیب ہوئی۔ گو شادی کے بعد ابتداءً پورے بارہ سال بے حد صبر آزما ثابت ہوئے لیکن تہمینہ نے کبھی دامنِ صبر و استقلال ہاتھوں سے نہ چھوڑا۔ بیشتر موقعے ایسے آئے کہ دو دو فاقوں کی نوبت پہنچ گئی۔ مگر اس نے ہرمز کے سامنے کبھی حرفِ شکایت منہ پر نہ آنے دیا۔ محض اس خیال سے کہ اس کے لئے زندگی کی کشاکشِ پیہم زیادہ دشوار اور صبر کوش تھی۔ اسلئے جو کچھ روکھا سوکھا ممکن ہوتا وہ ہر طرح ضد اور خوشامد کر کے اس کے پیٹ میں ڈلوا دینا فرضِ اوّلین جانتی تھی۔ اس صورت میں شہرت و ثروت کی پرانی خوش خیالیاں قصۂ پارینہ یا محض خواب و خیال بن کر رہ گئی تھیں۔

اس دور میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ وہ بے تکلف اپنے گھر واپس جا سکتی تھی۔ مگر تہمینہ کی محبت۔ تہمینہ کے خلوص۔ اور تہمینہ کے استقلال کو کبھی لغزش نہ ہونے پائی۔ اس کو اپنی محبت کا دعوے اور اس کا پاس ہر دم ملحوظ رہتا۔ اس کا وجود ایک ہستی کی راحت و مصیبت۔ خوشی اور رنج۔ اچھے برے کا شریک بن چکا تھا اب خواہ اس کو روکھی سوکھی ملے یا مرغن لذیذ کھانے۔ پھٹے چیتھڑے ملیں یا زربفت کی بیش قیمت ساڑیاں۔ خانہ بدوشی نصیب ہو یا سر بفلک محلات۔ مگر ہر حال میں اُس کے دوش بدوش رہنا۔ خوش رہنا اور رکھنا ـــــ یہی اس کی مستقل دماغی کاوش تھی اور یہی اس کی زندگی کا غیر فانی آسرا۔

چار برس بعد ایک خوبصورت سا بچہ بھی پیدا ہؤا۔ مگر تہمینہ کی مغموم فضا اور پے در پے فاقہ کشیوں نے اس کو پروان چڑھنے نہ دیا۔ اپنی پرورش کے ذرائع مسدود دیکھ کر اس نے بھی چند مہینوں کے بعد ہی ساتھ چھوڑ دیا جس کا قلق تہمینہ کے لئے ایک ناقابلِ برداشت صدمہ بن گیا۔

چھٹے برس خدا خدا کر کے کایا پلٹی۔ قسمت نے کروٹ لی۔ سوتے نصیب جاگے۔ دن دونے رات چوگنے۔ ہر مہینہ دوسرے مہینے سے غنیمت اور ہر سال دوسرے سال سے بہتر گزرنے لگا۔ اور چودہ برس بعد تو وہ اچھے خاصے روپے والے ہو گئے۔ اعلیٰ درجہ کی دوکان۔ موٹر۔ نوکر چاکر۔ ساز سامان سب ہی کچھ ہو گیا ـــــــ لیکن اب ایک اندرونی خلش ایسی بھی پیدا ہو گئی جس سے نامراد تہمینہ اپنے گذشتہ ایام سے مغموم تر نظر آنے لگی۔ ہرمز بہت سے غیر مآل اندیش خاوندوں کی طرح اس کی طرف سے غفلت اور عدمِ توجہ کا مرتکب ہونے لگا تھا۔

ہرمز کی عمر چالیس اکتالیس کی کسی طرح نہ جچتی تھی۔ اس کے چہرہ پر اب بھی لڑکپن کی سی شوخی۔ لبوں پر شباب آفرین تبسم اور بالوں میں جوانی کی سی چمکدار سیاہی برقرار تھی۔

تہمینہ نے تھوڑی بہت نگرانی شروع کی تو اس کا نتیجہ ہرمز کے دل میں اس کی طرف سے مزید نفرت کی تخلیق نکلا۔ تہمینہ کے شباب میں جوانی۔ اور جوانی میں عمر کا پختہ پن ٹپکنے لگا۔ اس کا سراپا حسن۔ اس کے ہونٹوں کا تبسم اور اس کی آنکھوں کا خمار رفتہ رفتہ کافور ہونے لگا۔ اب وہ حسین نہ رہی ـــــــ لیکن ہرمز کو کبھی اس کا احساس بھی نہ ہؤا کہ درپردہ یہ سب اسی کی تغافل شعاریوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اسی کی کم نگاہیوں کی نذر ہو گئے۔ اور اب تو اس کی آنکھوں نے خود وہ منظر دیکھ لیا تھا جس سے رہی سہی امیدوں پر بالکل ہی پانی پھر گیا۔

تھیٹر کی ایک حسن فروش رقاصہ کو فنِ مصوری کا نمایشی شوق پیدا ہؤا۔ ہرمز استاد بنا اور وہ شاگرد!۔ گو بعد میں ہرمز ہی کو اس کی جناب میں زانوئے حواس تہ کرنا پڑا۔ ۲۳ کا سن۔ بلا کی شوخ اور حسین۔ جس کو خود ہرمز "ساحرہ" کہا کرتا۔ رفتہ رفتہ اِن دونوں کے تعلقات کا چرچا ہر گلی کوچے میں عام ہؤا تو تہمینہ بھی ناواقف نہ رہی۔

مصوری کے تاریک کمرہ میں ایک دِن دونوں پاس پاس بیٹھے تصویر بنانے میں مشغول تھے۔ اتفاقاً ـــــــ بلکہ کہنا تو یہی چاہئے کہ "قصداً"، ساحرہ نے اپنی ساری کو ایک بار اس انداز سے جھٹکا دیا کہ اس کے مرمریں شانے۔ گردن۔ اور سینہ کا معقول حصّہ بے پردہ ہو گیا۔ جس پر تاریک کمرہ میں موم بتی کی خفیف مگر لطیف روشنی نے ایک خاص نورانی جاذبیت کا اضافہ کر دیا۔ اس نظارہ سوز جلوے کا لازمی نتیجہ ہرمز میں مقتضیاتِ فطرت کے غیر معصوم ولولوں کا بھڑک اٹھنا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلو بدل کر ایک غیر اختیاری جوش میں اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولا "ساحرہ! مجھے تمہاری محبت دیوانہ بنا کر چھوڑے گی"۔

عین اسی لمحہ میں دروازہ کھلا اور تہمینہ ——— اس کی بیوی اندر داخل ہوئی۔

تہمینہ نے سب کچھ دیکھا اور سنا۔ مگر پھر بھی وہ خاموش رہی اور نہایت متانت کے ساتھ آگے بڑھ کر ساحرہ سے بولی "اجازت دیجئے۔ مجھے اپنے خاوند سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا ہے"۔

ساحرہ جس وقت کمرے سے باہر جانے لگی۔ تہمینہ نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر پُرغرور تبسّم کھیل رہا تھا۔

میاں بیوی میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہرمز آخرکار اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر آرام کرسی پر آبیٹا اور بولا۔ "تہمینہ! میں جانتا ہوں کہ میں نا عاقبت اندیشی سے کام لے رہا ہوں ——— مگر کیا کروں مجھے اس سے محبت ہے۔ میں ......"

تہمینہ۔ میں جانتی ہوں کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اور اب تو یہ ایک کھلا ہوا راز ہے۔ بس کیا۔ اس کو دنیا جانتی ہے۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تذکرہ ہے اور مجھے بس اسی کا زیادہ ملال ہے .... ہرمز۔ مجھے تم سے ہمیشہ محبت رہی ہے

ہرمز۔ "میں جانتا ہوں۔ اور مجھے یہی خیال پریشان رکھتا ہے۔ میں اتنا بُرا بھی نہیں جتنا تم خیال کرتی ہو۔ مگر اس کو کیا کروں کہ مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ صبر نہیں ہوتا .... میرے دل پر گہری چوٹ آئی ہے"۔

تہمینہ۔ اچھا سچ بتاؤ۔ کیا واقعی تم کو اس سے محبت ہے؟ سچی محبت! کیا تم اپنے وقتی ولولوں کو ایسے مستقل جذبات سے موسوم کر سکتے ہو جو کسی خاص میعاد کے پابند نہ ہوں گے؟

ہرمز۔ ہاں ایسی ہی ہے۔ میں اس کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ اس کا ایک نظارہ میری رگوں میں حشرِ تلاطم برپا کر دیتا ہے ...... محض ایک نظارہ!

تہمینہ۔ "لیکن یہی تو تم مجھ سے بھی کہا کرتے ...." تہمینہ وفورِ غم سے جملہ پورا نہ کر سکی اور خاموش ہو گئی۔ اس کے پہلوئے تخیّل میں وہ زمانہ کروٹیں بدلنے لگا جبکہ یہی ہرمز اس کو اپنی زندگی کا آسرا۔ اپنی جانِ تمنا کہا کرتا تھا۔ اس کو اس کا بھی احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں۔ بدنامیاں سہیں۔ گھر چھوڑا۔ والدین کو خیرباد کہی۔ اور پھر اچھے بُرے ہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ گزاری ——— مگر اب اس کا نازک دل اس کی بے وفائی اور بے توجہی کا شکار ہو کر ٹوٹ گیا۔ مردہ ہو گیا۔

ہرمز۔ "میں نے تم سے دل کا حال صاف صاف کہہ دیا۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ فریب نہیں دیتا۔ مجھے اس سے واقعی محبت ہے ——— اور بُری طرح ......"

"تو تم مجھے چھوڑ دو گے؟"۔

تہمینہ نے یہ سوال نہایت اطمینان۔ متانت اور بھولے پن سے کیا تھا جس کے بعد ہی ہرمز کھڑا ہو کر کمرہ میں آہستہ

آہستہ ٹہلنے لگا اور بولا "میں نے ابھی کوئی ایسا فیصلہ تو نہیں کیا ہے"۔

تہمینہ۔ لیکن ہرمز، تم کو شاید ایسا کرنا پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بندوبست تو کرنا ہی ہوگا۔ اس طرح کب تک گذارو گے۔ تمہارا دعوے ہے کہ تم کو اس سے محبت ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میری محبت تمہارے دل سے فنا ہو چکی ـــــ کیوں سچ ہے نا؟

یہ کہہ کر وہ اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ مگر ہرمز کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے کی ہمت نہ کرسکیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ اس کا مجرم ضمیر کم از کم اس موقعہ پر اس سے نگاہیں دوچار نہ کرسکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا چہرہ فرطِ غم سے زرد پڑ گیا ہوگا۔ اور وہ یہ بھی یقینی سمجھتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان اُمنڈا ہوا ہوگا۔ حالانکہ وہ ہر ممکن ہمت کا ثبوت دے کر ابھی تک اپنی آواز کی شیرینی کو قائم رکھے ہوئے تھی۔

ہرمز پر حقیقتاً اس وقت گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ واقعی شرمندہ اور منفعل نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی نفس پرستیاں۔ اسکے ولولوں کی کشمکش اس کو ہر طرح ناعاقبت اندیشی کے ارتکاب کی رغبت دے رہی تھیں۔ آخر کار ایک بار ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "تہمینہ! مجھے افسوس ہے ـــــ اے خدا مجھے افسوس ہے"۔

تہمینہ۔ وہ تم سے کہے گی کہ مجھے کہیں دور لے چلو ـــــ وہ یہ بھی کہے گی کہ یا تو تم میرے ہو کر رہو یا اُس کے ـــــ اور شاید تم کو اس کا کہا ماننا پڑے۔ بہرحال جیسا کہ میں کہہ چکی موجودہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی ـــــ مگر ہرمز! میں تم کو چھوڑ نہیں سکتی۔ میں کیا کروں۔ میرا دل نہ مانے گا۔ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔

ہرمز نے ایک بار اس کو کنکھیوں سے دیکھا اور بولا۔ "تو تم . . . ."۔

تہمینہ۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ میرے دل میں تمہاری محبت اب تک اسی طرح محفوظ ہے اور انشاء اللہ مرتے دم تک رہے گی۔ تمہارا خیال ہی دمِ واپسیں کا ہم نفس ہوگا ـــــ اب تم ہی بتاؤ میں تم کو کس طرح چھوڑ سکتی ہوں، تم میرے بچے کے باپ . . . . . . بس مجھے یہی کہنا تھا۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے میں پھر ٹھنڈے دل سے تم کو کامل آزادی کا حق دیتی ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے۔ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ نہ میں اب حسین ہوں اور نہ نوجوان۔ مگر میری چشمِ محبت زمانۂ شباب کی طرح تم کو اب بھی اسی ندیدی اور پُرشوق نظروں سے تکتی ہے۔ میرا دل اب بھی اسی طرح تمہاری محبت کا خزینہ بنا ہوا ہے۔

"مسٹر ہرمز! میں جاتی ہوں۔ آپ کو کچھ کہنا تو نہیں ہے"۔ پاس والے کمرہ سے ساحرہ کی شیریں آواز میں یہ الفاظ سنائی دیئے۔

تہمینہ نے اپنا رُخ پھیرا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔ ہرمز نے ایک بار "تہمینہ" کہا بھی مگر اس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور باطمینان بولی۔ "بس! تم کو ہم دونوں میں سے انتخاب کرنا ضروری اور لابدی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔

اس نے انتخاب کیا ——— تہمینہ خوب جانتی تھی کہ اس کا انتخاب کیا ہوگا۔
آخرکار ایک ایسا منحوس دن آیا کہ تہمینہ کی نمناک آنکھوں اور مغموم دل کو میدانِ صبر و رضا میں اس لئے سینہ سپر ہونا پڑا کہ اس کا خاوند ایک دوسری عورت کو لے کر فرار ہوگیا۔ لیکن اللہ رے وفا آموز ہستی! اس حال میں بھی اس نے اپنے رات اور دن محض اس کے لئے دعائے صحت۔ دعائے عافیت اور اپنے ٹوٹے ہوئے دل کو ایک نہ ایک دن اس کی واپسی کی ڈھارس دینے میں وقف کردیئے۔ اسکا ایمان تھا کہ اس کی محبت چونکہ پہلی ہے اس لئے آخری بھی یقیناً ثابت ہوگی۔

---

(۳)

ہرمز چلا گیا ——— اور تہمینہ کو اس کا منہ کامل پندرہ سال تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ پہلے تو ہر مہینے پابندی کے ساتھ کچھ نہ کچھ خرچ بھیجتا رہا مگر بعد کو وہ بھی بند ہوگیا۔ تہمینہ نے اس کے خلاف نان نفقہ کے لئے کوئی چارہ جوئی نہ کی۔ روپیہ کی طرف سے وہ یوں مستغنی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت وصیت نامہ میں اس کے لئے کثیر رقم چھوڑی تھی +
شدہ شدہ یہ خبر ملی کہ ہرمز کی بُری طرح گذر رہی ہے۔ شراب کی لت نے بیکار بنا کر آمدنی کے ذرائع مسدود کردیئے۔ عورت زندگی کی رفیق ثابت نہ ہوئی۔ ابتداء میں ہر دم قیمتی لباس۔ لذیذ کھانے۔ سیر تماشے یا اور اسی طرح کی مختلف خواہشوں اور فضول خرچیوں کا طومار باندھتی رہی۔ آرام میں ساتھ دیا مگر وقت پڑے پر نکل بھاگی۔
پھر ——— کامل پندرہ برس کے بعد۔ ہزاروں میل کے فاصلے سے۔ ایک بے ترتیب اور کانپتے ہاتھ کی تحریر موصول ہوئی۔

> پیاری تہمینہ!
> خدا کے لئے جلد آؤ۔ میں مرتا ہوں لیکن مرنے سے پہلے اگر۔۔۔۔
> تمہاری دید کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ تو شاید میری روح تاقیامت مضطرب و پریشان رہیگی۔
> ہرمز

تہمینہ گئی ——— اور اب ایک بوسیدہ۔ غلیظ سے کمرہ میں تھی جہاں کی عفونت اور گندگی دیکھ کر اس کو نفرت ہی نہیں بلکہ گونہ عبرت بھی ہوئی۔ اس کا شوہر ہرمز ایک ٹوٹی سی چارپائی پر پڑا تھا۔ بیمار۔ لاغر۔ دھان پان۔ چہرہ ستا ہوا۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ آنکھیں گڑی ہوئیں۔ کھانسی کی زیادتی دم نہ لینے دیتی تھی۔
تہمینہ کی پہلی ہی نظر میں بے ساختہ چیخ نکل گئی ہوتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہ نکلا ہوتا۔ مگر اس نے

قصداً، مصلحتاً اپنے آپ کو بہت روکا سنبھالا۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور اس کا مردہ بے رونق ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ ہرمز باتیں کرتا رہا:۔

"اس ظالم۔ سفاک کو گئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ بڑی مطلب پرست۔ خود غرض۔ دنیا ساز عورت تھی۔ جب تک روپیہ رہا۔ آمدنی رہی۔ خوش رہی۔ جب ذرا اس طرف سے کمی دیکھی لگی جا و بیجا پریشان کرنے۔ شراب نے میرے ہاتھوں میں رعشہ پیدا کر دیا اس لئے رہا سہا سلسلہ بھی جاتا رہا۔ نہ مصوری رہی نہ فوٹوگرافی پھر تو میدان صاف دیکھ کر وہ بھی نکل بھاگی۔ تہمینہ ——— میں سمجھتا تھا کہ تم کو ان سب واقعات کی اطلاع ہو گی"۔

تہمینہ۔ نہیں ہرمز۔ مجھے کیا معلوم؟ میں تو اُس دن سے دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہو کر ایک ویران گوشہ میں جا پڑی تھی۔ سب سے ملنا جلنا۔ راہ و رسم یک لخت بند کر دیئے تھے۔

سچ پوچھئے تو اس میں شک بھی نہ تھا کہ ہرمز کے جانے کے بعد وہ مجبوراً ایک غیر معروف قصبہ میں چلی گئی تھی۔ رشتہ داروں کے طعن و تشنیع۔ دوست احباب کی چہ میگوئیاں اس کے دل کے زخموں پر نشتر کا کام کرتی تھیں۔ وہ پریشان ہو کر موت کی طالب ہوتی۔ اور گود پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتی۔ کہ کسی طرح یہ زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے تاکہ اس ندامت اور بدنامی سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھوٹ جائے۔

ہرمز۔ خدایا! اس عورت کے دام میں پھنسنا!۔ آہ۔ میری کتنی بڑی نادانی تھی۔ اور پھر تم ایسی فرشتہ خصلت وفادار خاتون کو چھوڑ کر۔ نہیں بلکہ تمہارا دل توڑ کر۔ مجھے . . . . "

تہمینہ"۔ ہائیں۔ ہائیں۔ ہرمز۔ تم خدا کے لئے اس وقت ان خیالات سے اپنا دماغ پریشان نہ کرو۔ ہم . . . . . . "

ہرمز۔ تہمینہ! میں نے اس عرصہ میں کئی بار ارادہ کیا کہ تمہارے پاس لوٹ جاؤں۔ مگر میری ندامتوں نے کسی طرح گوارا نہ کیا۔ یہی سوچ کر کہ اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے بعد میں بھلا تم کو کیونکر دوبارہ منہ دکھا سکتا ہوں۔

تہمینہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے اس کا بھی اقرار نہ کیا کہ اتنے عرصہ تک وہ محض ایک ہی امید پر زندہ رہی ہے۔ بس ایک نہ ایک دن اس کی واپسی کی امید۔ پر جس کے بے چین انتظار میں گو لاکھ اس کی آنکھیں پتھرائیں۔ دل بیٹھا۔ ارمان و حسرت مبدل بہ یاس و حرمان ہوئے مگر لوٹ پھیر کر دی آسرا دل کو ڈھارس دیئے رہتا اور اسی وقت کا خیالی منظر آنکھوں کو وارفتہ۔

ہرمز۔ شادی کے دن میں نے تم سے کہا تھا۔ پیاری تہمینہ شاید تم کو یاد بھی ہو کہ اگر میں کبھی تم کو تکلیف پہنچاؤں یا تم سے تغافل برتوں تو خدائے برتر مجھے سزا دے۔ مجھ سے مجھے۔ آہ۔ میں نے تم کو رنج پہنچایا۔ دیدہ دانستہ ایذا دی۔ میرا کہا سامنے آیا اب یقیناً خدا کا قوی ہاتھ مجھ سے تمہارا بدلہ لے رہا ہے۔ میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں۔ اور خدا جانے میری شمع حیات اس ٹمٹماتی حالت میں

کب گل ہوجائے۔ تہمینہ تم مجھے معاف کرنا۔ تہمینہ میری خطاؤں کو معاف ....

تہمینہ۔ ہرمز۔ پیارے ہرمز .... میرے وفادار ہرمز۔" اب باوجود تمام کوششوں کے اس میں یارائے ضبط نہ رہا۔ وہ بے قرار ہوکر رونے لگی۔ پٹی کے پاس ننگی زمین پر دوزانو ہوکر اس نے اس کا سر دونوں ہاتھوں سے سرکایا اور اپنے سینہ سے لگا لیا۔ " ہرمز! میرا خدا بڑا رحم والا ہے۔ جس نے تم کو پندرہ برس بعد مجھ کو واپس دیا وہ اب یوں جدا نہ ہونے دیگا۔ ہرمز۔ میں یہاں رہ کر تمہاری خدمت کروں گی۔ علاج کراؤں گی۔ اور جب خدا نے کیا تمہاری طبیعت ذرا ٹھیری تو میں گھر لے چلوں گی پھر وہاں پہنچ کر تبدیلِ آب وہوا۔ معقول علاج۔ میری خدمات اور دعائیں تم کو صحت یاب کرنے میں جلد کامیاب ہوں گی اور انشاء اللہ ضرور ہونگی۔

ہرمز کے چہرہ پر ایک رونق سی پیدا ہوگئی۔ اس کا دل ان امید افزا اقراروں اور وعدوں سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ دل جس میں مدت ہوئی کہ کسی امید کے وجود۔ قیام یا تخلیق کی گنجایش باقی نہ رہی تھی۔ اس نے ایک بار نظر گھما کر تجسس انداز سے دیکھا اور پوچھا "تہمینہ! کیا تم واقعی میری خطائیں معاف کردوگی؟"

تہمینہ۔ بیشک! مجھے ہمیشہ تمہاری خوشی مدنظر رہی۔ میں نے عمر بھر یہی کیا۔ اور اب بھی مرتے دم تک اسی طرح تمہاری خوشی اور خدمت میرا فرض اولین رہیگا۔

ہرمز۔ مگر پندرہ برس ....

تہمینہ۔ آہ میں برابر تمہاری واپسی کا آسرا تکتی رہی۔ اس کے بعد شاید اس وجہ سے کہ وہ بیمار اور کمزور تھا۔ یا شاید اس وجہ سے کہ وہ افسردہ دل اور مغموم تھا۔ بہرحال ہرمز بیقرار ہوکر زاروقطار رونے لگا ——— کچھ دیر بعد اس نے کہا "آہ تہمینہ! میں تمہاری عنایتوں کا مستحق نہیں اور سچ پوچھو تو میں اس قابل بھی نہیں کہ تمہاری خاکِ پا اٹھا سکوں ——— افسوس یہ ہے کہ اب اپنی مختصر سی بقیہ زندگی میں میں اس کا عوض کیونکر ادا کرسکوں گا۔ خدا سے میری التجا ہے کہ مجھے تھوڑی زندگی محض تمہاری خدمت اور آرام پہنچانے کے لئے اور عطا فرمائے"۔

تہمینہ۔ تمہاری صحت میری دوبارہ زندگی ہوگی۔ تم کو خدا اچھا کردے۔ پھر ہم تم دونوں اطمینان اور عیش کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

الماری کے تختے پر موم بتی جل کر پھیل گئی۔ آس پاس والے مکانوں سے بچوں کی چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر تہمینہ اسی طرح بغیر پہلو بدلے ہرمز کا سر اپنے ہاتھوں میں لئے "**تصویر وفا**" بنی خاموش بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ وہ سوگیا اور بیہوشی میں خراٹے لینے لگا۔

ہرمز کے آرام سے سونے کا ہر ممکن انتظام کردینے کے بعد تہمینہ اٹھی اور جوشِ غم میں اس کی پٹی کے قریب ہی سربسجود ہو کر اپنے مالکِ حقیقی کی جناب میں رجوع ہوگئی گو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا، ہچکیوں کے باعث سانس بے قابو تھی۔ مگر اس کی زبان شکستہ اور پُر درد الفاظ میں یوں وقفِ دعا تھی :۔

" بارالہا! اِن کو اچھا کردے۔ تاکہ میں پھر ایک مرتبہ ان کی کیف نواز نظروں میں اپنے دل کے ارمان اور ولولوں کو پھلتا پھولتا دیکھ لوں"۔

دیوانہ (بریلوی)

باغ کی رانی

بھیگی بھیگی سرد ہوائیں ۔ اُودی اور گھنگھور گھٹائیں ۔ برکھا رُت کی نئی ادائیں ۔ مستی بن کر دل پر چھائیں
پتا پتا ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

برس پڑا جو کوئی بادل ۔ عالم ہوگیا دم میں جل تھل ۔ دُھل گئی شاخیں پھوٹی کونپل ۔ بول اُٹھا ہے منہ سے جنگل
بھیگی بھیگی سب ہریالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

سبزہ لہکا، جنگل مہکا ۔ کوئل کوکی۔ مور جھنکارا ۔ جنت بن گئی باغ کی دنیا ۔ مست ہوا ہے پتا پتا
جھوم رہی ہے ڈالی ڈالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

گاتی ہے ملہار جوانی ۔ جھول رہی ہے باغ کی رانی ۔ سر پر ایک دوپٹہ دھانی ۔ ساون شرم سے پانی پانی
موہنی مُورت۔ بھولی بھالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

بیٹھی ہوئی کیا جھولے پر ہے ۔ بال کُھلے ہیں ننگے سر ہے ۔ آنچل سرکا، کس کو خبر ہے ۔ ہاتھ لپیٹے رسی پر ہے
رُخ پر زلفیں کالی کالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

جھولے پر کیوں مست ہوئی ہے؟ ۔ بے خود ہو کر جھول رہی ہے! ۔ خوشیوں میں تو کھوئی گئی ہے! ۔ اپنا آپا بھول رہی ہے
تُو ہے اک تصویرِ خیالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

بالے پن کی پاک اُمنگیں ۔ نئی جوانی، نئی ترنگیں ۔ دیکھنا! تجھ کو مست نہ کردیں ۔ میری ہمت پست نہ کردیں
جیت اِس رُت پر تُو نے پالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

۱۹ ہند کی دُلہن ہوش میں آجا ۔ آجا بالی جوش میں آجا ۔ عالمِ اُلفت کوشش میں آجا ۔ غاضنف کے آغوش میں آجا
تیرے لئے آغوش ہے خالی
دل کی دُنیا لُوٹنے والی

غاضنف ملانوی

ابنِ آدم

اپنے لمحاتِ تنہائی میں

روس کے مشہور مصلح میکسم گورکی کی ڈائری کا ایک ورق

آج شام میں دریائے نوآ کے کنارے کھڑا ایک لطیف منظر کی سیر میں مصروف تھا کہ میں نے ایک حسین و جمیل خاتون کو پُل پر بے خودانہ انداز میں کھڑے دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا گویا وہ قیود حیات سے تنگ آکر دریا میں چھلانگ مارنا چاہتی ہے پھر یکایک میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا اور اپنی گلابی سی زبان نکال کر چاند کا منہ چڑانا شروع کر دیا۔

مہتاب دبے پاؤں دود مثال بادلوں میں سے آہستہ آہستہ گزر رہا تھا غالباً چودھویں رات تھی کیونکہ سیلِ نور غیر معمولی طور پر طلانگار تھا۔ ہوائیں تعطر و خوشبو کی لہریں موج زن تھیں۔ اور اس عالمِ رنگ و بُو میں خاک کا ایک پیکرِ جمیل آسمانی حسن کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ اس نظارے نے کئی اور واقعات کی یاد تازہ کر دی۔ عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی میں کسی کو تنہائی میں دیکھتا ہوں تو وہ اس قسم کی حرکات میں مشغول ہوتا ہے جن سے میرے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید شخصِ موصوف مخبوط الحواس ہے۔

بچپن میں میں نے ایک ایکٹر کو دیکھا۔ آپ آئینے کے سامنے کھڑے تھے اور بار بار اپنی ٹوپی اُتار کر اپنے عکس کے آگے ایک نہایت سنجیدہ انداز میں جھک رہے تھے۔

اس کے بعد میں نے اپنے دوست چیکاف (مشہور افسانہ نویس) کو ایک شاعرانہ مشغلے میں مصروف دیکھا۔ آپ ایک باغ میں بیٹھے ہوئے تھے سورج کی زرنگار شعاعیں عین آپ کے سامنے گلاب کے ایک چھوٹے سے پودے پر پڑ رہی تھیں اور آپ کوشش کر رہے تھے کہ ان امواجِ نور کو کسی طرح اپنی ٹوپی میں مقید کر کے سر پر رکھ لیں میں دیکھ رہا تھا کہ یہ ناکام کوشش ان کے ذہن میں اضطراب اور غصے کا ایک تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ ان کے چہرے کی سُرخی ان کی حرکات کی نامعقولیت اور ان کا اُٹھکر اضطراری طور پر ٹہلنا شروع کر دینا سب اس حقیقت کی مظہر تھیں۔ یہی حضرت تھے جن کو تھوڑے عرصے کے بعد میں نے ایک تنگ بوتل میں ایک نہایت موٹی پنسل داخل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ سائنس کا ایک اصول توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور بوتل ٹوٹ گئی۔

ایک بار میں نے ٹالسٹائی کو دیکھا۔ قریب ہی ایک گرگٹ دھوپ سینک رہا تھا اور آپ ایک اندازِ شفقت میں جھکے ہوئے

اسے مخاطب کر کے زیرِ لب کہہ رہے تھے "کیوں دوست خوش تو ہو؟" یہ کہہ کر آپ نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر رازدارانہ سے انداز میں فرمایا "میں تو خوش نہیں ہوں"۔

ایک بار میرے ہاں روسی ادب کے ایک پروفیسر مہمان تھے باتیں کرتے کرتے آپ کی نگاہ آئینے کی طرف جا پڑی۔ اُس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن بعد میں جب وہ اپنے آپ کو تنہا خیال کرتے تھے میں نے انہیں چھپ کر دیکھا کہ اپنے عکس سے کہہ رہے ہیں "میرے یار کہو تو زمانے نے تم سے کیسا سلوک کیا"۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے شکاف کو عالمِ تنہائی میں دیکھا۔ آپ کے سامنے ایک طشتری رکھی ہوئی تھی جس میں تھوڑی سی روئی پڑی تھی۔ آپ روئی کو اُٹھا کر زور سے طشتری پر مارتے تھے اور فوراً جُھک جاتے تھے۔ گویا روئی کی آواز سننا چاہتے ہیں۔

مشہور پادری ویلڈمرسکی نے ایک بار ایک کشتی اپنے سامنے رکھ لی۔ اور کہنے لگے "ذرا چل کر تو دیکھ"۔

جب کشتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو آپ فرمانے لگے "دیکھا۔ جب تک میری مدد شاملِ حال نہ ہو تو چل ہی نہیں سکتی"۔

میری نگاہ سے اکثر اس قسم کے واقعات گذرے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات تنہائی میں بے اختیار رونے یا ہنسنے لگتا ہے۔ ایک مشہور مصنف تنہائی میں ہمیشہ رو دیا کرتا تھا+

قارئین کرام پر واضح رہے کہ مصنف موصوف شراب کا عادی نہ تھا۔ لیکن میری نظر میں 'خندہ' یا 'گریہ' مخبوط الحواسی کی نشانی نہیں۔ یہ دو چیزیں توازنِ دماغی کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور ہر بالغ نظر شخص پر اس قسم کی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں بستر پر لیٹا ہوا گناہ کی اضافی حیثیت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میرا ایک ہمسایہ (ایک نہایت معزز زمیندار) داخل ہوا۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا۔ غالباً وہ غلطی سے میرے کمرے کو اپنا کمرہ سمجھ کر اندر چلا آیا تھا۔ کمرے میں کوئی لمپ وغیرہ موجود نہ تھا۔ لیکن چاندنی موجود تھی۔ میں چُپ چاپ لیٹا اس کی حرکات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے پہلے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیں۔

خود ہی کہنے لگا "کون ہے؟"

خود ہی جواب دیا "میں ہوں"۔

"یہ تمہارا کمرہ نہیں ہے؟"

"میں معافی کا خواستگار ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اور میری الماری میں سے ایک کتاب نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر کھڑکی میں سے بازار کی طرف جھانکا۔ پھر بولا " اس وقت روشنی ہے۔ لیکن دن کو کس قدر تاریکی تھی۔ توبہ"۔

یہ کہتے ہوئے وہ پنجوں کے بل دبے پاؤں دروازے کی طرف چل دیا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اکثر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کتاب اِن کے ہاتھ میں دے دی جائے تو تصویریں پھاڑنی شروع کر دیتے ہیں۔ اور خاصکر کسی ایک صفحے پر کوئی تصویر ہوتی ہے تو یہ خیال کرتے ہیں کہ تصویر اور صفحہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ تصویر اُتر آئے اور صفحہ نہ پھٹے۔

یہی کام کرتے ہوئے میں نے ایک پروفیسر کو دیکھا۔ آپ کوشش کر رہے تھے کہ ایک صفحے پر سے تصویر کو اُتار کر اپنے جیب میں ڈال لیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آپ نے خوب زور سے تصویر کو رگڑا۔ پھر کسی شے کو ہاتھ میں تھام کر اپنی جیب کی طرف لے گئے۔ پھر یکایک غور سے اس شے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ اور غالباً انہیں احساس ہؤا کہ تصویر کا کوئی حصّہ ہاتھ نہیں آیا۔ کیونکہ آپ کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اور آپ پھر تصویر کو رگڑنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کتاب مذکور دیکھی۔ تمام تصاویر کاغذ پر چھپی ہوئی تھیں۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہ تھی جو کاغذ پر چپکی ہوئی ہو۔ اور آپ سائنس کے پروفیسر تھے۔

ایک بار میں نے ایک معزز میونسپل کمشنر کی بیوی کو دیکھا کہ اپنے سامنے مٹھائی کا ایک ڈبا رکھ کے بیٹھی ہوئی ہے۔ اور ایک ایک دانے کو اُٹھا کر نہایت اطمینان سے کہہ رہی ہے۔ " میں تمہیں کھا جاؤں گی"۔

سیّد عابد علی

اپنی عظمت کے کرشمے دکھاتا ہوُا ربِّ دوجہان عجیب وغریب رستوں پر چلتا ہے وہ اپنے قدم سمندر میں رکھتا ہے اور طوفانوں میں سے گزرتا ہے۔

تمہارے ساتھ جو لوگ رہتے ہوں کبھی اُن سے زیادہ عقلمند اور عالم ہونے کا دعوٰے نہ کرو۔ اپنی قابلیت کو اک گھڑی کی طرح اپنی پوشیدہ جیب میں رکھو اور اُسے بار بار باہر نہ نکالو۔ یہ دکھانے کے لئے کہ تمہارے پاس گھڑی ہے۔ اگر تم سے پوچھا جائے کہ کیا وقت ہے تو بتا دو لیکن ہر گھنٹے بغیر پوچھے ایک چوکیدار کی طرح اعلان کرنے کی ضرورت نہیں!

بشیر احمد بیگم

خدمتِ محبوب

لوگ کہتے ہیں تجھے دنیا میں ہوں مَیں منہمک
کیا خبر ہے اُن کو دل میرا ہے تجھ سے منسلک؟

وہ سمجھتے ہیں میں ہوں شیدائے جاہ و مرتبت
کیا خبر ہے اُن کو اُلفت ہی ہے میری منزلت؟

منتہائے زیست ہے اُن کی نظر میں سیم و زر
میری آنکھوں میں ہے سیم و زر تری اک اک نظر

میرا جاہ و عیش میری زندگی پر بار ہے
میری خوشیوں کے وطن میں خواہشِ ایثار ہے

وقف ہے اے دِل تُو اپنی ہی مسرّت کیلئے
زندگی تجھ کو ملی اَوروں کی خدمت کیلئے

زندگی اک خواب ہے اِس خواب سے بیدار ہو
راہِ حق میں جان دینے کے لئے تیار ہو

رہنمائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے
منتہائے زندگی ہے عشق اب تیرے لئے

دل کو اپنے عشق کے شعلے سے کرلے تُو گداز
تا تری جاں میں ہوں پیدا قوتِ عجز و نیاز

خودشناسی کا مرقع زندگانی ہو تری
روح ایثار و عمل سے آسمانی ہو تری

سب کی خدمت کر اسی میں خدمتِ محبوب ہے،
سب سے اُلفت کر جو دل میں اُلفتِ محبوب ہے،

کام وہ کر جس سے ہو دلبر کو تیرے تجھ پہ ناز
مُرتعش ہو تیری لَے سے خود بخود اُلفت کا ساز

ب۔ ا

ماہِ صیام میں

اماں! جب تو مجھے سحری کے وقت جگاتی ہے تو میں نفرت سے بھر جاتی ہوں مگر تجھے کیا معلوم کہ میرے اس تنفّر کا راز کیا ہے؟

اماں! جب تو مجھے نرمی سے آواز دیتی ہے تو میں کروٹ بدل کر سو رہتی ہوں۔ تو اس لئے مجھ پر جھنجھلاتی ہے۔ مگر میں پھر بھی نہیں اٹھتی کیونکہ اُس وقت میری روح تھوڑے سے سکون کی جویا ہوتی ہے!

اماں! آدھی رات کو، عین اس وقت جب ہماری جھونپڑی کے عقب میں "پپیہا" بولنے لگتا ہے اور جب تو ہوشیار کرنے کے لئے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہے تو تجھے نہیں معلوم کہ میں بڑی لجاجت کے ساتھ تجھ سے "ایک لمحہ" اور سونے کی مُہلت کیوں مانگتی ہوں!

کاش! تو آپ ہی سمجھ لیتی کہ اس وقت صحرا کا یہ ننھا مطرب میٹھے سُروں میں شور مچا کر حق کی تلاش کرتا ہے اور میں اسے چُپ چاپ ہو کر سُنتی ہوں!!

پیاری اماں! ماہِ مبارک میں، نیم شب کے درمیان جب تو مجھ کو نیند سے اُٹھانا چاہتی ہے تو تُو کیا جانے کہ اس وقت میرے آئینۂ دل پر کس کی تصویر مرتسم ہوتی ہے!

اچھی اماں! مجھے گھُور گھُور کر نہ دیکھ۔ ہائے شاید تو یہ یقین نہیں مانتی کہ جب میں معصومیت کے گھر میں سوئی ہوئی ہوتی ہوں تو میرے دل کی منہ بند کلی پر خدائے قدوس کا خیال شبنم بن کر ٹپکا کرتا ہے!!

اماں! میں تیرے پاؤں لگوں گی مجھے راتوں کو نیند میں بے کل نہ کیا کر۔ آہ تو نہیں جانتی کہ میں اس وقت کیسا اچھا خواب دیکھا کرتی ہوں!!

میری اماں! مجھ سے یہ پیاری گھڑیاں نہ چھین، کیونکہ جن میں تو مجھ کو اُٹھا دینا چاہتی ہے۔ وہی میری زندگی کے بہترین لمحات ہیں!!

اماں! تو محوِ حیرت ہے پر ہائے تجھ کو کیا معلوم کہ ایک دوشیزہ کا پاکیزہ دل، آدھی رات کے درمیان کیسے نورافشاں خیالات میں ڈوبا رہتا ہے!

خاک نشین
تہذیب فاطمہ عباسی

استقلال پیدا کرو

بہت سے لوگ ہیں جو یک دم کامیابی کے بامِ رفعت پر پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیاں نہایت جوش وخروش کے ساتھ شروع کرتے ہیں لیکن عام طور پر قبل اس کے کہ منزلِ مقصود پر پہنچیں وہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ جادۂ حیات کے اس سرے سے اُس سرے تک ہمیں ایسے اشخاص نظر آتے ہیں جو زندگی کی دوڑ میں تھک کر مختلف منازل پر رہ رہ گئے۔ وہ محنتی، دیانت دار، پُرجوش، تعلیم یافتہ سبھی کچھ تھے، انہیں اچھے مواقع بھی ملے مگر عزم واستقلال اُن میں نہ تھا، وہ اُس اَن دیکھی منزل سے جو کامیابی کی منزل کہلاتی ہے چند ہی قدم پر رہ گئے تھے کہ دوڑ میں سے الگ ہو گئے۔

وہ کتنے حیران ہوں اگر یہ پردہ اُٹھ جائے! اور ان کو معلوم ہو کہ جس کامیابی کے وہ مشتاق تھے اس کے اور ناکامی کے درمیان صرف اُن چند قدموں کا فاصلہ تھا جو انہوں نے نہ اُٹھائے۔

ایک عظیم الشان فوج جس کو کوئی انسان نہ گن سکے کامیابی کے شہر کے گرد اُس کی دیواروں کے پاس، اُس کے دروازوں کے قریب محاصرہ کئے پڑی ہے لیکن وہ کبھی شہر میں داخل نہیں ہوئی اور وہ کبھی اس میں داخل نہ ہوگی۔ اس فوجِ عظیم کے ہزاروں آدمی، اگر اُن سے سوال کیا جائے تو کہیں گے کہ انہیں کبھی کوئی عمدہ موقعہ نہیں ملا، اُن کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور انہیں کبھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اُن سے احسان کرتا۔ حالانکہ اِن میں سے بہت سے ایسے تھے جو مکتبوں اور مدرسوں کے سائے میں پیدا ہوئے اور پلے، بڑی بڑی لائبریریاں اُن کی پہنچ میں رہیں۔ بہ مقابلہ اِن کے ابے لنکن اور ہزاروں دوسرے غریب لڑکوں نے لکڑی کے ذخیروں میں آگ کے الاؤ کی روشنی میں بیٹھ بیٹھ کر علم حاصل کیا اور پھر اِن کے سامنے سے فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے گزر گئے۔

تقریباً ہر ایک کامیاب شخص نے اپنی جد وجہد کے زمانے کے دوران میں محسوس کیا ہوگا کہ اُس کی کامیابی کی رفتار بہت دھیمی ہے اور زندگی اب بھی ناکام ہو سکتی ہے مگر جنہوں نے اچھے نتائج حاصل کئے وہ اس احساس کے باوجود بھی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے رات کی تاریکیوں کی پروا نہ کی، انہوں نے دِن کی صعوبتوں کو کچھ اہمیت نہ دی۔

انسان کے اندر استقلال سے بڑھ کر کوئی جوہر نہیں، متواتر اور مسلسل کوشش ہی سب سے بڑا جوہر ہے۔ دنیا میں اگر ہزار آدمی قابلیت کے مالک ہیں تو اُن میں سے ایک جفاکش ہے۔ ذہانت اور قابلیت مشکلات

کے سامنے جی چھوڑ جاتی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کسی اور وجہ کی بہ نسبت غیر مستقل مزاجی کے باعث زیادہ آدمی ناکام رہتے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی خواہش کو حاصل کرنے کے لئے ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن محنت اور مشقت کے لئے تیار نہیں۔ وہ تجویزیں سوچنے خدع اور فریب کرنے، ترقی کی طرف مختصر اور نزدیک راستے معلوم کرنے میں اپنی طاقت و قوت زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں مگر چند سال تک محنت و مشقت آمیز کوشش کرنے اور اپنے ذرا ذرا سے آرام و آسایش کو چھوڑنے کا خیال تک دل میں لانے کے لئے تیار نہیں۔

یوں ہی ہزاروں لوگ اپنی قیمتی زندگی کے سالہا سال کامیابی کے سودے ڈھونڈتے اور محنت اور کام سے کوئی آسان اور سریع التاثیر طریقہ تلاش کرنے کی کوشش میں صرف کر دیتے ہیں۔

بعض لوگوں میں کام جاری کرنے اور انجام دینے کا ایک خاص مادہ ہوتا ہے اور یہ یقیناً ایک غیر معمولی طاقت اور ایک تخلیقی قابلیت کی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ اُس کے مالک میں دوسروں کا سردار بننے کی قابلیت موجود ہے۔ کسی کام کے شروع کرنے کی اہلیت تقریباً ہر شخص میں ہوتی ہے لیکن ایسا شخص مشکل سے ملتا ہے جو ہر اُس کام کو جو وہ شروع کرے انجام تک بھی پہنچائے۔ اور یہ انجام ہی ہے جسے کچھ اہمیت حاصل ہے۔

(مارڈن)

منصور احمد

غزل

ساقی تری نگاہ نے مستانہ کر دیا
دل ایک جام تھا جسے میخانہ کر دیا

کیفِ شرابِ حسن کی ہیں طرفہ کاریاں
دیوانہ کر دیا کبھی فرزانہ کر دیا

برقِ جمالِ یار کا انداز دیکھنا
دل غیرتِ بہار تھا ویرانہ کر دیا

مدِ نظر وقارِ حرم تھا تو اے خدا
کیوں گلفشاں سوادِ صنم خانہ کر دیا

ساقی کی چشمِ مست میں دیکھا جو کیفِ حسن
دل ہم نے وقفِ بادہ و پیمانہ کر دیا

یوسف مآلِ عشقِ زلیخائے مصر نے
عالم میں خوابِ حسن کو افسانہ کر دیا

یوسف گجرات

محفلِ ادب

صہبائے سخن

ظاہر کی نظر نے تجھے پنہاں پایا
باطن کی نظر نے تجھے عریاں پایا
تھی عقل بھی جویا ترے جلوے کی مگر
کم بخت کو سرگشتہ و حیراں پایا (۱)

کیا گلشنِ عالم میں صبا ہو جاؤں
یا تہ میں سمندر کی فنا ہو جاؤں
ہستی سے بھی وحشت ہے عدم سے بھی گریز
حیران ہوں یارب کہ میں کیا ہو جاؤں (۲)

رشکِ جم و کے ہے مے پرستی میری
وہ مست ہوں جاوداں ہے مستی میری
موجِ مئے ارغواں ہے ہر سانس مری
مے خانۂ رنگ و بو ہے ہستی میری (۳)

میں کعبہ نشیں نہیں ہوں مستانہ ہوں
پابندِ خرد نہیں ہوں دیوانہ ہوں
ہو جاؤں نہ کیا تیری شمعِ الفت پہ نثار
میں کوئی مگس نہیں ہوں پروانہ ہوں (۴)

گلہائے سحر کے جام رنگیں رنگیں
تاروں کی ضیا سے شام رنگیں رنگیں
کاشانۂ روحِ حسن سے ہے روشن
ہے بزمِ جہاں تمام رنگیں رنگیں (۵)

"جامِ صہبائی"

انسانی دماغ کا ارتقا

ڈارون کی کتاب "سلالت انسان" کے فیصلہ کن ابواب وہ ہیں جن میں اُس نے انسانی دماغ کے ارتقا کے متعلق ایک تاریخی بیان دیا ہے - اور اس عضو کے مختلف افعال کا ذکر کیا ہے - سوال یہ ہے کہ اس وقت اِن ابواب کی کیا حیثیت ہے ڈارون علم تشریح کا عالم نہیں تھا لہذا اُس نے ہکسلے کے اس بیان کو تسلیم کر لیا تھا کہ انسان کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت نہیں جو انسان نما بندروں کے دماغ میں نہ ملتی ہو - ہکسلے کی رائے میں اگر ہم انسان نما بندروں کے دماغ کو ایک کتاب

فرض کرلیں تو انسانی دماغ کو اس سادہ اور قدیم کتاب کی ایک مشرح ایڈیشن تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح اول الذکر کتاب کو اس سے بھی زیادہ قدیم اور ابتدائی کتاب کی مطول ایڈیشن سمجھنا چاہئے۔ ہکسلے کے اس بیان کے بعد ہزاروں علمائے تشریح و فعلیات نے انسان اور بندر کے دماغوں کا مطالعہ کیا ہے۔ چند مہینے ہوئے پروفیسر جی۔ ایلیٹ سمتھ نے اس تحقیق کے نتائج کا خلاصہ یوں پیش کیا ہے "بندر کے دماغ میں کوئی ایسی ساخت دیکھنے میں نہیں آئی جو انسانی دماغ میں نہ پائی جاتی ہو برخلاف اس کے انسانی دماغ کوئی ایسی ساخت ظاہر نہیں کرتا جو گوریلا یا چمپانزی کے دماغ میں موجود نہ ہو۔۔۔۔۔ انسانی دماغ کو بندر کے دماغ سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ محض اس کی کمیت ہے"۔ گویا انسان اور بندر کے دماغوں میں صرف کمیت کا فرق ہے، نوعیت کا فرق نہیں۔ مگر پھر بھی اس فرق کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ انسان نما بندر کے دماغ کے بعض حصے انسانی دماغ میں بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور انہیں حصوں کی توسیع سے انسان کو احساس، ادراک، عمل، نطق اور علم کی قوتیں نصیب ہوئی ہیں۔

"سائنس"

عشق

عشقِ جلوہ گر ہوا، زندگی مہک اُٹھی ۔۔۔ گلستاں چمک اُٹھا، ہر کلی دمک اُٹھی
ذرہ ہائے خاک سے دلبری جھلک اُٹھی ۔۔۔ رُوحِ کائنات میں آگ سی بھڑک اُٹھی

آگ سی بھڑک اُٹھی روحِ کائنات میں

فتنہ ہائے ناز کو عشق گدگدا گیا ۔۔۔ آگ سی لگا گیا، حُسن کو جگا گیا
محفلِ خیال پر اک نشہ سا چھا گیا ۔۔۔ عشرتِ حیات میں سوزِ غم سما گیا

سوزِ غم سما گیا عشرتِ حیات میں

"قوسِ قزح"

انتظار

آفتاب طلوع ہوا اور غروب ہو گیا۔ چاند کی نورانی کرنیں اپنی نازک، اپنی اَن دیکھی رفتار کے ساتھ عرش سے اُتریں اور ظلمت کے بے محابا بڑھتے ہوئے غبار کے ساتھ شوخیاں کرنے لگیں۔ ستاروں نے اپنی درخشانی سے آسمان کی نیلگوں چادر

کو ہیروں اور موتیوں سے سجا دیا۔

دن گزر گئے۔ راتیں گزر گئیں۔

دریاؤں میں طغیانیاں آئیں اور سکون ہؤا۔ میدان میں ریت کے ذروں نے چمک چمک کر زمین پر آسمان کا نقش دکھا دیا۔ کلیاں پھول ہوئیں، پھول مرجھا گئے، کونپلیں پھوٹیں، بہار آئی اور چلی گئی، خزاں نے درختوں کو زرد لباس پہنایا۔

لیکن میرا دل، آہ میرا دل ایک حال پر ہے۔ اس میں کبھی تغیر نہیں ہؤا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں یہ کب سے تیری یاد میں محو ہے۔ اس کے انتظار کا طلسم اُس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک تو اسے اپنے پاس آنے کا پیام نہ دے۔

"نورجہاں"

زردشت کی تعلیمات

قابلِ عبادت صرف وہ خدا ہے جو زمین، آسمان، چاند، سورج، پانی اور آگ کا خالق ہے، جس نے دنیا کو پیدا کیا اور جس کے اختیار میں موت اور زندگی، رنج اور خوشی ہے۔

انسان کو اُسی سے التجا کرنی چاہئے۔ کیونکہ اُس کے سوا انسان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

خدا کا کوئی جسم اور کوئی رُوپ نہیں ہے۔ لیکن وہ ہر جگہ موجود ہے۔

خدا ہے، اور واحد ہے، اس کی وحدت عددی نہیں ہے۔ وہ گنتی اور شمار سے برتر ہے۔

خدا نے آگ پانی، چاند اور سورج میں اپنا جلوہ دکھایا۔ ان چیزوں سے اُس کی شان و شوکت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی طرف رُخ کرکے ہمیں اُس پاک اور برتر خدا کی عبادت کرنی چاہئے۔

نیکی بدی، انصاف اور ظلم میں تمیز کرنی چاہئے۔

ثواب گناہ رحمت اور غضب کو سمجھنا چاہئے۔

پانچ وقت خدا کی عبادت کیا کرو۔ اُس وقت تمہارا رُخ کسی روشن چیز کی طرف ہونا چاہئے۔

برائیوں سے بچو اور نیک بننے کی کوشش کرو۔

ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ زردشت کسی کی شفاعت نہیں کرسکتا۔

عاجزی، تواضع، حیا، عصمت، سچائی، مروت، حسنِ سلوک، بھیک نہ مانگنا۔ دوسروں کی مدد کرنا یہ سب کام نیک ہیں اور خدا کی عبادت میں داخل ہیں۔

"پیمانہ"

تبصرہ

جامِ صہبائی حضرتِ اثر صہبائی کی ۱۲۷ رباعیات کا دلکش مجموعہ ہے۔ اصنافِ سخن میں غزل ہی ایک ایسی صنف ہے جس کی طرف شعرائے اردو نے اب تک توجہ کی ہے اور اُسے معراجِ کمال تک پہنچایا ہے۔ طرزِ جدید کے شعرا نے نظم کی طرف بھی رُخ کیا ہے مگر رُباعی کو جو فی الحقیقت ایک چھوٹی سی بلیغ نظم ہے۔ ایک مستقل موضوع اور خاص فلسفہ کے ماتحت صرف صہبائی نے پیش کیا ہے۔ صہبائی کا فلسفہ خیام کا فلسفہ ہے اور اگر انہیں زبانِ اُردو کا عمر خیام نہ کہا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ فٹز جیرلڈ ضرور ہیں، کیونکہ انہوں نے اس مغربی خیام پرست کی طرح فلسفۂ خیام کی روح کو اُردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

جامِ صہبائی کا طرازِ عنوان خیام کی یہ رباعی ہے۔

آمد سحرے ندا ز مے خانۂ ما ۔۔۔ کاے رندِ خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کہ پُر کنیم پیمانہ زمے ۔۔۔ زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

صہبائی فرماتے ہیں:۔

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی ۔۔۔ شبہائے بلائے آسمانی فانی
یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی ۔۔۔ بھر جام کہ زندگی ہے فانی فانی

یا

ہے تاک میں مرگِ ناگہانی ساقی ۔۔۔ گردش میں ہو جامِ ارغوانی ساقی
جھونکے کی طرح سن سے گزر جائے گی ۔۔۔ مانندِ صبا ہے زندگانی ساقی

کون کہہ سکتا ہے آخری دو رباعیات بھی عمر خیام کی نہیں؟ اسی طرح باقی رباعیات بھی حقائق و معارف اور پاکیزگی و لطافت سے پُر ہیں۔ کتاب لکھائی چھپائی اور کاغذ کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ حجم سرورق کے علاوہ ۶۴ صفحے ہے اور قیمت آٹھ آنے۔ دار التالیف، بیڈن روڈ، لاہور سے طلب فرمائیے۔

شاما مصنفہ جناب کشن پرشاد کول صاحب۔ یہ ایک دلچسپ اور پاکیزہ ناول ہے جس میں فطرتِ انسانی کی تصاویر نہایت خوبی سے کھینچی گئی ہیں۔ زبان سلیس اور شگفتہ ہے اور طرزِ ادا پُرسوز و دل گداز۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو خود تعلیم یافتہ اور مہذب و شایستہ ہے لیکن اُس کے ماں باپ اپنے اغراض کی خاطر اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جو نہایت جاہل ہونے کے علاوہ

چال چلن بھی اچھا نہیں رکھتا اور لڑکی کی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ کتاب ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق مصور اور رنگین ہے
ملنے کا پتہ :۔ انڈین پریس لمیٹڈ۔ الہ آباد +

پیارے دیور۔ جناب حافظ عبداللہ صاحب شرار کا ایک دردانگیز اور نتیجہ خیز معاشرتی ڈراما ہے جس کے لکھنے کی تحریک انہیں مہاکبی بابو گریش چندر کی تصنیف سے ہوئی لیکن چونکہ مصنف موصوف بنگالی زبان سے واقفیت نہ رکھتے تھے اس لئے اس کا ترجمہ نہ کر سکے اور چند مرتبہ اس کے تماشے کو دیکھ کر اسی پلاٹ پر انہوں نے یہ ڈرامہ تصنیف کیا جو نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔ معاشرتی اصلاح کے لئے ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحے ہے اور کتابت، طباعت کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ :۔ حافظ عبداللہ صاحب شرار۔ نمبر ۲/۴ دل کشا سٹریٹ۔ بالی گنج۔ کلکتہ۔

"نورجہاں" کا سالانہ نمبر۔ جنوری ۱۹۲۶ء سے رسالہ نورجہاں کی صوری و معنوی خوبیوں میں ایک انقلاب و نما ہو گیا ہے۔ یہ نمبر غیر معمولی طور پر پونے دو سو صفحات پر شایع ہوا ہے، تصویریں بھی معمول سے زیادہ ہیں اور تقطیع بھی پہلے سے بڑی اور ہمایوں کے برابر کر دی گئی ہے۔ ملک کے مشہور اور مسلمہ ادیبوں کے مضامین اس کے لئے حاصل کئے گئے ہیں اور اُن کی ترتیب و تدوین نہایت قابلیت سے کی گئی ہے۔ علمی مضامین میں باتصویر مضمون "عورت کی حیثیت مشرق اور مغرب میں"، "فارسی گو شاعر عورتیں" "صنعت و دستکاری" اور "مادام لیشیا" بہت اچھے ہیں۔ افسانوں میں "حرماں نصیب" اور "سیتا دیوی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حصہ نظم میں عابد علی عابد، راز چاندپوری اور آثر صہبائی کا کلام پڑھنے کے قابل ہے۔ ایڈیٹر صاحبہ کے مضامین کی عموماً اور نظموں کی خصوصاً داد دینی پڑتی ہے کہ اُن کا کلام جدید شاعری میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ "پیغام عمل" اور "تاج محل" نہایت عمدہ تصاویر ہیں۔ "نورجہاں" کے صرف اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ منیجر "نورجہاں" امرتسر سے طلب فرمایئے۔

"ہنرمند"۔ یہ ماہوار رسالہ شیخ محبوب الٰہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی وکیل لاہور اور حکیم محمد عبدالغفور صاحب کی مشترک ادارت میں لاہور سے شایع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مطمح نظر مسلمانوں کو زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کی تعلیم دینا ہے۔ دونوں مدیر اس رسالہ کو بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کر رہے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقاصد کو مدنظر رکھ کر انہوں نے اسے جاری کیا اُس میں وہ بوجہ احسن کامیاب ہوں گے۔ ہماری رائے میں ملک و قوم کو ایسی چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ منیجر رسالہ ہنرمند۔ حویلی کابلی مل لاہور سے منگایئے۔

اطلاع :۔ سید محمد ہادی صاحب ہادی مچھلی شہری وکیل علی گڑھ سے منتقل ہو کر الہ آباد چلے آئے ہیں۔ آئندہ اُن کا پتہ ۱۵۲ شاہ گنج الہ آباد ہوگا +

فہرستِ مضامین

نمبر ۴ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۸ء | جلد ۱۳

تصویر:- محروم محبت

تصویر:- محروم محبت

جہاں نما

حضور نظام کی معارف پروری

اردو زبان کے لئے جو دور اعلیٰ حضرت خسروِ دکن میر عثمان علی خاں کے عہدِ سلطنت سے شروع ہوا ہے وہ اپنی عظمت اور شوکت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زبانِ اردو کا آفتاب دکن ہی سے طلوع ہوا تھا اور آج پھر وہ دہلی اور پنجاب کا چکر لگاتا ہوا دکن ہی پر اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے دہلی اور پنجاب نے اردو کو ادب کے لطیف سے لطیف نکات سمجھائے تھے مگر پھر بھی اُس میں ترقی یافتہ زبانوں کی صفِ اول میں بیٹھنے کی قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس میں علوم و فنون کو اپنے اندر جذب کرنے کی اہلیت نہ تھی لیکن آج اگر اردو زبان کو ایک مکمل زبان کہتے ہیں ہمیں کوئی باک نہیں تو یہ یقیناً عثمان علی خاں کی علم پروری اور عالی خیالی کا نتیجہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ حضورِ نظام کے دو ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں جن سے ہمارے دلوں میں خلافتِ عباسیہ کی یاد از سرِ نو تازہ ہو رہی ہے۔ اس وقت دکن ہندوستان کا بغداد بن رہا ہے جہاں ملک قابل ترین دل و دماغ جمع ہیں۔

مہذب ممالک میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ متعلمین کی معاشرتی زندگی پر اقامتی جامعات کا بڑا اثر پڑتا ہے اُن کی تہذیب اور تربیت میں اقامت کا بڑا حصہ ہوتا ہے اور اسی سے اُن میں وسعتِ نظر اور عالی ہمتی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اعلیٰ حضرت نظام نے جامعۂ عثمانیہ کی عمارت تعمیر کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور ایک کروڑ روپے کی منظوری بھی دے دی ہے۔ جس کے صرف سے ایک جامعی قصبہ تعمیر کیا جائے گا۔ اُس میں اقامت خانوں کے علاوہ طلبہ کی تمام دوسری ضروریات بھی مہیا کی جائیں گی۔ جامعہ کی عمارت کے متصل ہی ایک ہزار ایکڑ زمین کا ایک رقبہ ہوگا جس میں زراعت وغیرہ کے متعلق علمی تجربات کئے جائیں گے اور طلبہ کو اُن سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا جائے گا۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ اس اقامتی نظام کا نتیجہ جامعۂ عثمانیہ کے متعلمین کے لئے نہایت مفید ہوگا اور جب وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے تو اُن کے پاس صرف علم و فضل کی سندیں نہ ہونگی بلکہ اُن میں بامِ رفعت پر چڑھنے کی صلاحیتیں بھی ہونگی۔

روس میں اشاعت کتب

جمہوریہ روس میں سب سے بڑا ادارہ اشاعت سویٹ سٹیٹ اڈیٹوریل آفس ہے۔ اس دار الاشاعت نے صرف ۱۹۲۷ء میں ۴۰۰۰۰۰۰ کتابیں ۴۰۰۰ مختلف عنوانات پر شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی مجموعی لاگت کا اندازہ ۳۴۰۰۰۰۰۰ روبل کیا گیا ہے۔

میکسم گورکی کی کتابیں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں چنانچہ اُن کی بیس لاکھ جلدیں طبع ہوئیں۔
لینن کی تصنیفات اور اُن کے متعلق دوسری کتابوں کی تعداد جو یکم جنوری ۱۹۲۸ء تک اشاعت پذیر ہوئیں ۱۲۰۰۰۰ تک پہنچ گئی جن کے ۱۳۶ مختلف عنوانات تھے۔

دار العوام کی دعا

یہ وہ دعا ہے جس سے پارلیمنٹ کے ہر اجلاس کا افتتاح ہوتا ہے:۔
اے خدائے بزرگ و برتر بس تیرے ہی حکم سے جہان کے بادشاہ حکومت کرتے ہیں۔ اور دنیا کے شہریار انصاف کرتے ہیں اور تجھ ہی سے تمام مشورے اور عقل اور دانش ہمیں ملتی ہے۔
ہم تیرے ناکارہ غلام، جو تیرے نام پر یہاں جمع ہوئے ہیں نہایت عاجزی کے ساتھ تجھ سے استدعا کرتے ہیں کہ تو اوپر سے ہمارے لئے آسمانی عقل و دانش نازل فرما اور ہمارے تمام مشوروں میں تو ہماری رہنمائی کر اور قبول کر کہ تیرے خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنے تمام ذاتی مفادوں، تعصبوں اور طرفداریوں کو برطرف کرتے ہوئے ہمارے تمام مشوروں کا نتیجہ صرف تیرے مبارک نام کو بلند کرنا ہو، سچے مذہب اور عدل کا حصول ہو، اور بادشاہ کی حفاظت، عزت اور مسرت ہو، رعایا کی آسائش، امن اور ملک کی آسودگی اور خوشحالی ہو اور افراد و اقوام کے دلوں کو اُس محبت اور اخوت کے رشتے میں منسلک کرکے ایک دوسرے سے ملا دینا ہو جس کی تعلیم ہمیں مسیحیت نے ہمارے شفیع اور خداوند یسوع مسیح کے ذریعہ سے دی ہے۔ آمین۔

سونے کی سڑک

کالوریڈو میں ایک پختہ سڑک کی تعمیر کے لئے روڑی ایک سونے کی کان میں سے لی گئی ہے۔ گو اس روڑی میں فی ٹن ۲ شلنگ کی قیمت کا سونا تھا لیکن یہ بہترین مسالہ تھا جو مہیا ہو سکتا تھا۔ اس حساب

سے اس سڑک میں فی میل چھ سو پونڈ کا سونا موجود ہے۔

سورج کی عمر

ایک فرانسیسی ہیئت داں نے بتایا ہے کہ سورج ہمیں ایک پدم اور پچاس ہزار سال تک روشنی اور گرمی پہنچاتا رہے گا۔ اب تک یہی خیال کیا جاتا تھا کہ سورج زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ برس کے بعد بجھ کر رہ جائیگا۔ یہ نیا اندازہ اُن انکشافات کی بنا پر لگایا گیا ہے، جو ذروں کی ساخت کے متعلق حال ہی میں ہوئے ہیں۔

کاغذ کے قحط کا اندیشہ

کبھی آپ نے سوچا کہ سال بھر میں ہم کتنا کاغذ خرچ کرتے ہیں؟ اخبار، رسالے، خطوط، لفافے، وہ کاغذ جن میں پارسل باندھے جاتے ہیں یا جن میں ہم دوکانوں سے سودا خرید کر لاتے ہیں اگر جمع کئے جائیں تو میزان اتنی بڑھ جائے گی کہ اُسے دیکھ کر حیرانی ہوگی۔ برطانیہ میں فی کس ۵۶ سیر کاغذ صرف ہوتا ہے اور امریکا میں اِس سے بہت زیادہ۔

زیادہ تر کاغذ کینیڈا کی نرم لکڑی سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر کاغذ اسی شرح سے استعمال ہوتا رہا تو تقریباً پچیس سال کے اندر اندر لکڑی کا تمام ذخیرہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ریاستہائے متحدہ کا یہ حال ہے کہ ہر سال کی بالیدگی سے اُن کا خرچ آٹھ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

ان حالات کو دیکھ کر ماہرین اگر پریشان ہوں تو وہ حق بجانب ہیں کیونکہ لکڑی کے اس قحط کا اثر کاغذ ہی تک محدود نہ ہوگا بلکہ ریشمی جرابوں سے لے کر چھتریوں اور ریل کی پٹڑیوں تک کی حالت مخدوش ہو جائیگی۔ خوش قسمتی سے کاغذ سازی کا انحصار آج کل کلیتہً پرانے مصالح پر نہیں رہا اور اب نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں مگر صرف نئے طریقوں کا دریافت کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنگلوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے کیونکہ موجودہ صورت میں چار درختوں میں سے صرف ایک درخت کام میں آتا ہے اور تین آگ یا کسی دوسری تباہی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں کاغذ اور بعض دوسری صنعتوں پر جو لکڑی صرف ہو رہی ہے اُس کا اندازہ چار کروڑ

ٹن فی سال کیا گیا ہے اور قیافہ لگایا گیا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں اُس کا خرچ پانچ کروڑ ٹن فی سال تک پہنچ جائے گا اور موجودہ جنگل اس کو مہیا کرنے سے عاری ہو جائیں گے۔

کیا رفتار کی کوئی انتہا بھی ہے؟

ہوائی جہازوں کی رفتار روز بروز اس قدر بڑھ رہی ہے کہ ممکن ہے کبھی اُس کی تیزی کو انسان برداشت ہی نہ کر سکے۔ اور اُس کے ادراک ہی سے اُس کا دماغ قاصر رہے۔ آئندہ ایسے تیز رفتار ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی امید ہے کہ کسی ایسے جہاز کو موڑنے کا نتیجہ چلانے والے کی موت ہؤا کریگا۔ کیونکہ اس عمل سے اُس کے دماغ کے ایک پہلو پر اتنا بار پڑے گا جو اُس کی برداشت سے باہر ہو گا۔ خیال کیا گیا ہے کہ آدمی تین سو میل فی گھنٹہ سے زیادہ رفتار پر مڑنے کو برداشت نہیں کر سکتا خواہ وہ سیدھے راستے پر اس سے زیادہ رفتار کو بھی برداشت کرے۔

خوراک کا بدل

آئندہ جب کوئی شخص منہ یا گلے کے زخم یا کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو گا جس کی وجہ سے وہ کچھ کھا پی نہ سکے تو یہ ممکن ہو گا کہ اُسے جلد کے ذریعہ سے غذا بہم پہنچائی جائے۔ خوراک رسانی کا یہ عجیب و غریب طریقہ آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے سال بھر کے مسلسل تجربات کے بعد معلوم کیا ہے

آج کل مصنوعی پرورش کے دو طریقے رائج ہیں اول پچکاری کے ذریعہ سے خون میں غذا داخل کرنے کا دوسرے اُسے مقامِ انہضام میں پہنچانے کا، مگر یہ دونوں طریقے ناقص ہیں کیونکہ اُن سے غذا پوری طرح جزوِ بدن نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ جدید انکشاف نہایت اہم ہے۔ اس کے ذریعہ سے اعضائے ہاضمہ دیر تک آرام لے سکیں گے اور خوراک جلد میں سے اندر پہنچتی رہیگی۔ ایک مرکب پروٹین شکر اور دوسری ضروری حیاتین ملا کر تیار کیا جائے گا جس کی شکل مرہم کی سی ہو گی اور اُس سے مریض کے جسم پر مالش کی جائے گی جو غذا کی قائم مقام ہو گی۔

چند نصیحتیں

تفکرات کو پاس نہ آنے دو۔

امن کو تلاش کرو اور اُس کے تعاقب میں جاؤ۔

خوش رہو۔ سرورِ دل زیادہ دیر تک زندہ رہتا ہے۔

کبھی مایوس نہ ہو، مایوسی ایک جانکاہ بیماری ہے۔

مردانہ وار کام کرو مگر اتنا کام نہ کرو جس سے زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

جتنی قوت تم میں روزانہ پیدا ہوتی ہے اُس سے کم خرچ کرو۔

جلدی نہ کرو۔ منزل پر زیادہ تیز رو بھی اُسی وقت پہنچتا ہے جس وقت سست رو پہنچتا ہے

خوب سیر ہو کر سوؤ اور آرام کرو۔ نیند قدرت کی بڑی نعمت ہے۔

جوش و ہیجان سے باز آؤ۔ ایک لمحہ کا جوش بھی مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

صحت ور لوگوں سے میل جول رکھو۔ بیماری کی طرح صحت بھی متعدی ہے۔

زیادہ مت کھاؤ، اور نہ بھوکے رہو۔ اپنے اعتدال کو ضرب المثل بنا دو۔

دھات کا نیا استعمال

لندن میں ایک شخص نے ایک حیرت انگیز ایجاد کی ہے۔ وہ ہر ایک چیز پہ دھات کی ایک تہ جما کر اُسے غیر معمولی طور پر مضبوط بنا دیتا ہے۔ مثلاً ایک کپڑے پر اُس نے دھات کی تہ چڑھا دی کپڑا بظاہر باریک اور نازک تھا مگر ایک شخص اپنا پورا زور لگانے کے باوجود اُس کو پھاڑ نہ سکا۔ اس شخص کا دعوے ہے کہ وہ اس طریقے سے ایسے ہوائی جہاز تعمیر کرے گا جن کا وزن موجودہ ہوائی جہازوں سے نصف بھی نہ ہوگا وہ موجودہ ہوائی جہازوں سے کم وقت میں تیار ہوا کریں گے اور اُن سے زیادہ پائدار ثابت ہونگے۔

مرزا نبّو

مرزا نبّو رہاں باپ نے تو نواب علی نام رکھا تھا مگر شہر بھر کی بے تکلفی ماں، باپ کے تکلف کو آسانی سے برطرف کر دیتی ہے) تباہی کی کشادہ شاہراہ پر اچھی خاصی مسافت طے کر چکے ہیں۔ ڈگریاں، قرقیاں، نیلامیاں، گرفتاریاں یکے بعد دیگرے اُن کے ساتھ اپنے تپاک کے اظہار سے محظوظ ہو چکی ہیں اور وہ بلائے بدجو دنیا کے سو کام میں ہارج ہوتی ہے اور جس کا نام عزت ہے مدتوں پہلے مرزا نبو کے برہنہ پاؤں سے ٹھکرائی جا چکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرزا نبو تو اب بھی اپنے آپ کو ہمیشہ "عزت دار آدمی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں مگر دنیا کو اُن سے چنداں اتفاق نہیں اور بعض مجسٹریٹوں کی ہٹ دھرمی سے مرزا کا آخری معزز کمائی کا ذریعہ (ایک روپیہ فی گواہی) بھی اب مخدوش حالت میں ہے اور مرزا اس فکر میں ہیں کہ ہو تو کسی چلتے پُرزے تھانیدار کی چلمیں بھرنے کی رضاکاری اختیار کریں۔ سوجھتی انہیں خوب ہے اور اس میں شک نہیں کہ کسی کپتان پسند تھانے دار کی بلا تنخواہ نوکری میں علی بابا والے غار کے رازِ پنہاں ہو سکتے ہیں مگر پیشتر اس کے کہ مرزا کچہری کی دنیا سے رحلت کریں اُن کے چند کارناموں کا ذکر ضروری ہے۔

ایک دن مرزا نبو کسی مقدمے میں شہادت کے لئے عدالت میں پیش ہوئے تو وکیلِ فریقِ ثانی نے اُن کی صورت دیکھتے ہی افسر جلیسی کی خدمت میں عرض کیا کہ مرزا کا کوئی پیشہ نہیں یونہی موقع بے موقع کرایہ پر گواہی دیتے پھرتے ہیں۔ مرزا کا یہ وصف ہمیشہ سے رہا ہے کہ کوئی بات کرتا ہو تو درمیان میں نہیں بولتے۔ جب وکیل صاحب مرزا کے برخلاف اپنی فصاحت کا دریا بہا چکے تو مرزا عدالت سے ملتجی ہوئے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت ـ کہو۔

نبّو ـ حضور اس عدالت کی تو شان ہی الگ ہے اور میری کیا مجال کہ وکیل صاحب کی طرح کوئی ناشائستہ بات کہوں مگر یہ بالکل غلط ہے کہ میرا کوئی پیشہ نہیں۔

عدالت ـ تو پھر تمہارا کیا پیشہ ہے؟

نبّو ـ حضور خفا نہ ہوں تو بالکل سچ بتا دوں۔

عدالت - ول جلدی بولو

نتّو - غریب پرور جس طرح بعض عدالتیں وکیل پرور ہیں اسی طرح میں بھی وکیل پرور ہُوں - دو ہزار سے زیادہ روپیہ وکلا کو فیسوں کا دے چکا ہوں - کیا وکیل پرور ہونا کوئی بُری بات ہے آخر وکیلوں کے ماں باپ بھی تو اُن کو پالتے ہیں - اور حضور سب کے ماں باپ ہیں -

عدالت - تم گستاخ آدمی شریر ہے -

نتّو (وکیل کو مخاطب کر کے دبی زبان سے) اب جواب دیجئے نا اِس بات کا -

اِس پر جو فرمائشی قہقہہ عدالت میں ہُوا اُس کا برسوں ذکر رہے گا - اُس روز دور دور سے لوگ مرزا کو دیکھنے آئے - وہ وکیل صاحب سارا دن منہ چھپاتے پھرے - ایک اور موقع پر ایک پٹواری زادہ وکیل مرزا نبو سے تن تن کر اُلٹے سیدھے سوال کر رہا تھا - خرانٹ مرزا تاک میں تھا کہ موقع ملے تو بدلہ لوں آخر وکیل صاحب گرج کر بولے -

وکیل - کتنا فاصلہ تھا ؟

نتّو - تخمیناً پچاس گز

وکیل - ٹھیک یاد ہے کہ تخمیناً ساٹھ گز نہیں تھا -

نتّو - آپ کا اختیار ہے پچاس کو ساٹھ کہئے مگر میں تو پٹواری سے پُوچھ کر آیا ہوں، اس نے پچاس گز بتایا تھا -

وکیل - پٹواری تمہارا دوست ہے ؟

نتّو - حضور پٹواری کا کام ایسا ہے کہ بیٹے کو اپنا نہیں بناتا، مجھے کیا دوست بنائے گا ؟

وکیل صاحب عدالت میں تو بات ٹال گئے مگر وکیلوں کے کمرے میں دوستوں نے اُن کے خوب لتے لئے -

ایک اور موقع پر مرزا کی گواہی کے دوران میں اُن سے سوال کیا گیا کہ کیا ملزم کی مقتول سے دشمنی تھی ؟

نتّو - تھی -

عدالت - کیوں ؟

نتّو - عورت کے سبب سے -

عدالت - کون عورت ؟

نتّو - مسماۃ طوائف

عدالت - کیا دونوں کی دوستی تھی ؟

نبتو - حضور دوستی کے سبب سے دشمنی نہ تھی، وہ تو دونوں کو جوتے لگاتی تھی ۔

عدالت - پھر کیا دشمنی تھی ؟

نبتو - حضور وکیل صاحب کو مسماۃ طوائف کے گھر کے سب حال کا پورا علم ہے - ان سے دریافت کرلیں

عدالت - (جھڑک کر) تم سیدھا جواب دو جو تم کو علم ہے ۔

نبتو - حضور دونوں نے مسماۃ طوائف کے حق میں جھوٹی شہادت دی مگر مسماۃ طوائف مقدمہ ہار گئی - ان دونوں کی آپس میں تکرار ہوگئی وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے مقدمہ خراب کیا وہ کہتا تھا کہ تیری شہادت نے کام بگاڑا ۔

عدالت - اِن لوگوں نے جھوٹی شہادت کیوں دی ؟

نبتو - کسی وکیل کے کہنے پر ۔

بات بالکل سچ تھی اور مرزا کے منہ سے بے تکلف نکلی اور مرزا اپنی لیاقت سے "کسی" کا لفظ ایسی موزوں طرح چسپاں کر گیا کہ عدالت اُس کے سر نہ ہوسکی اور ملزم کا وکیل گویا کٹ کر مر گیا - عدالتوں میں بہت دن "کسی وکیل" کے معنی ایک خاص وکیل رہے ۔

وکلا کے ساتھ تو میرزا کے یہی تین مشہور معرکے ہیں مگر چھوٹے اہلکاروں پر تو مرزا کے سترہ حملے زبان زد ہیں - صرف ایک کا ذکر کافی ہے ۔

ایک جدید کرنیل ڈپٹی کمشنر جس کو رعایا "موتیوں والا" کے لقب سے اب تک یاد کرتی ہے کچہری سے اُٹھنے کو تھا کہ اردلی نے حسب معمول آواز دی "چلو عرضی سوال والا" مرزا نبو یہ سُن کر بڑھے ۔

کرنیل صاحب - ویل کیا ہے ؟

نبتو - حضور کیا آپ کے سامنے کسی اہلکار کی جھوٹی شکایت کرنے سے مجھے قید کی سزا ہوسکتی ہے ۔

کرنیل - ضرور ہوگی، اگر شکایت جھوٹی ہوگی ۔

نبتو - اور اگر جھوٹی نہ ہوئی تو کیا اہلکار کو سزا ہوگی ؟

کرنیل - تم بکو - جلدی بکو - تمہارا کیا مطلب ہے ؟

نبو - حضور میں شکایت کرتا ہوں - آپ چل کر دیکھ لیجئے ۔

کرنیل ۔ کدھر ؟

نبّو ۔ صرف پچاس گز ۔

خدا جانے نبو اور کرنیل کے درمیان کوئی سمجھوتا تھا یا کیا بات تھی مگر کرنیل صاحب نبو سے کہنے لگے کہ "اچھا تم آگے آگے چلو"۔ نبو کرنیل کو سیدھا خزانچی کے کمرے کی طرف لے گیا اور کمرے کے عین باہر جا کر کہنے لگا کہ حضور اس کی گدی کے نیچے جھوٹے سکے درجنوں رکھے ہیں ۔ جو رشوت نہ دے چالاکی سے اُن کے روپے بدل دیتا ہے اور پھر روپے کٹوا دیتا ہے ۔

کرنیل صاحب نے فوراً بلا تامل گدی کو الٹ دیا ۔ نیچے سے بیس روپے سے زائد جھوٹے روپے نکلے خزانچی کا وہ گماشتہ تو موقوف ہؤا اور مرزا کو کرنیل صاحب نے خوشنودیٔ مزاج کا پروانہ دیا ۔ مگر آجکل کے ڈپٹی کمشنر مرزا کی نظروں میں کم جچتے ہیں ۔ ہمیشہ کہا کرتے ہیں " اگلے حاکم بڑے نرحاکم تھے "!

فلک پیما

غزل

نور کو ظلمت کے پردے میں نہاں پاتا ہوں میں
ذرّے ذرّے میں نشانِ بے نشاں پاتا ہوں میں

عشق سے پہلے بھی یہ گھر بس کے اُجڑا ہے کبھی
دامنِ عقل و خرد کی دھجیاں پاتا ہوں میں

آشیں میں مرے آرام کر شوریدہ سر
تیری ہر حرکت میں پنہاں بجلیاں پاتا ہوں میں

کیا تعجب ہے بہار آجائے گلشن میں مرے
پتے پتے کو خزاں کا رازداں پاتا ہوں میں

کیا مرے نالوں میں بھی تاثیر پیدا ہو گئی
اُن کی شرمندہ "نہیں" میں ضبطِ "ہاں" پاتا ہوں کیا

اُٹھ کہ اب شاید گناہوں کی سیاہی دھو سکیں
سامنے رحمت کا بحرِ بیکراں پاتا ہوں میں

بار بار اعجاز آتا ہے جنوں پر طیش سا
راستہ بھولے ہوئے جب کارواں پاتا ہوں میں

اعجاز ساندوی

انتظار

(گیت ۴۷ گیتانجلی)

ہجر کی رات بدستور کٹی جاتی ہے
جاگتے جاگتے پھر صبح ہوئی جاتی ہے

آہ اُمید! کہ اب بھی نہیں سونے دیتی
مجھ کو مایوس بھی ظالم نہیں ہونے دیتی

دل یہ کہتا ہے کہ کیا ہو جو کوئی آجائے
اور سوتا ہُوا دیکھے تو تجھے شرمائے

در کھلا چھوڑ دو سوتا ہوں تو سو جانے دو
کوئی آجائے تو روکو نہ اُسے آنے دو

پائے نازک کی صدا گر نہ جگانا چاہے
اور پازیب کی جھنکار سُلانا چاہے

ہمدمو تم بھی خدارا نہ جگاؤ مجھ کو
اور اس خوابِ گراں سے نہ اُٹھاؤ مجھ کو

ہیں پرندوں کے خوش آئند ترنم بے کار
اور نسیم طرب افزا کے تراکم بے کار

میں نہ جاگوں گا مری نیند پریشاں نہ کرو
آہ! اتنا تو مجھے اُس سے پشیماں نہ کرو

اے خوشا وہ مری نیندیں وہ مری بیہوشی
اُس کے چھونے پہ جو قرباں ہوں بصد خاموشی

اے خوشا وہ مری جاگی ہوئی آنکھیں پُر خواب
جو کسی نورِ تبسم کے لئے ہوں بے تاب

صرف وہ نورِ تبسم جو کسی چہرے سے
آفتابِ شفقی رنگ کی صورت نکلے

اور تاریکیٔ غمخانہ کو یوں دُور کرے
جس طرح خوابِ صنم نیند کو پُر نور کرے

میری آنکھوں میں وہی نور سما جانے دو
اور دل میں وہی تصویر اُتر آنے دو

صبح دم آنکھ کھلے تو وہی صورت دیکھوں
چڑھتے سورج میں وہی موہنی مورت دیکھوں

اسی نظارۂ دل کش سے محبت بن کر
ایک طوفان اُٹھے موجِ مسرت بن کر

بے قراری ہو مری روح کی بیداری میں
اور ہیجانِ عمل ہو رگِ بے کاری میں

وندریں راز چنیں باخبرے گردم باز
بازگردم بمنازل کہ بخود جویم باز

(ٹیگور) طالب باغپتی

فریب

(عثمان کا خط اپنے دوست ریاض کے نام)

ریاض بھائی! چار سال کے بعد لندن سے تمہارا پہلا اور غالباً آخری خط ملا۔
اس خط کو لکھتے ہوئے تمہارے دل میں ایک شادان و فرحاں شریف النفس انسان کا تصور ہوگا لیکن زمانے کی گردش دیکھو کہ بالکل اس کے برعکس یہ خط ایک ذلیل اور تباہ و برباد انسان کو ملا۔ شاید تم کبھی اندازہ نہ کرسکو کہ اس خط نے ایک منفعل روح، ایک پشیمان دل، اور ایک گناہ کے بارسے تھکے ہوئے دماغ پر کیا اثر کیا۔

تم مجھے میری کامیاب شادی اور اُس کے بعد میرے بچے کی پیدائش پر مبارکباد لکھتے ہو۔ آہ کس وقت تمہیں اس بات کا علم ہؤا جب میں ہمیشہ کے لئے برباد ہوچکا تھا۔ اپنی زندگی کی تمام شادمانیاں میں نے خود اپنے ہاتھوں برباد کردیں۔ اپنا سب کچھ میں کھوچکا ہوں اور خواب کی طرح ایک دھندلی سی یاد کے سوائے اب میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

کالج کے زمانہ میں میں نے کئی دفعہ تم لوگوں کو مذاقیہ فریب دیئے۔ اور بعض اوقات تمہاری سخت اذیت کا باعث ہؤا اُس وقت کسے معلوم تھا کہ آخر میں چل کر یہی فریب میری دین و دنیا کی رسوائی کا موجب ہوگئے۔ اُف! میں نے اب بھی ایک فریب کیا اور آخرکار خود بھی فریب میں مبتلا ہؤا۔ لیکن اس فریب نے مجھے میری مدتوں کی گہری نیند سے بالکل بیدار کردیا۔

یہاں تک میری تحریر سے تمہیں صرف حیرت ہوگی لیکن آگے آگے جو کچھ میں لکھنے والا ہوں اُسے پڑھ کر عنقریب تم بھی مجھے ایک ازلی شیطان تصوّر کرنے لگو گے۔ لیکن مجھے اس کا ذرہ بھر رنج بھی نہ ہوگا میں بہت رسوا ہوچکا ہوں اور اس سے کہیں زیادہ رسوائی کا مستحق ہوں میں نے محبت کے گلے پر کند چھری پھیردی قسامِ ازل کے بہترین عطیہ کو میں نے پاؤں تلے روند ڈالا۔

تمہیں یاد ہوگا کہ تمہاری روانگی کے دنوں میں مرزا محمد عمر صاحب سب جج مرحوم کی صاحبزادی کی خواستگاری کے لئے ان تھک کوششوں میں مصروف تھا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک میری اور تمہاری خط و کتابت بند

رہی - میں تمہیں رخصت کرنے تک آیا - حالانکہ میرے اور تمہارے درمیان صرف چند گھنٹوں کا راستہ حائل تھا - لیکن میں اپنا کون کون سا عیب بیان کروں شاید ہیں دنیا میں سراپا عیوب بن کر آیا تھا اور اب ایک ابدی لعنت کا طوق گلے میں ڈال کر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا -

میری درخواست قبول ہوگئی اور چند ہفتے بعد نزہت آرا میرے گھر میں موجود تھی میں اپنی بیوی کے متعلق عجیب عجیب تصورات قائم کئے ہوئے تھا - میرا خیال تھا کہ وہ ایک پیکرِ نور ہوگی جس کی برق پاش ضیا سے میری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی - اُس کے عادات و اطوار اُس کا ہر انداز اُس کی ہر حرکت اُن خیالی شہزادیوں کی سی ہوگی جو میں افسانوں کی زندگی میں دیکھ چکا تھا اور میرے دل کی اندرونی تہوں میں شاید یہ خیال بھی پوشیدہ تھا کہ اُس کی آمد سے میرے رتبہ میں کوئی عظیم الشان ترقی ہوگی -

ایک لحاظ سے میری یہ خواہشیں امید سے بڑھ کر پوری ہوگئیں - لیکن جانتے ہو جو چیز انسان کو مل جائے وہ اُسے نظر انداز کر کے اُس سے بڑی چیز کی ہوس میں مرتا ہے - پھر مجھ جیسا متلون المزاج انسان خدایا تیری پناہ - میں بالکل اس کی قدر نہ پہچان سکا - اُس کی ہر نظر سے میں محسوس کرتا کہ وہ مجھے ایک کامل انسان سمجھتی ہے - لیکن میں اُس کی زندگی میں اُسے ایک بار بھی وہ نہ سمجھ سکا جو کچھ وہ تھی - اُس کے ہر قابلِ تحسین فعل کو میں اپنے حسنِ سلوک کا نتیجہ سمجھتا رہا - جتنا عرصہ وہ میری شریکِ زندگی رہی کبھی مجھے شکایت کا موقع نہ ملا لیکن میری خود پسند طبیعت نے ایک دن بھی مجھے اجازت نہ دی کہ اُس کے کسی جوہر کی سچی داد دے سکوں اُس کا اندازِ طبیعت عجیب پُر وقار اور سنجیدہ تھا وہ ہمیشہ خوش رہنا چاہتی تھی - میں نے کبھی نہ دیکھا کہ وہ کسی تکلیف دہ بات کو اپنے دل میں زیادہ جگہ دے کر ملول ہوئی ہو -

میرا خط طویل ہو رہا ہے اور ابھی تک میں اصل حکایت سے بہت دور ہوں - ہاں میری تباہی کا آغاز یوں شروع ہؤا -

شام کے چار بجے میں اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا - اتفاقاً میری نگاہ ایک اشتہار پر پڑ گئی - یہ اشتہار ایک روشن خیال عالی خاندان، خوبصورت اور قابل لڑکی کے رشتہ کے لئے تھا - میں نے اُس بھوکے اور لالچی شخص کی طرح جو مٹھائی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہو اور کھانے کا مقدور نہ رکھتا ہو - کئی بار اس اشتہار کو پڑھا - اور آخر اپنے دل کی اُلجھن مٹانے کے لئے یا خدا جانے کس خیال سے اخبار اُٹھا کر نزہت کے پاس جانے لگا - کاش کہ میں چلا جاتا - یکایک کسی نے باہر سے میرا نام لے کر پکارا

میں نے کہا "اکرم" جواب ملا "ہاں" میں نے کہا "چلے آؤ" - اکرم آتے ہی ایک صوفے پر دراز ہو گیا - میں نے کہا "اکرم! لو بھئی بڑا اچھا موقع ہے درخواست کر دو - اکرم نے اخبار میرے ہاتھ سے لے لیا - اور اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بولا "اوہ میں سمجھا" "مجھے بخوبی معلوم ہے" میں نے ذرا آگے بڑھ کر کہا "کیا کہا" اس نے کہا بھئی بہت بے قرار ہوئے جاتے ہو، لو سنو - یہ صاحب جن کی لڑکی کے لئے اشتہار دیا گیا ہے ایک بہت بڑے جاگیردار نوابی خاندان سے ہیں بے انتہا امیر، بے حد روشن خیال اور "حسین" "شخص ہیں" آخری لفظ پر اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور کہا واللہ - میں نے کہا واہ پھر دیر ہی کیا ہے لو اکرم تیار ہو جاؤ ہم اپنی ایک بھابی نوابی خاندان سے بھی لائیں گے - اکرم - جی نہیں یہ باتیں کچھ آپ جیسے امیروں کو ہی زیبا ہیں ہم غریب تو اگلوں کو ہی پورا نہیں کر سکتے - بس یہ سمجھ لو آدھی درجن بچوں میں تین ہی کی کمی باقی ہے - اب اُنہیں سنبھالیں یا اور کی فکر کریں - دوسرے میں غریب آدمی ہوں اور میری بیوی ہوئیں امرا سے مجھے ایسا کرنا کب لازم ہے -

البتہ تم ہر طرح اس کے لائق ہو بیرسٹر ہو لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہو - اور سب سے بڑھ کر بیوی کے مقابلے میں خاصی حیثیت رکھتے ہو - بچہ بھی خدا کے فضل و کرم سے اب تین سال کی عمر کے قریب ہے، ماں کے بغیر بھی رہ سکتا ہے - کہو لکھوں خط؟

میں - چپ رہو - ابھی کہیں خالہ سُن پائے تو فوراً سب کچھ اپنی اماں سے جا کر بیان کر دے -

اکرم - اور وہ تمہیں مار ڈالیں، بھئی واہ بیوی کا بڑا خوف ہے - لیکن آج تو ہم ٹلنے والے نہیں - یہ جگہ بالکل تمہارے لئے موزوں ہے - دیکھو نا - امارت بھی موجود ہے حسن بھی آزاد خیالی بھی علم بھی - کہو ان باتوں میں سے کونسی چیز کی کمی تم میں ہے؟

میں دل میں تو خوش ہوا لیکن ظاہرا سب سے انکار کرتا چلا گیا - اتنے میں خالد آ کر مجھے ایک واقعہ سنانے لگا - اُس میں اور آپا کی لڑکی میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا - تھوڑی دیر بعد میں نظر جو اٹھاتا ہوں تو اکرم کو کچھ لکھتے ہوئے پایا - میں نے پوچھا "یہ کیا"؟ اکرم نے کہا ابھی دکھاتا ہوں - کوئی پندرہ بیس منٹ بعد اُس نے مجھے ایک پرچۂ خط سنانا شروع کیا جس میں میری طرف سے نواب کے سامنے رشتے کی درخواست کی گئی تھی - خط منگانے کا پتہ اُس نے اپنے مکان کا لکھا تھا - اور اُس میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ چونکہ بزرگ کوئی موجود نہیں اس لئے خود درخواست کی جاتی ہے - میں نے سن کر ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا "بھئی

خوب تم تو بڑے مکار نکلے تمہیں تو کہیں مشاطہ ہونا چاہیئے تھا۔" اُس نے کہا " دیکھئے آج ہی سے شروع کرتا ہوں۔" اس کے بعد اُس نے میز پر رکھی ہوئی میری تصویر فریم سے نکال کر خط کے ساتھ لفافے میں بند کردی۔ میں نے بڑھ کر لفافہ اُس سے چھیننا چاہا لیکن وہ تیزی سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اب اگر میں چاہتا تو اُس کا تعاقب کرکے خط اُس سے چھین لیتا۔ لیکن شیطان کی روح نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ اور میں کرسی پر لیٹے لیٹے نوابوں کے خواب دیکھنے لگا۔ تقریبًا ایک گھنٹہ میں نے اسی قسم کے منصوبے باندھنے میں صرف کردیا۔ اور پھر انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ نزہت مجھے بلا رہی تھی۔ جو کچھ گذر چکا تھا میں نے اُسے وہیں چھوڑا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ایک ہفتہ کے بعد اکرم نے مجھے اپنے مکان پر بلایا اور ایک خط مجھے دیا۔ یہ خط نواب کے ہاں سے آیا تھا اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے قابلِ اطمینان تصور کرتے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا میں نے کہا اکرم بھئی اب کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے لیکن تم نے تو یہ ثابت کردیا کہ نوابوں کی بھی ہم پر رال ٹپک سکتی ہے۔ اُس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر کہا نتیجہ نہ نکلنے سے کیا مطلب؟ اب اِن بھلے آدمیوں کو دھوکا دوگے کیا؟ میں نے کہا اور کیا کروں؟ بیوی کو کہاں رکھوں۔ اکرم:۔ " اُف تم بھی کیسے خفقانی ہو اب بیوی کا سوال لے آئے۔ اُن بیچاری کا کیا ہے دو بھائی ہیں وہ بھی منجمد اور بے حس، ہزاروں کی جائداد چھن گئی لیکن خدا کے بندے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب کیا تم پر دعوے کریں گے؟ اول تو وہ کچھ کریں گے ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو اُن کی اپنی توہین ہے۔" میں نے ایک مصنوعی آہ بھری اور کہا " اور وہ بیچاری" اکرم:۔ " دور ہو جاؤ یہاں سے تمہیں مرد کس نے بنایا تھا۔ عورت سے ڈرتے ہو۔ تمہارے سامنے عورتوں کی کچھ حقیقت ہوگی کیونکہ تم خود بھی اُن سے کم نہیں۔ لیکن میرے سامنے پھر کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں نے کہا اچھا آگئے؟ اکرم:۔ آگئے! آگئے کیا کسی بہانے سے نکال باہر کرو اور بعد میں فورًا طلاق بھیج دو۔ میں:۔ توبہ توبہ کیسی بُری باتیں کرتے ہو۔ اکرم:۔ اچھا جاؤ جا کر بیوی کے پاؤں دھوؤ کہیں دیر ہو جائے تو جوتیاں پڑیں گی تم جیسے اس قابل ہی کہاں کہ کسی اعلیٰ رتبہ پر پہنچ سکیں۔ میں نے کہا بہت جوش میں نہ آؤ۔ کچھ خدا کا خوف بھی ہے یا نہیں (لیکن یہ سب باتیں بناوٹی تھیں کیونکہ میرا بے ایمان دل مجھے مجبور کر رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اکرم کی عالی ہمتی کی داد دے رہا تھا) اکرم بولا " خدا نے کوئی قید نہیں رکھی اُس نے چار بیویوں تک کی اجازت دی ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک ہی رکھو ایک کو نکال دو۔ بہت عرصہ گذار لیا ہر چیز کی آخر کوئی انتہا ہے۔ تم

جیسے آدمی ہی اصل گناہ گار ہونگے جو اپنی تمام آرزوؤں کا خون کر کے جلتے مرتے عمر گذار کر خدا کی ناشکری کرتے ہوئے دنیا سے اُٹھ جائیں گے۔ بھلے آدمی خوش رہو اور خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تمہیں ہر طرح سے آزاد پیدا کیا ہے۔ کیوں عورتوں کی طرح بات بات پر وہم کرتے اور خوف کھاتے ہو۔ کوئی تمہیں مار توڈالے گا نہیں" میں نے کہا اچھا میں سوچ کر بتاؤں گا۔ اکرم:۔ بس تم سوچتے رہو اور وہ تمہارے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اب اگر کوئی ادھر سے تمہاری تحقیقات کو آگیا اور اندر سے بیگم صاحبہ نے پان بھجوا دیئے تو اچھی عزت رہ جائیگی تمہاری میں نے کہا ہاں ہے تو ٹھیک لیکن میری ہمت نہیں پڑتی۔

اس کے بعد اکرم نے مجھے وہ شیطانی چال سمجھائی جس نے مجھے تباہ کر دیا۔ لیکن اس میں اُس کا بالکل قصور نہیں۔ میں جان بوجھ اپنے آپ کو اُس کے ہاتھوں میں دے چکا تھا۔ اور خود اپنے ضمیر کو دھوکا دیتا رہا کہ میں بے قصور ہوں۔ اکرم نزہت کے بھائی کی طرف سے ایک مصنوعی تار بنا کر دلوا چکا تھا "کہ تمہارے بڑے بھائی سخت بیمار ہیں جلد پہنچو" وہ ڈاک گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی فرشتہ مجسم بیوی کے عیوب سوچنے لگا۔ اگرچہ یہ سب خیال ہی تھے۔

تھوڑی دیر بعد تار میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ شام کے قریب موٹر میں بیٹھ کر میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

دبے پاؤں میں نے زینہ طے کیا۔ اپنے کمرے کے باہر ہی سے مجھے ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ اور ساتھ ہی ایک گانے کی دلکش آواز۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شام کی یہ پرسکون خاموشی اسی سحر آفرین نغمہ کا اثر ہے تھوڑی دیر کے لئے میں مسحور ہو گیا۔ اُس کی آواز، آہ یہ وہ شے تھی جس میں ہزاروں کوششوں کے باوجود میں کوئی عیب نہ نکال سکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آسمانی حور شفق کے سنہرے بادلوں میں جھکی ہوئی دنیا والوں کو شام کی آمد کا پیغام سنا رہی ہے۔

یہ آواز اگرچہ سراپا سوز تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک قسم کی طمانیت موجود تھی جو چند لمحے بعد میں اُس سے چھین لینے والا تھا۔ مجھے جراءت نہ ہو سکی کہ خود بخود اُس کے سامنے جا سکوں۔ میں نے ماما کو آواز دی "رحیماً رحیماً! دیکھو تار والا چلا گیا کیا؟"

باجا بند ہو گیا اور وہ آواز بھی ختم ہو گئی ہمیشہ کے لئے۔

نزہت باہر نکل آئی خلاف معمول آج وہ سیاہ ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں

میں کانپ گیا "کہیں اُسے معلوم تو نہیں ہوگیا" لیکن جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ آج اُس کی والدہ کے انتقال کا دن ہے اُس دن کی یادگار میں ہمیشہ وہ سیاہ کپڑے پہنا کرتی تھی۔ میں نے آج کا تمام دن باہر ہی گذار دیا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھے گی۔ اپنے جذبات پر وہ بہت زیادہ قادر تھی۔ اُس نے کہا "تار ہے!" کس کا؟" میں نے کہا "تمہارے بھائی جان کا ہے" اُس نے تار میرے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنے لگی۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا اور میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر آئی اُس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا گاڑی تو اب رات کے دس بجے ہی جائے گی۔ میں نے کہا "ہاں دس بجے" وہ بولی "تو پھر ہمیں گھر سے نو بجے ہی چلنا چاہئے" میں نے کہا افسوس آج ایک ایسا ضروری مسئلہ درپیش ہا کہ دن بھر مجھے فرصت نہیں ملی اور کل بھی میرا شہر سے غیر حاضر رہنا ناممکن ہے۔ بہتر ہے کہ اس وقت تم دو نوکروں کو ساتھ لے جاؤ میں بھی کوشش کروں گا کہ جلد کسی وقت پہنچ سکوں خالد کو یہیں چھوڑ جاؤ تمہیں راستے میں تکلیف ہوگی میں اپنے ساتھ اُسے لے آؤں گا۔ اُس نے کہا "جی ہاں وہ خود بھی آپ کے بغیر نہ جائے گا"

گاڑی کا وقت قریب ہونے لگا وہ بچے کو دیکھنے کے لئے گئی میں نے کہا اسے جگا کر مل لو۔ اُس نے کہا "واہ ایسا ہی کیا میں کوئی مہینوں کے لئے جا رہی ہوں۔ خدا بھائی جان کو آرام دے تو میں جلد آجاؤں گی۔ اس وقت اُٹھ کر اُسے تکلیف ہوگی" آیا کو اُس نے تاکید کی کہ بچے کا اچھی طرح خیال رکھے۔ پھر ہم موٹر میں بیٹھ کر سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ گاڑی آچکی تھی میں نے اُسے سوار کرا دیا۔ اُس نے بچے کے متعلق پھر ایک دفعہ تاکید کی اور کہا اگر تم نہ آسکے تو خط ضرور لکھنا میں نے کہا "ضرور۔ اور تم بھی مجھے پہنچتے ہی خیریت کا تار دلوا دینا"

گاڑی کی روشنیاں آہستہ آہستہ ہلتی معلوم ہوئیں۔ میں نے دل میں کہا اُن روشنیوں کے درمیان ایک دل کی فروزاں روشنی عنقریب میرے طرزِ عمل سے بجھ کر رہ جائے گی۔ دور تک اُس کی افسردہ نگاہیں مجھ پر جمی رہیں اور جہاں تک نظر نے کام کیا مجھے اُس کا خوبصورت چہرہ دکھائی دیتا رہا۔ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں اور میرا جی چاہا کہ کسی غیبی طاقت سے گاڑی رک جائے میں سب باتیں اُس سے کہہ دوں اور اُسے واپس لے جاؤں۔

گاڑی اوجھل ہو چکی تھی مجھے اکرم کا خیال آیا اور میں نے شکر کیا کہ دل کی باتیں دوسرے کو معلوم نہیں ہو جاتیں ورنہ اس وقت اکرم مجھے کس قدر بزدل سمجھتا۔ واقعی وہ مجھے اس اعلیٰ رتبہ پر پہنچا رہا ہے جس کے میں قابل ہوں ایک سربمہر لفافہ میں نے لیٹر بکس میں ڈالا۔ یہی میری مسرتوں کا خاتمہ تھا۔ لیکن میری حماقت دیکھو کہ اُس وقت مجھے اپنی ہستی عجیب پُر شکوہ اور شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ ایک آزاد شہنشاہ کی طرح میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔

یہاں ہر طرف ویرانی اور وحشت برس رہی تھی میں نے کہا خزاں کے بعد اب بہار آنے والی ہے۔
رات بھر میں نہ سو سکا۔ ایک نئے طریقے پر زندگی بسر کرنے کے دل خوش کن خیالات سوچتے سوچتے صبح ہو گئی۔
چند دن بعد مجھے نزہت کا ایک خط جو اُس نے نہایت سراسیمگی کی حالت میں سپرد قلم کیا تھا ملا۔ خط میں لکھا تھا "کسی دشمن نے خواہ مخواہ بھائی جان کی بیماری کا تار ہمیں بھیج دیا۔ وہ بالکل تندرست ہیں۔ یہاں تو خیریت تھی لیکن آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا ابھی تھوڑی دیر ہوئی ڈاکیہ ایک خط دے گیا ہے۔ تحریر تو تمہاری معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ سُن کر تم حیران رہ جاؤ گے۔ یہ ایک طلاق نامہ ہے۔ میں اسے بھی اپنے خط کے ساتھ بھیجتی ہوں تاکہ تم کچھ معلوم کر سکو۔ یہ خط میں سخت پریشانی کی حالت میں لکھ رہی ہوں اور میں اس واقعہ کا یہاں کسی سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتی"۔
یہ خط پڑھ چکنے کے بعد پہلے تو میں حیران ہؤا کہ اب کیا کیا جائے۔ لیکن جلد ہی میں نے ایک تدبیر سوچ لی۔ میں نے انسانیت کا جامہ اُتار پھینکا اور حیوانیت اختیار کر لی۔ قلم اٹھا کر میں نے اُسے ایک ایسا خط لکھا جس کے ایک ایک حرف کو پڑھ کر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس خط کو ڈاک میں ڈال دینے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہُوا۔ اکرم نے میری "دانائی" کی تعریف کی
اس کے بعد مجھے اُس کا کوئی خط نہ ملا۔
دن گذرتے گئے اور خطوط ہی کے ذریعہ سے نواب کے ہاں سے تمام معاملات طے ہو گئے ہمیں کچھ مسرّت بھی تھی اور حیرت بھی کہ وہاں سے کسی نے میری نسبت کچھ تحقیقات نہیں کی۔ لیکن ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ تحقیقات خفیہ طریقوں سے بھی ہوا کرتی ہے۔ میرے دل میں اور بھی غرور پیدا ہُوا اور میں نے کہا واقعی میں اسی قابل ہوں کہ میری نسبت کوئی تحقیقات نہ کی جائے۔
شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی چونکہ دونوں طرف روشن خیال اصحاب موجود تھے۔ اس لئے کوئی لمبے چوڑے سامان نہ ہوئے۔ اپنے دوستوں کے ہمراہ میں برات لے کر پہنچ گیا۔ راستے میں کئی افواہیں سننے میں آئیں کوئی کہتا تھا کہ نواب کے ہاں تو کوئی بیٹی ہی موجود نہیں اور کوئی کہتا کہ اُس کی شادی تو ہو چکی ہے۔ ہمیں ان فضول افواہوں کی بالکل پروا نہ ہوئی۔ ہمارے استقبال کے لئے سٹیشن پر کئی معزز لوگ موجود تھے۔ واقعی یہ لوگ نہایت روشن خیال واقع ہوئے تھے ہم ایک خوشنما محل میں داخل ہوئے۔
نکاح ہو گیا اور نواب کی صاحبزادی کوئی درجن بھر ماماؤں کے ہمراہ رخصت ہوئیں۔ جہیز تو کوئی ایسا

شاندار نہیں تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن معلوم نہیں کہاں سے میرے کان میں یہ بات پڑ چکی تھی کہ نواب صاحب نے ایک بہت بڑی جاگیر بیٹی کے نام کر رکھی ہے۔ اور وہ بیٹی کو ہیروں کے زیور دیں گے۔ مگر دوران نکاح میں اس کا کوئی ذکر نہ آیا۔ میں ان لوگوں کے ساز و سامان دیکھ کر ہی کچھ ایسا مرعوب ہو گیا تھا کہ کسی اور بات کا خیال بھی نہ آیا۔ صبح دس بجے کے قریب عام دوستوں کو رخصت کر کے میں اپنے کمرہ میں داخل ہوا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور کسی حسن جہاں سوز کے خیال ہی سے آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

اُف! ریاض یقین جانو جو کچھ میں نے دیکھا مجھ پر بجلی گر گئی۔ ایک سیاہ فام چیچک رو فربہ اندام لڑکی سر سے پاؤں تک میری بیوی کے زیوروں سے آراستہ عروسی کا جوڑا پہنے آئینے کے سامنے کھڑی تھی نواب کی ملازمہ، اسے میں ایک دفعہ باہر کام کے لئے آتے بھی دیکھ چکا تھا۔

میں نے بیتابی کے لہجے میں کہا "دلہن کہاں ہے" وہ میری طرف مڑی اور پھر میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے کڑک کر کہا "دلہن کہاں ہے" وہ کانپنے لگی۔ میری آواز سن کر نواب کی تمام نوکریں اندر گھس آئیں ایک بوڑھی سی عورت نے ذرا مجھے ڈانٹ کر کہا۔ بیرسٹر صاحب! آپ تو ہماری بچی کا خون خشک کئے دیتے ہیں۔ میں نے کہا "بکواس کیا یہ نواب کی بیٹی ہے"؟ وہ صرف پہلے ہی کچھ سکھائی پڑھائی معلوم ہوتی تھی کہنے لگی خواہ کسی کی ہو خواہ میری ہو بہر حال آپ نے اس سے شادی کی ہے۔ کیا آپ عورتوں کو دکھ دینے کے لئے ہی شادیاں کرتے ہیں۔ اُس کے اِس فقرے سے بہت کچھ واقعات مجھ پر کھل گئے اور کچھ بعد میں معلوم ہوئے نواب کو معلوم ہو گیا تھا کہ میری شادی پہلے بھی ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے مجھے سزا دی۔ خیالات کے ہجوم سے میرا دماغ بے کار ہو گیا میں اوپر چلا گیا نواب کو سزا دینے کے لئے میں نے کئی تدبیریں سوچیں لیکن ہر ایک میں مجھے اپنی ہی خفت نظر آئی۔

وہ لڑکی بار بار عجیب و غریب نظروں سے میری طرف دیکھتی کمبخت معلوم نہیں اب اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی تھی۔ اُف ریاض اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں اب بھی میرے دل میں ایک کراہیت پیدا کر رہی ہیں۔ اور اُن کے مدمقابل وہ بڑی بڑی روشن آنکھیں جن کی سیاہ پلکوں میں رخصت کے وقت آنسو جھلک رہے تھے اب مجھے نفرین و حقارت سے گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں اور میں کانپ جاتا ہوں۔

دوسرے دن اکرم کئی دوستوں کے ہمراہ آموجود ہوا اُس شیطانِ مجسم کے قہقہوں کی آواز دور ہی سے مجھے سنائی دی وہ میرا خوب مذاق بنا رہا تھا۔ میں نے اُس کے ملنے سے انکار کر دیا۔ یوں میری اور اُس کی دوستی

ختم ہوئی۔

میں نے فوراً اُس لڑکی کو طلاق دینا چاہی لیکن وہ ڈھیٹ عورتیں میرا پیچھا چھوڑنے میں نہ آتی تھیں۔ وہ بڑھیا تو مقدمے کی دھمکیاں دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے بہت سا روپیہ ادا کر کے اُن بلاؤں سے نجات حاصل کی۔

اب میں بالکل تباہ ہو چکا تھا ایک ننھے سے بچے کے سوائے کوئی میرا غمخوار نہ تھا۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر میں نے نزہت کو ایک خط لکھا انسانیت تو یہ تھی کہ وہاں جا کر اُس سے معافی چاہتا۔ لیکن میرا غرور اب بھی قائم تھا۔ دوسرے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میں نے اس طرح خط لکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں صرف یہ لکھ دیا کہ تم جلد آ جاؤ کیونکہ گھر میں تمہارے بغیر رونق ہی نہیں اور خالد بھی اداس ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ اِس موقع کو غنیمت جان کر فوراً دوڑی آئے گی میرے بغیر اُس کی زندگی مشکل ہو رہی ہوگی لیکن وہ نہ آئی چند دن بعد مجھے اس کا ایک خط ملا جس میں لکھا تھا "ایک غیر شخص کی حیثیت سے اب تمہیں مجھے خط لکھنا واجب نہیں۔ اس خط سے میری روح کو سخت صدمہ پہنچا۔ جسم ایک فانی چیز تھی اُسے جہاں تک ہو سکا تم رسوا کر چکے۔ لیکن اب میری روح کی تحقیر نہ کرو۔ اس قسم کا کوئی خط اب یہاں نہ آنے پائے صرف میری یہ درخواست ہے کہ میرا بچہ جب تک چھوٹا ہے اُسے میرے پاس رہنے دو اور اس خط کو دیکھتے ہی اُسے یہاں بھیج دو"

لیکن پھر بھی میں نے اُسے یہی لکھا کہ بچے کو وہاں بھیج کر میں خود کیا کروں۔ تم یہاں آ جاؤ مجھ پر نہیں تو اسی کے حال پر رحم کرو۔ وہ پھر بھی نہ آئی اُس نے لکھا کہ میری عزت اور خودداری کو جو صدمہ پہنچ چکا ہے اُس کی تلافی حشر تک نہیں ہو سکتی۔ کیوں میری توہین پر توہین کرتے چلے جا رہے ہو۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟ میرا بچہ میرا پیارا میں اُسے بھی خدا کے سپرد کرتی ہوں وہ مجھ سے دور سہی لیکن میرے دل کی دعائیں اس سے بہت نزدیک ہیں خدا اُس کا حافظ و ناصر ہو"

میں کچھ مایوس سا ہو گیا لیکن میری فریب کار طبیعت کو ایک اور ترکیب سوجھی مجھے معلوم تھا کہ وہ بچے کے لئے تڑپ رہی ہوگی۔ اس لئے میں نے اُس کے متعلق ایک دردانگیز خط لکھا جسے پڑھ کر پتھر کا دل بھی موم ہو جائے۔ یہ باتیں اگرچہ بہت کچھ غلط تھیں لیکن پھر بھی ہر بات میں تھوڑی سی صداقت موجود تھی۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھا لیکن یہ فطرت کے خلاف تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھول جائے۔ اگرچہ میرے سامنے اُس نے کبھی اپنی اماں کا نام نہ لیا لیکن یہ بھی ظاہر تھا کہ اب اُس کے چہرے پر کبھی وہ حقیقی مسکراہٹ نمودار

نہیں ہوئی۔ اُس کی بناوٹی ہنسی کو ہمیشہ میں محسوس کرتا رہا۔ اُس کا جسم پہلے سے بہت نحیف ہو گیا تھا اور وہ ذرا ذرا سا بہانہ ڈھونڈ کر رونا شروع کر دیتا اگرچہ بچپن کی وجہ سے اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے دل میں کیا خلش ہے۔ مجھ سے بھی اب وہ پہلے کی طرح بے تکلف نہیں تھا۔ اور مجھ سے بات بات پر ڈرنے لگا تھا۔ میرے سامنے کبھی اپنی ماں کی کوئی بات نہ کرتا لیکن جو باتیں وہ نوکروں سے کیا کرتا اُن سے صاف معلوم ہوتا کہ اُسے ہر وقت اپنی اماں یاد رہتی ہے۔

دوپہر کے وقت میں اندر کمرے میں بیٹھا تھا آیا باہر فرش پر بیٹھی ہوئی چھالیہ کتر رہی تھی۔ خالد اپنے چہرے کو ننھے ننھے ہاتھوں کا سہارا دیئے اُس کے قریب بیٹھا مختلف سوال کر رہا تھا۔ مجھے اُس کی آواز سنائی دی "آیا تمہاری اماں بھی تمہاری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں؟" آیا نے کہا نہیں بیٹا میری اماں مر چکی ہیں۔ اُس نے کہا "ہوں،" "آیا میری اماں میری آنکھوں کو چوما کرتی ہیں۔" آیا نے کہا تمہاری اماں کہاں ہیں؟ کہنے لگا "مجھے معلوم نہیں"

ایک دن آیا نے نزہت کی ایک پرانی ساڑھی پہن لی اُس دن میں نے دیکھا کہ خالد تمام دن اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ کبھی پوچھتا آیا یہ ساڑھی تمہیں اماں نے دی تھی۔ کب دی تھی؟ کبھی کہتا میرا کوٹ بھی اماں نے مجھے دیا تھا۔ میں مجرموں کی طرح چھپ چھپ کر اُس کی باتیں سنتا اور خود اُس سے کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

میرے اُس خط کا کوئی جواب نہ آیا کئی دن گذر گئے۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا سنگدل ظالم عورت بچے کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن "ریاض" سنگدل نہ تھی اُس کا نازک دل اتنے بڑے رنج والم کی تاب نہ لا سکا۔ آہ وہ اس دنیا سے چل بسی۔ اور یہ منحوس خبر جانتے ہو کس وقت مجھے ملی۔ وہ قیامت خیز گھڑی میں کیسے بیان کروں۔ میرا دل پھوٹ کر باہر نکل جانا چاہتا ہے۔ آہ وہ منحوس دن جب کہ اچانک دو بجلیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ ریاض! سنتے ہو مجھ پر کیا کیا گذر گئی؟ ہاں اس کی موت کی اطلاع مجھے اُس وقت ملی۔ جب میں خالد کو ویران جنگل میں تنہا ہمیشہ کے لئے خاک کے نیچے سُلا کر آرہا تھا۔ یہ سانحہ یکبارگی گذر گیا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میں میز کے قریب بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ مجھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی معلوم نہیں کیوں میں باہر نکل آیا۔ خالد اپنی اماں کا ایک سیاہ سا نقاب پہنے اوپر کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "آیا دیکھو اماں آرہی ہیں" بے اختیار میں سامنے آگیا۔ گھبراہٹ میں اُس کا پاؤں پھسل گیا۔ لوہے کی تمام سیڑھیوں پر اُس کا سر ٹکتا رہا ایک لمحہ بعد وہ نیچے آرہا۔ میرا جسم شل ہو گیا تھا مجھ سے بلا تک نہ گیا۔ ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ دماغ پھٹ چکا ہے آہ اس سے آگے میں کیا لکھوں۔

دوسرے دن میں اوپر کی منزل میں اپنی بیوی کے اُس کمرہ میں گیا جہاں اُس کا کچھ سامان وغیرہ پڑا رہتا تھا۔ آہ دو ننھے ننھے پیروں کے نشان گرد آلود صندوق پر ابھی تک موجود تھے۔ اور ایک چھوٹی سی لکڑی جس کے ساتھ خالد نے صندوق پر چڑھ کر کھونٹی سے نقاب اتارا ہوگا۔ بے ہوش ہوکر معلوم نہیں کتنا عرصہ میں وہاں گرا رہا۔

اب میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں لیکن اس تمام انقلاب نے میری آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹا دیا۔ نزہت اگر میرے بلانے پر آجاتی تو کبھی میں اُسے وہ نہ سمجھ سکتا جو اب سمجھتا ہوں۔ اور اُس نے مجھے بتا دیا کہ حمیت اور غیرت کس چیز کا نام ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں بہترین عورت وہی تھی۔ جسے میں ڈھونڈتا تھا حقیقت میں اُسے پا چکا تھا اور چونکہ خود اُس کے قابل نہیں تھا اس لئے اُس کی زندگی میں میں کچھ نہ جان سکا۔ مگر اُس نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ اُس کی یاد کو بھی اب میں اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ بعض اوقات یہ سب ایک خواب معلوم ہونے لگتا ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ بیش بہا دولت کبھی میرے پاس موجود بھی تھی

اب میں سمجھا کہ انسان کو ایک ہی بار جو کچھ مل جائے وہی حقیقی ہے۔ اور جو بار بار کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اُس سے زیادہ بیوقوف کوئی نہیں۔ کیونکہ دوسری مرتبہ تو وہ چیز پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس قدر محبت میرے حصہ میں آئی تھی اُسے میں نے بے دردی سے ضائع کردیا اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے بار بار انسان حاصل نہیں کرسکتا اور جب کوئی اسے کھو بیٹھتا ہے تو پھر ساتھ ہی اُس کی تمام مسرتیں اور راحت قلب بھی رخصت ہوجاتی ہے۔ کیا اب میرے دل میں کوئی دوسری عورت میری بیوی کی جگہ لے سکتی ہے یا کوئی بچہ خالد کے برابر مجھے عزیز ہوسکتا ہے؟

میں راتوں کو اُٹھ کر باہر نکل جاتا ہوں۔ تمام تمام رات آوارہ و تنہا پھرنے میں گذر جاتی ہے۔ مجھے اب دنیا کی کسی چیز سے دلبستگی نہیں رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک خالی جسم جو ہر قسم کے جذبات سے بے بہرہ ہوچکا ہے کیوں ابھی تک دنیا میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

عالم تصور میں بار بار مجھے ایک بچے کی شرارت آمیز ہنسی اور ایک عورت کی ملامت خیز نظریں دکھائی دیتی ہیں۔ میں کانپ اٹھتا۔ اپنے گناہوں کی ندامت سے میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو ختم ہوچکے ہیں اب مجھے کبھی رونا نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں رونے کی کوشش کروں تو آنسو کا ایک قطرہ بھی میری آنکھوں سے نہ نکلے۔

اب اس جگہ یوں پڑے رہ کر زندگی گذار دینا مشکل ہے میں چلا جاؤں گا یہاں سے دور بہت دور کسی ایسے صحرا میں جس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کی ہمرنگ ہو میں اپنے جسم کو کانٹوں میں گھسیٹتا پھروں گا۔ جب دل کو چین میسّر نہیں تو اس جسم کو کیوں آرام لینے دوں میرا قیام کہیں نہ ہوگا یہ سفر صرف اُس وقت ختم ہوگا جب موت آکر مجھے اپنے دامانِ عاطفت میں چھپا لے۔

ز ب

عجز و غرور کا مقابلہ

تمہیں ربطِ جور و جفا پر گھمنڈ
ہمیں خبطِ مہر و وفا پر گھمنڈ

تمہیں حسنِ دو روز پر نخوتیں
ہمیں عشقِ دائم بقا پر گھمنڈ
تمہیں بختِ فیروز پر نخوتیں
ہمیں قسمتِ نارسا پر گھمنڈ

تمہیں جبرِ بے جا کی عادت پہ ناز
ہمیں تابِ صبر و رضا پر گھمنڈ
تمہیں ایک دنیا کی طاقت پہ ناز
ہمیں صرف اپنے خدا پر گھمنڈ

تمہیں تیغِ خوں بار پر نازشیں
ہمیں بے ضرر دست و پا پر گھمنڈ
تمہیں خوئے پیکار پر نازشیں
ہمیں طبعِ صلح آشنا پر گھمنڈ

تمہیں قبضۂ بحر و بر پر غرور
ہمیں ترکِ ہر دو سرا پر گھمنڈ
امیروں کو اموال و زر پر غرور
فقیروں کو فقر و فنا پر گھمنڈ

اب آزادؔ تم صاحبِ زر نہ زور
یہ سچ ہے تو پھر کس بنا پر گھمنڈ

حکیم آزاد انصاری

انسان اور الوہیت

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب وقت ابھی پیدا ہی ہوا تھا جب دیوتاؤں کو معرضِ وجود میں آئے ابھی اتنا عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُن کے نام رکھے جاتے، اور انسان کا جسم اُس گڑھے کی مٹی سے جس میں سے کھود کر اُسے بنایا گیا تھا ابھی گیلا گیلا ہی تھا کہ انسان نے دعویٰ کیا کہ ایک پہلو مجھ میں بھی الوہیت کا موجود ہے

دیوتاؤں نے اُس کے قول کا وزن کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ واقعی اُس کا دعوے کچھ اہمیت رکھتا ہے

جب انسان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا گیا تو روایت کہتی ہے کہ دیوتا چوری کے ارادے سے نکلے اور انسان کی الوہیت کو لے اُڑے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے کسی ایسی جگہ چھپا دیں کہ پھر انسان کی نظر بھی اُس پر نہ پڑ سکے مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اگر وہ اُسے کہیں زمین پر چھپاتے تو اُن کی پیش بین نگاہ دیکھتی تھی کہ انسان اُس وقت تک چین نہ لے گا جب تک وہ زمین کا ذرہ ذرہ چھان کر اُسے نکال نہ لے۔ اگر وہ اسے کہیں اپنے درمیان چھپاتے تو اُنہیں معلوم تھا کہ انسان فضاؤں کو چیر کر آسمانوں تک بھی راستے تعمیر کرے گا۔

اور جب وہ کھڑے یہ مشورے کر رہے تھے تو سب سے عقلمند دیوتا نے کہا:-

"ادھر لاؤ! میں جانتا ہوں اسے کہاں چھپانا چاہیئے"

اُس نے انسان کی الوہیت کی ننھی منی روشنی کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور جب وہ عظیم الشان ہاتھ کھلا تو روشنی اُس میں موجود نہ تھی۔

دیوتا نے کہا:-

"اب مطمئن ہو جاؤ میں نے اُسے ایسی جگہ چھپا دیا ہے جہاں سے اُس کے ڈھونڈنے کا خیال تک انسان کے دل میں نہ آئے گا ——— میں نے اُس کو انسان کے اپنے وجود میں چھپا دیا ہے"

منصور احمد

کپلنگ

خدا ہمارے نفس میں موجود ہے۔

اوڈ

جس طرح روح جسم کی زندگی ہے اُسی طرح خدا روح کی زندگی ہے۔ اس لئے جس طرح روح کے جسم کو چھوڑ جانے سے جسم بے کار ہو جاتا ہے اُسی طرح روح مرجاتی ہے جب خدا اُس کو چھوڑ دے۔

سینٹ آگسٹائن

خدا! اے وہ علتِ اولیٰ جسے دنیا نے بہت کم سمجھا۔

پوپ

پیغام بر

۱۸۶۹ء کے موسم سرما میں میں نے اپنا طبی کام کچھ دنوں کے لئے اپنے دو دوستوں کے سپرد کیا اور خود ماسکو میں بین الاقوامی طبی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے پیرس سے روانہ ہوا۔ کانگریس کے پہلے پہلے اجلاس حد درجہ دلچسپ تھے۔ وقت کے مشہور و معروف اطبا نئے نئے نظریے پیش کرتے تھے اور اُن نئے نئے طریقوں اور اصولوں پر بحثیں کرتے تھے جو اب بالکل بھول چکے ہیں۔ اور میں چونکہ اُن دنوں جوان تھا اس لئے ان بحثوں میں نہایت گرمجوشی سے حصہ لیتا رہا۔ کانگریس کی روایات کے مطابق شام کے وقت تمام نمائندوں کو کھانے اور راگ رنگ کی مجلسوں میں بلا لیا جاتا تھا۔

کانگریس کے انعقاد کے تیسرے روز ایک پروفیسر "مسمرازم" کے ذریعے سے، کہ اُن دنوں نفسی طب کے لئے یہی لفظ بولا جاتا تھا، صرع کے علاج پر تقریر کرتا رہا - ایسی ہی دلچسپ اور روح پرور بحثوں کے دوران میں میں نے دور خیالی اور خوابوں کی تعبیر کے متعلق بھی بڑے بڑے حکما کی تقریریں سنی تھیں۔ میں اُن سب کو محض توہم پرستوں کے ایجادات سمجھتا تھا مگر اُس دن جب میں اپنی قیام گاہ کو واپس جا رہا تھا تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے میری مادہ پرستی کو کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے اور یہی زمانہ تھا جب میں نے زندگی کے متعلق اپنے خیالات کی اصلاح کی۔

اسی شام کو ماسکو کے گورنر نے نمائندوں کے اعزاز میں ایک دعوت دی یہ ایک ایسا مجمع تھا جس میں بڑے بڑے مدبرین سلطنت اور عمائدین حکومت، بڑے بڑے علما و فضلا اور خوبصورت عورتیں جمع تھیں۔ اب جب کہ بڑھاپا مجھ پر چھا رہا ہے میں اس دعوت کا خیال کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سب کچھ اب خواب و خیال ہو چکا ہے۔ جذبات مردہ ہو چکے ہیں۔ محبت ختم ہو چکی ہے۔ اُس زمانے کے نوجوان لفٹنٹ آج کل بوڑھے جرنیل بن چکے ہیں۔ وہ لڑکیاں جو اُن دنوں نوجوان اور حسین تھیں اب بوڑھی اور خود غرض دادیاں نانیاں ہو چکی ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اُن مہمانوں میں سے اکثر جو اس نہ بھولنے والی دعوت میں شریک تھے اب ہمیشہ کی نیند سو رہے ہیں۔

میں ایک سرجن کے پاس بیٹھا تھا جو فرانسیسی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور میں ابھی اس زبان میں

مبتدی تھا۔ میری عمر ابھی اُس منزل کو نہ پہنچی تھی جب دل سے مشاہیر پرستی کے تمام خیالات یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ میری رومانی نظروں کو دنیا کے عظیم الشان انسان آسمان کے درخشاں ستارے معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی ہستیاں مجھے سطح عام سے بلند نظر آتی تھیں۔ میری روح کو کسی ایسے وجود کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جس کے سامنے میں اپنا سرِ نیاز جھکا دوں جس کی میں پرستش کروں چنانچہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے امرا اور روسا کی اُن لڑکیوں میں سے اکثر کے ساتھ جو اس دعوت میں شریک تھیں مجھے عشق سا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کم از کم اس وقت میرا درجہ اُن تمام بڑے بڑے حکما کے برابر ہے جو یہاں موجود ہیں۔

کسی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا یہ ایک عورت تھی جسے میں نہ جانتا تھا اور جو روسی زبان میں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی سازش سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زرد رو تھی اور اس کا جسم نرم و نازک تھا۔ اُس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے نقوش نمایاں تھے اور زردی اُس پر غیر معمولی طور سے چھائی ہوئی تھی اُس کی موجودگی اس پُر مسرت اور شگفتہ مجلس میں غم اور افسردگی کے عنصر کی ایک اجنبی آمیزش کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زمہریر کی کھڑکی کھل گئی ہے جس میں سے برفانی ہوا اپنی پوری تندی کے ساتھ کمرے میں برف باری کر رہی ہے۔

چونکہ میں روسی زبان نہ جانتا تھا اس لئے میں نے اپنے سرجن دوست سے ترجمان بننے کو کہا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اِس عورت نے کہیں سے سنا ہے کہ تم دل کے امراض کا بہت اچھا علاج کرتے ہو اور چونکہ اس کا ایک رشتہ دار سخت بیمار ہے اِس لئے وہ تمہیں بلانے آئی ہے۔

ایک سپاہیانہ جوش کے ساتھ میں نے اُسے جواب دیا کہ میں اُس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں۔ گو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس عظیم الشان دعوت کی شرکت سے محروم ہو جاؤں گا۔ مگر یہی میرے لئے عورت کے بلاوے کو منظور کرنے کا سب سے بڑا باعث ہو گیا۔ کیونکہ نفس کی قربانی میرے نزدیک جوانی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اِس کے علاوہ مجھے اس پر ناز ہونے لگا کہ اتنے بڑے بڑے حکما میں سے صرف مجھے منتخب کیا گیا ہے۔

بہر حال میں نے کوئی مزید سوال کئے بغیر اپنی ٹوپی اور اوورکوٹ لیا اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔

مجھے یہ تمام باتیں اس طرح یاد ہیں جس طرح کوئی کل کا واقعہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اُس عورت کے ساتھ جب میں محل کے دروازے کی طرف بڑھا تو اس وقت ایک لڑکی جو سفید لباس میں ملبوس تھی سیڑھیوں پر سے اوپر کی طرف آ رہی تھی جب وہ ہمارے قریب پہنچی تو کھلے ہوئے دروازوں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اُس وقت

اُس کے چہرے پر پڑی ہیں یہ سب کچھ اپنی چشم تصور میں اب بھی دیکھ سکتا ہوں اور یہ نظارہ مجھے اُس پرانی تصویر کی طرح نظر آتا ہے جس کا کاغذ زرد پڑ گیا ہو۔ مجھے یہ ماضی کا ایک ڈھانچ معلوم ہوتا ہے جس کی جگہ صرف ایک بوڑھے آدمی کے دماغ میں باقی رہ گئی ہو۔

گزرے ہوئے زمانہ کی یاد جہاں کچھ حسرت آفرین سی ہوتی ہے وہاں اُس میں کچھ مضحکہ خیزی بھی ضرور ہوتی ہے۔ اُن دنوں کے لباس دیکھو تو آج کل کے فیشن کا منہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اگر آج کوئی اُن عورتوں میں سے کسی کو اپنے بھونڈے لباس میں دیکھ پائے تو کہے کہ ایسی عورت سے بھی کوئی شادی کرے گا؟

باہر آکر حسن اتفاق سے ہمیں ایک معمولی گاڑی مل گئی جو عام طور پر ماسکو کے بازاروں میں چلتی ہے اور جس کے آگے تین گھوڑے جتے ہوتے ہیں۔ عورت اُس سے کرایہ طے کر رہی تھی کہ میں نے گاڑی والے کا چہرہ لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کے رخسار سرخ تھے اور جلد سخت تھی اور اُس پر جھریاں نمودار تھیں۔ گھنی داڑھی تھی اور ناک عام روسیوں کی طرح خفیف سی۔

ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور اُن بازاروں میں سے گزرنے لگے جن کو جگمگاتی ہوئی دکانوں کی روشنی نے بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پھر ہم ایسے کھلے اور تاریک مقامات میں آگئے جہاں نظر صرف اشیا کے بیرونی خطوط کو پہچانتی تھی۔ کہیں کہیں اندھیری فضا کے سامنے روسی کلیساؤں کے سفید سفید گنبد بڑی آن سے کھڑے اپنی شانِ تقابل دکھا رہے تھے جن کو دیکھ کر دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی۔ تمام راستے میں سوائے بندوقوں سے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمیں کوئی راہ گیر نظر نہ آیا۔ اب شہر کے نواح سے گزر کر ہم دیہات میں پہنچ چکے تھے۔ قدیم شہر کے شور و غوغا اور چکاچوند کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تاریکی اور بھی زیادہ تھی ہر طرف موسم سرما کی سکوت آمیز شوکت چھا رہی تھی۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ زمین پر، درختوں پر، درختوں کی شاخوں پر ہر جگہ برف تھی، اور ایک سکونِ کامل تھا جس سے اول اول مجھے کچھ تسکین سی ہوئی۔ مگر بہت جلد میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ اور میں محل کی روشنی اور گرمی کیلئے جس کو میں نے بے سوچے سمجھے چھوڑ دیا تھا بہت متاسف ہوا۔ میں اپنی حماقت کو صلواتیں سنانے لگا۔ سفر کے سکوت اور یکسانی سے مجھ پر نیند کا سا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے اپنی حالت دگرگوں معلوم ہونے لگی۔ کبھی سمجھتا کہ میں گاڑی میں اکیلا ہوں اور کبھی جانتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، بہت ہی بوڑھا۔ مجھے ڈر آنے لگا کہ کہیں بھیڑیئے حملہ نہ کر دیں اور میں نے چاہا کہ کاش میں اپنا پستول ساتھ لے آتا۔ میں نہ جانتا تھا کہ میں اُس جرات کو کیا کہوں جو مجھے یہاں لے آئی تھی، کیونکہ ایک ایسے

ملک میں جہاں ہر طرف خفیہ انجمنوں کا جال پھیلا ہوا ہو ہر ممکن خطرہ پیش آسکتا ہے۔ کیا میں کسی ایسے ہی دام میں پھنسنے کے لئے جا رہا تھا؟ کیا مجھ پر انہیں جاسوسی کا شک ہوا تھا یا کیا انہوں نے مجھے لوٹنے کا تہیہ کر رکھا تھا؟ لیکن اس کے لئے انہوں نے کسی امیر آدمی کو کیوں انتخاب نہ کیا؟ میں نے ہزاروں نظریے قائم کئے اور پھر سب کو رد کر دیا۔

میں تقریباً سو رہا تھا جب ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے کسی مکان کی کھڑکیوں میں سے اب تک روشنی نمودار تھی۔ گھوڑے ہانپ رہے تھے اور اُن کے منہ سے کف جاری تھا۔ گاڑی ایک سرائے نما عمارت کے سامنے کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھلا اور مجھے تنباکو کے دھوئیں کے ایک مرغولے میں سے کسی شخص کی تاریک صورت نظر آئی جس نے ایک چغہ اور لمبے بوٹ پہن رکھے تھے۔ ہم گاڑی میں سے باہر آگئے۔ اور مجھے اپنی مضبوط ٹانگیں پھیلا کر ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ گاڑی والا سرائے والے سے بات کر رہا تھا مگر وہ عورت مجھے اندھیرے میں اور آگے لے گئی۔ میں اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر حملہ ہوا تو اپنی پوری طاقت سے اُس کی مدافعت کروں گا۔ چاروں طرف کامل سکوت تھا۔ ہم برف میں سے گزر رہے تھے راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی تھی۔ میں نہایت پریشان تھا اور میرا دماغ عالم لاہوت کے متعلق اُن خیالات سے پُر تھا جن کا تذکرہ ہم شام کے وقت کر رہے تھے۔ مجھے وہ کہانیاں یاد آرہی تھیں جو میری انّا مجھے سُلانے کے لئے سنایا کرتی تھی، اُن بھوتوں کی کہانیاں جو نئی نئی کھدی ہوئی قبروں کے اوپر منڈلایا کرتے ہیں۔ اور میں اپنے دل کی آنکھوں سے قبریں، کفن، کالی کالی شمعیں جو ماتم کے دنوں میں جلائی جاتی ہیں اور تمام وہ وہمی نظارے دیکھ رہا تھا جنہوں نے موت کے خیال کو آلودہ کر رکھا ہے اور اُسے خوفناک اور وحشت انگیز بنا دیا ہے۔ سیاہ اور خاموش تاریکی، اُس کا سحر، رات کی برفانی سردی یہ سب مجھے اُس رات زندوں کی دنیا کی بجائے مُردوں کی دنیا کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔

آخر کار ہم ایک تاریک سے دیہاتی مکان کے باغ کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ مجھے کسی کے پاؤں کی چاپ قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں یہ خیال کر کے کہ شاید وہ عورت مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی ہے، پیچھے کو مڑا۔ میری حیرت اور خوف کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ غائب ہو چکی ہے۔ میں اب اکیلا تھا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اتنی جلد اور اتنے نامعلوم طریقے سے وہ کہاں چھپ گئی مگر مجھے ان خیالات میں محو ہونے کا زیادہ وقت نہ ملا کیونکہ اسی وقت دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک لڑکی کو پایا۔ میں نے

فرانسیسی زبان میں اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا۔ اُس نے رکتے رکتے جواب دیا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ گھر میں سب کی صحت بہت اچھی ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ آپ اندر جا کر میرے والد سے گفتگو کیجے وہ فرانسیسی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ میں بالکل مایوس ہو رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے مَیں اُس کے پیچھے ہولیا۔ کمرے میں ایک بوڑھا آدمی آرام کرسی پر مٹی کے ایک چولہے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر کسی ماہر امراض کے لئے یہ معلوم کرلینا بالکل دشوار نہ تھا کہ یہ شخص دل کی کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ اُس کے چہرے کے ارغوانی رنگ میں نیلاہٹ کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی اور ناک کسی شرابی کی طرح سرخ تھی اُس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا جو اُس کے دل کی حرکت کے ساتھ ساتھ کانپتا تھا۔

میں نے اُسے سلام کیا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی عینک کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ ظاہر تھا کہ اُس نے میرے بیان کے ایک لفظ کا بھی اعتبار نہیں کیا اور وہ میرے حقیقی ارادوں سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ اُس کے غصہ کو کم کرنے کے لئے اور بے وقت اُس کے آرام میں خلل انداز ہونے کی توجیہ کیلئے میں نے اُسے سارا قصہ سنا دیا۔ اُس نے نہایت توجہ سے میری کہانی سنی اور جب میں ختم کر چکا تو اُس نے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ تمہارے یہاں آنے کو میں کیا سمجھوں۔ کچھ بھی ہو تم غلطی پر ہو۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔ مگر چونکہ تم نے بے فائدہ بہت سی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ذرا دیر آرام لے لو۔ آج رات تم ماسکو واپس نہیں جا سکو گے۔ اس لئے تمہیں یہیں سرائے میں قیام کرنا پڑے گا۔ میں اپنی میزبانی تمہیں پیش کرتا مگر چونکہ ہمارے ہاں مہمان نہیں آتے اس لئے ہم تمہارے آرام کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہ کر سکیں گے۔"

اُس نے سگرٹوں کا ڈبا میری طرف سرکا دیا اور اُس کی لڑکی میرے لئے چائے بنا لائی۔ اسی عرصہ میں قریبًا قریبًا ایک نیم شعوری کی حالت میں مَیں نے ایک نظریہ قائم کیا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو وہ عورت اسی شخص کی حالت کو سمجھ کر مجھے یہاں بُلا لائی ہے گو خود اسے اپنی مرض کا اندازہ نہیں۔ غالبًا اُس نے دیکھا ہوگا کہ ڈاکٹر کا مشورہ نہایت ضروری ہے اور اُس نے مصلحت اندیشی سے کام لے کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر ایک ڈاکٹر اُس کے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے بھی اپنا کام پوری حکمت عملی سے انجام دیا ہوتا مگر سفر کی کوفت نے مجھے اُس کی اجازت نہ دی۔

میں نے بوڑھے آدمی سے کہا آپ بالکل اچھی طرح ہیں نا"؟ وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"میری عمر اس وقت اسّٹھ برس کی ہے اور اس تمام عرصہ میں مَیں ایک مرتبہ بھی بستر پر نہیں پڑا۔ بڑھاپے کے ساتھ کمزوری یقینًا آجاتی ہے۔ میں اب اُتنا طاقتور نہیں جتنا کہ ہوا کرتا تھا، اور مجھے ضیق النفس کی بھی تھوڑی

سی شکایت ہے مگر اُسے نظر انداز کر دیا جائے تو میں بالکل تندرست ہوں۔ نہیں ڈاکٹر! تم مان جاؤ، میرے ہاں سے تم ایک پیسہ بھی نہ کما سکو گے"!

گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ کانگریس اور پیرس کی زندگی پر باتیں شروع ہوئیں۔ بوڑھے کی دبلی پتلی شرمیلی لڑکی اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن اُس نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ لڑکی کے باپ کی گفتگو میں دانشمندی اور بذلہ سنجی دونوں موجود تھیں۔ اور میں ان صفات کو ایک گوشہ نشین میں دیکھ کر حیران رہ گیا غالباً میری گفتگو نے اُس کی طبیعت کو شگفتہ کر دیا تھا، کیونکہ اُس نے طالب علمی کے زمانے کی باتیں، اپنی جوانی کی غلط کاریاں اور اُس زمانے کے حالات جب وہ ایک نوجوان وکیل تھا سب سنا ڈالے۔ کوئی ایک گھنٹے تک اُس نے اپنی بھولی بسری جوانی کو اپنی باتوں سے پھر زندہ کر دیا۔ اسی وقت شمع کچھ اس طرح ٹمٹمائی گویا وہ بجھنے کے قریب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے مجھ پر ایک گہرا اثر کیوں ہوا در آں حالیکہ اس میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہ تھی موم بتیاں لائی گئیں مگر اب سحر ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نوجوان خاوند یکایک کوئی بدشگونی دیکھ پائے۔ گھڑی بارہ کا گھنٹہ بجا رہی تھی کہ میں وہاں سے رخصت ہوا۔ بوڑھے وکیل نے مجھ سے دوسرے دن دوبارہ ملنے کو کہا اور میں نے اس کا بے ساختہ وعدہ بھی کر لیا۔ اُس کی لڑکی دروازے تک میرے ساتھ آئی اور کہنے لگی:-

"ڈاکٹر مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ تم آگئے گو تمہارا آنا غلطی ہی سے ہوا۔ میرے والد سالہا سال سے کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے کہ آج۔ کل ضرور آنا۔ میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ہاں لوگ آیا کریں اس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی"۔

میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال اُٹھتا تھا کہ میری خاموش ہم سفر مجھے ضرور راستے میں ملے گی لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ سرائے میں ابھی شمعیں جل رہی تھیں اور جب میں اندر داخل ہوا تو سرائے والا کچھ لوگوں کو جنہوں نے روسی طرز کی پوستینیں پہن رکھی تھیں اخبار سنا رہا تھا۔ اُن سب کے لمبے چہرے اور لمبے بال تھے اور وہ ایک ہی انداز میں یعنی اپنی ٹھوڑیوں کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف کچھ تو ایک قسم کی تیز روسی شراب پی رہے تھے اور اکثر حقہ نوشی میں مصروف تھے۔

سرائے کی فضا میں دم رکا جاتا تھا اور تمباکو کے دھوئیں کا ایک دل بادل چھت کو چڑھ رہا تھا۔ میں نے اشاروں سے سرائے والے کو سمجھایا کہ مجھے رات گزارنے کے لئے کمرے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ مجھے ایک

ایسے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔

دیوار جس پر سفیدی ہو رہی تھی یونانی علمائے دین کی تصویروں سے مزین تھی۔ سرائے والا موم بتیاں لے آیا اور لکڑیوں کا ایک ڈھیر لگا کر اُسے بھی آگ لگاتا گیا۔ میں سونا نہ چاہتا تھا اس لئے میں نے سگار سلگایا اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر شام سے لے کر اب تک جو جو واقعات پیش آئے تھے اُن پر غور کرنے لگا۔

میں اپنا سگار ختم کر چکا تھا کہ مجھے سیڑھیوں میں سے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں کانپ گیا۔ میں نے سمجھا کہ یقیناً یہ کوئی چال ہے جس میں میں پھنسا ہوں اور لٹا ہی چاہتا ہوں۔ مگر میں نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ سرائے والا اور بوڑھے وکیل کی بیٹی جن کے گھر میں میں نے شام کا وقت گزارا تھا میری طرف آ رہے ہیں لڑکی پریشان معلوم ہوتی تھی لیکن پھر بھی اُس نے اپنے حواس کو برقرار رکھا تھا۔

لڑکی نے کہا حسنِ اتفاق کی بات ہے کہ تم یہیں تھے۔ والد ابھی اپنے بستر میں لیٹے ہی تھے کہ اُن پر مرض کا ایک زبردست حملہ ہوا۔ شاید آج رات زیادہ ہلنے جلنے سے انہیں تکلیف ہو گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف دی مگر مجھے امید کہ تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔ شاید تم اُن کے لئے کچھ کر سکو!

جس کمرے میں وہ مجھے لے گئی وہ بلند اور نامرغوب سا تھا۔ ہوا میں سے نوش دارو کی تیز بو آ رہی تھی۔ میز پر ایک لمپ جل رہا تھا اور وہ تمام چیزیں اُس پر رکھی تھیں جو عموماً پلنگ کمرے میں ہوتی ہیں۔ مثلاً بالوں کا برش۔ استرا۔ گھڑی اور ایک بڑا سا ٹائی پن جس پر ابھرے ہوئے نقش بنے تھے۔

انگیٹھی میں آگ کے آخری شعلے بجھ رہے تھے۔ بستر کے پردے ہٹا دیئے گئے تھے۔ ایک بوڑھا نوکر بستر کے پاس کھڑا دعا مانگ رہا تھا اور ایک نوکر کرسی پر بیٹھا رو رہا تھا۔

میں نے بوڑھے مریض کے دل کی حرکت سننی چاہی مگر اُس کے سینے میں اب کوئی سانس باقی نہ رہی تھی۔ موت اپنا کام کر چکی تھی اور اعضا میں سختی نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے لڑکی کو اُس کے باپ کی موت کی خبر جس قدر نرم پیرایہ میں ممکن تھی سنا دی۔ لیکن وہ اس سے پہلے ہی سمجھ چکی تھی اور اُس نے اپنی پوری نسوانی قوت سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا

میں اپنے ہاتھ دھو رہا تھا اور دن کے تمام واقعات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک تصویر کے چوکھٹے پر پڑی۔ اُسے مصور نے سنہ ۱۸۳۰ء کے اندازِ مصوری پر بنایا تھا اور جس نوجوان عورت کی یہ تصویر تھی اُس کا لباس لمبا اور بال گندھے ہوئے تھے۔ کسی شک و شبہ کے بغیر میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو ماسکو کے

محل کے ہال میں مجھ سے ملی تھی اور میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ میری حیرت اس قدر بڑھی کہ میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ لڑکی اور اُس کے نوکروں نے متعجب ہوکر میری طرف دیکھا۔

تصویر کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا "یہ کون ہے؟ یہی عورت تو مجھے یہاں لائی تھی۔"

لڑکی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اُس کے اوپر کے ہونٹ میں ذرا سا خم آگیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا، مگر مجھ کو بے چین دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔

اُس نے کہا "یہ میری ماں ہے بیس برس ہوئے جب میں پیدا ہوئی تھی تو وہ مرگئی تھی"

منصور احمد

ہاہمین

لمعات

دلِ خوں گشتہ کو وابستگی تھی لالہ زاروں سے
نواہائے محبت سُن رہا تھا آبشاروں سے

نمی اُن میں نہ دیکھی چشمِ بیمارِ محبت کی
لڑا کر دیکھ لی ہیں رات بھر آنکھیں ستاروں سے

مہ و خورشید نے اُس کا مرقع کھینچنا چاہا
نہ ظاہر ہوسکا وہ حُسن ان آئینہ کاروں سے

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جسے اُڑنا نہیں آتا
بحسرت دیکھتا ہوں جانبِ خورشید لالہ زاروں سے

شعاعِ مہر جوئے آب پر کیا کیا لرزتی ہے
درخشاں ہے ردائے آب کا دامن ستاروں سے

ح - ب

رازِ محبّت

میں نے کہا کہ اے چمنِ زندگی کے پھول ـــ تیرے بغیر خار ہے مجھ کو یہ گلستاں
کانٹا سا کیا یہ دل میں کھٹکتا ہے ہر گھڑی؟ ـــ دن رات کیوں ہے وردِ زباں "ہائے میری جاں"؟
آیا نہ کچھ سمجھ میں کہ کیا چیز عشق ہے؟ ـــ کس طرح شعلہ بار ہے یہ آتشِ نہاں؟
تاریکیاں بھی مجھ کو مسرّت کا نور ہوں ـــ گر تیرے دل میں میری محبت ہو ضو فشاں
شعلہ ہے آفتاب کا چشمک ہے برق کی ـــ الفت جو مجھ کو تجھ سے ہے اے میری جانِ جاں

سُن کر یہ داستاں مری مجھ سے کہا بہارؔ ـــ یہ رازِ سر بہ مُہر کسی پر نہ ہو عیاں
اُلفت تھی مجھ کو تم سے تمہیں مجھ سے عشق تھا ـــ حائل مگر ہمارا مقدّر تھا درمیاں
کردیں فلک نے زیست کی راہیں الگ الگ ـــ پھینکا تمہیں یہاں تو دھکیلا مجھے وہاں
تم مجھ کو بھول جاؤ یہ ممکن نہیں اگر ـــ میں تم کو بھول جاؤں نہ کرنا کبھی گماں
دونوں دلوں میں نورِ محبّت ہے جلوہ ریز ـــ اک دوسرے کی دید ہے دونوں کو لطفِ جاں
چارہ نہیں مگر کہ جو ہونا تھا ہو چکا ـــ چھایا ہوا ہماری زمین پر ہے آسماں
وہ کام تم کرو جو خدا نے تمہیں دیا ـــ بے کار ہیں یہ وہم و خیال و غمِ نہاں
کاوش ہے میرے جی کو بھی ہر دم وہی کروں ـــ جو مجھ سے چاہتا ہے مرا ربِّ دو جہاں
موتی کی آب و تاب ہے خوشبو ہے پھول کی ـــ الفت جو مجھ کو تم سے ہے اے میری جانِ جاں!
کرنا ہے آسماں کو جُدا اگر کیا کرے ـــ نزدیک تر کریں گی دلوں کو یہ دُوریاں

دل میں بہارؔ رازِ محبت چھپائے ہے
اے میری زندگی کی محبت کے رازداں

بہارؔ

ضرورت

"کسی کا قول ہے کہ خدا کسی کو تعلیم دلانا چاہتا ہے تو وہ اُسے مکتب میں نہیں بھیجتا بلکہ ضرورت کے حوالے کر دیتا ہے"

ضرورت جس کا دوسرا نام غربت ہے بعض مرتبہ انسان کی پوشیدہ طاقتوں کو نمایاں کرکے ترقی کا ایک ایسا دروازہ کھول دیتی ہے جو اُس کے لئے کبھی بند نہیں ہوتا۔ اِن پوشیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے "ضرورت" سب سے زیادہ مفید چیز ہے، آرام و راحت اور دولت و عشرت کو کسی مذہب نے ذریعۂ ترقی نہیں بنایا۔ متمول خاندان کے افراد اس قدر عیش پسند ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اُن سے تحریکِ عمل مفقود ہو جاتی ہے اور یہی اُن کے انحطاط کا وہ زمانہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس میں اپنے آپ کو سنبھال سکے تو خیر ورنہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

اگر "غربت" کے مسئلے پر ایک عمیق نظر ڈالی جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کا وجود، دنیا کے لئے کسی طرح ایک نعمت سے کم نہیں۔ اگر دنیا میں غربت و مصیبت کا وجود نہ ہوتا تو آج اُس کے مشہور فاتح، جانباز جرنیل، دولتمند تاجر اور بہادر جہازران جن کا تاریخ فخر کے ساتھ ذکر کرتی ہے پیدا نہ ہوئے ہوتے دنیا کے بڑے بڑے لوگ راحت و اطمینان کی آغوش سے محروم رہے ہیں۔ انہوں نے صرف تکلیف و غربت کے دامن میں پرورش پائی ہے۔ ملٹن سائیکل کے پہیوں، مائکل فریڈے ٹوٹی ہوئی بوتلوں اور پروفیسر بل ایک معمولی اپرنٹس کے تجربہ سے متمدن دنیا کا قابلِ فخر انسان بن گیا۔

امریکا میں سب سے زیادہ دلچسپ قصے اُن نوجوانوں کے ہیں جو باوجود افلاس و غربت کے میدانِ ترقی میں برابر آگے بڑھتے رہے اُن کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی دنیاوی زندگی کی ابتدا کی اور کس طرح زمانے کی پیہم مخالفتوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس سے بڑھ کر جاذبِ توجہ شاید اور کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا کہ باوجود مشکلات و موانعات کے ایک صمیم العزم انسان کس طرح بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھتا ہے۔ طوفانی مصائب اس کے پاؤں کو لغزش دینے کی بجائے مضبوط کرتے ہیں۔ وہ مشکلات کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کا دل قسمت کی مخالفتوں کی پروا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ زمانے کی یہ مخالفتیں عارضی ہیں۔ قسمت کی برائی امتحان تک ہے۔ اگر وہ استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا تو ایک دن یہی مخالفتیں اُس کے لئے عیش و عشرت کا دروازہ

کھول دیں گی۔

جن کے عزائم بلند اور خیالات پختہ ہوتے ہیں۔ تقدیر اُن کی ترقیوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ہر سال پختہ عزائم رکھنے والے انسان محض اپنی بلند حوصلگی کی بدولت اس قید و بند سے نکل کر ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو صرف تقدیر کے بھروسے پر اپنی قوتِ عمل کو بے کار و معطل کر دیتے ہیں وہ رفتہ رفتہ پستی کی اُس عمیق ترین گہرائی میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سوائے غربت و فلاکت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

جس چیز سے حیاتِ انسانی استوار ہوتی ہے اُس کی نشو و نما خود اُسی کے دل و دماغ میں ہوتی رہتی ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ تحریکِ عمل پیدا کرتی ہے اُس کا نام احساس ہے اسی سے انسان اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اُسی کے فقدان سے ذلت و پستی کے خوفناک غار میں گر جاتا ہے۔ اگر کسی انجن میں بھاپ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ پہیوں میں جنبش پیدا نہیں ہو سکتی اور کل پرزے بذات خود کسی انجن کو نہیں چلا سکتے۔ یہی طرح اگر انسان کے احساساتِ مدرکہ میں گرمی نہ ہو تو ارادوں میں پختگی اور مزاج میں استقلال پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی مشکل تمہارے مقصد سے زیادہ قوی اور تمہارے عزم سے زیادہ راسخ ہے تو یقیناً تم دنیا میں کبھی کامیاب باوقار اور باعزت نہیں ہو سکتے۔ اس لئے سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ آیا جو چیز تمہیں ترقی کی منزل سے روک رہی ہے وہ تم سے قوی ہے یا تم اس سے قوی ہو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری مشکلات تم سے قوی ہیں اور تم میں اُن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو بلاشبہ یہ تمہارے احساسات و عزائم کی کمزوری ہے لیکن اگر تم ان مشکلات و موانع کے باوجود اپنی قوت و جرات کا احساس رکھتے ہو اور تمہیں اس کا یقین ہے کہ تمہاری مشکلات تمہارے عزائم کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں تو تم بغیر کسی پس و پیش کے دنیا کی ہر تجارت اور ہر کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہو، پھر جس وقت تمہیں اپنی بلند حوصلگی کا یقین ہو جائے اسی وقت تم دنیا کی مخالفتوں کو ٹھکراتے ہوئے بلا انتظارِ مواقع اپنے کام کو پورے جوش کے ساتھ شروع کر دو، اس لئے کہ جس وقت تم میں بلند حوصلگی کا احساس پیدا ہوا تھا اسی وقت کامیابی نے تمہارے دروازے کھول دیئے تھے۔

بارہا تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے جو مشکلات ناقابلِ حل معلوم ہوتی ہیں وہ کام شروع کرنے کے بعد خود بخود راستے سے ہٹ گئیں اور کامیابی کے وہ ذرائع جن کا پہلے علم نہ تھا یکے بعد دیگرے سامنے آ گئے۔

وہ لوگ جو ہر کام کو خواہ مخواہ مشکل اور ناقابلِ فتح سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں انہیں کسی کام میں بھی کامیابی

فتح اور امید کی روشنی نظر نہیں آتی۔ وہ جس زمین کو دیکھتے ہیں اُسے یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ اس میں تخم ریزی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ جرات کرکے اپنے اس پس وپیش اور بے جا تامل کو چھوڑ دیں تو پھر بھی ٹھکرائی ہوئی زمین اُن کے لئے مفید و نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے۔ کاش ہر شخص یہ جان لیتا کہ تخم ریزی کے کیا طریقے ہیں اور کن ذرائع سے وہ زیادہ سے زیادہ نفع اپنے کھیتوں سے اُٹھا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بہت سے لوگ اب بھی دنیا میں ایسے موجود ہیں۔ جو تخم ریزی تو کر رہے ہیں لیکن اس سے بے خبر ہیں کہ اُسی زمین کو الٹ پھیر کے جوتنے سے کس قدر کثیر نفع ہوسکتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے وطن میں کاروبار کرنے کے باوجود دوسرے دور دراز ملکوں میں تجارت کرنے کے دوراز کار خیالات میں مبتلا رہتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب اپنے ہی شہر میں جہاں ہر طرح کے ذرائع انہیں حاصل ہیں۔ وہ اپنی تجارت کو فروغ نہ دے سکے تو غیر ملکوں اور شہروں میں ایک اجنبی کی حیثیت سے کیا ترقی کرسکتے ہیں۔ تقدیر آزمائی کے لئے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جانے کی ضرورت نہیں خود تمہارے ہی شہر میں ترقی کے تمام ممکن سے ممکن ذرائع موجود ہیں۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُن شہروں میں جہاں لوگ اپنی بیکاری و بے روزگاری کی شکایت کیا کرتے ہیں کچھ ایسے اولوالعزم انسان بھی پیدا ہوجاتے ہیں جو ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہنچ کر یہ ثابت کردیتے ہیں کہ وسائل بشرطیکہ تحریک عمل سلب نہ ہوئی ہو ہر جگہ موجود ہیں۔

گورنر جانسن اپنی تقدیر آزمائی کے لئے سینٹ پیٹر سے کہیں باہر نہیں گیا۔ وہ چند مہینوں کو مستثنیٰ کرکے تمام عمر علم سے بے بہرہ رہا۔ فرڈ نگلس اپنی غلامانہ کاشتکاری کے زمانے میں بھی آفتاب اقبال کو تلاش کرتا رہا۔ گارفیلڈ نے راہ گیری اور لنکن نے ایک تنگ و تاریک زاویہ میں بیٹھ کر تقدیر کے گوہر کو پالیا۔

دنیا میں کسی انسان کی ناکامی و نامرادی کی اگر کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے "مواقع" اور ترقی کے وسائل کو عام سطح سے گزر کر عظیم الشان بلندی اور انتہائی رفعت پر تلاش کرتے ہیں وہ اس قدر بلند ہوجاتے ہیں کہ انہیں سطح عام کی چیز دکھائی نہیں دیتی اور بعض ایسے مواقع اُن کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں جن سے اگر فائدہ اٹھایا جاتا تو یقیناً وہ کامیاب ہوجاتے۔

ثاقب کانپوری

عرضی نویس (بڑبڑاتے ہوئے) "لو بابا۔ چل کر وہاں بیٹھو اور آواز کا خیال رکھو"

بڈھا (جاتا ہوا) "بابو جی کہیں چلے نہ جانا۔ ابھی آواز پڑے گی"

ہم "معمولی بات ہے۔ ہم یہیں ہیں"

بڈھے کے جا چکنے کے بعد عرضی نویس پھر ہماری جانب آیا اور کہنے لگا "لیجئے صاحب مبارک ہو یہ آپ کا پہلا محنتانہ ہے" یہ کہہ کر اُس نے تین روپے ہمیں دیئے اور تھوڑی سی دیر کے بعد پھر بولا "میرا حق دلوا دیجئے۔ آپ کا پہلا مقدمہ ہے اس لئے مجھے اچھے پیسے ملنے چاہئیں" ہم نے ایک روپیہ دیا مگر وہ نہ مانا۔ خیر پندرہ بیس منٹ کی بحث کے بعد اُسے ڈیڑھ روپے پر راضی کیا۔ اس کے بعد ہم پھر اپنی ڈائری کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے "مطالعہ" کے دوران میں خیال آیا کہ پہلے مقدمے کے پیسے تو درج کرلیں۔ ۲۰ تاریخ کا صفحہ نکالا اور اُس پر موٹے حرفوں میں لکھا:۔

"پہلا دن۔ پہلا مقدمہ۔ پہلا کام۔ یعنی پہلی دفعہ کچہری . . . . مبلغ ڈیڑھ روپیہ"

یہ لکھ کر ڈائری کو جیب میں رکھ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چھڑی گھماتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے جی میں خوش تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی مقدمہ مل گیا ہے لوگ غلط کہتے ہیں کہ "پروفیشن" کا برا حال ہے اور وکیل دو دو آنے لے کر پیش ہو جاتے ہیں خدا نے ہمیں پہلے دن ہی تین روپے کا کام دلوا دیا ہے"۔

تھوڑی دیر میں خیال آیا کہ چلو "بار روم" میں چل کر اپنی آمد کی خوشخبری سنائیں لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہاں پہنچے۔ برآمدے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے اندر سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں ہم نے حوصلہ کر کے چک اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ایک پاؤں دروازے کے اندر رکھا ساتھ ہی خیال آیا کہ سگار بجھ چکا ہے ہم نے وہیں کھڑے کھڑے یعنی ایک پاؤں دہلیز کے اس طرف اور دوسرا اُس طرف رکھے اور چک کو کندھے پر اُٹھائے ہوئے جیب سے دیا سلائی نکالی اور لگے سگار سلگانے۔ سگار کا سلگنا تھا کہ زبردست کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور ہماری بے ڈھب کھانسی کی سقف شگاف آواز نے ایڈووکیٹوں اور پلیڈروں وغیرہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنی باتیں چھوڑ کر ہماری طرف توجہ کریں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک دو شریف آدمی اُٹھ کر ہماری طرف آئے ہم نے کھانستے ہوئے کہا "آج ہم پہلی دفعہ کچہری آئے ہیں معمولی بات ہے" اس پر اُن میں سے ایک بولا "کیوں صاحب آپ کا کوئی مقدمہ ہے؟" ہم نے اپنا دوسرا پاؤں دہلیز کے اندر رکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں" یہ سنتے ہی اور بہت سے اشخاص ہمارے پاس آ گئے اور اس طرح سے سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگے۔

"آپ کا کیا مقدمہ ہے"؟ "آپ کی تاریخ کب ہے"؟ "آپ کے کاغذات کہاں ہیں"؟ "آپ کا مقدمہ کونسی عدالت میں ہے"؟ "تشریف رکھئے" "منشی اِسے او منشی کرسی لاؤ" "آئیے بیٹھئے" وغیرہ وغیرہ - اتنے میں ایک شخص جو چپڑاسی معلوم ہوتا تھا کرسی لے آیا اور ہمیں دروازے کے قریب ہی بٹھا دیا گیا - اور وہ سب لوگ ہمارے اردگرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے - ہم جی میں خوش ہو رہے تھے کہ پہلی دفعہ آنے پر ہی اتنی آؤ بھگت ہو رہی ہے اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی ہم نے نکٹائی کی گرہ کو ٹٹولا اور سگار منہ میں رکھ کر ذرا رعب کے ساتھ مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا - چند مختلف قسموں کے دیگر سوالات کے بعد ایک صاحب پوچھنے لگے "کیوں صاحب آپ نے اپنے مقدمہ کے لئے کوئی وکیل بھی مقرر کیا ہے"؟ اس پر ہمیں غصہ آیا اور جی میں یہ خیال کر کے کہ پہلی دفعہ آنے پر بھی ان کو اتنا پتہ نہیں کہ ہم بذاتِ خود ایک معزز وکیل ہیں ہم نے گلا پھاڑ کر جواب دیا "ہم خود وکیل ہیں ہمارا مقدمہ نہیں بلکہ ہمارے پاس کسی کا مقدمہ ہے اور ہم آج پہلی دفعہ کچہری آنے پر پیش ہو رہے ہیں" یہ سن کر اُن لوگوں نے ہمیں یوں دیکھنا شروع کیا جیسے ہم کوئی معمولی درجے کے نہایت کم مایہ آدمی ہیں اُن لوگوں میں سے ایک بولا "اچھا! تو آپ بھی وکیل ہیں؟ خوب" ہم نے سگار کو منہ سے نکال کر جواب دیا "ہاں" - یہ سن کر سب لوگ ہمیں چھوڑ کر اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے اور ہم کچھ دیر تک وہیں یعنی دروازے کے پاس ہی کرسی پر پڑے رہے -

تھوڑی سی دیر کے بعد ایک خوش وضع نوجوان کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "یہ ایک نئے وکیل صاحب تشریف لائے ہیں اور میں آپ سے اُن کا تعارف کراتا ہوں" اس پر آوازیں آئیں "آپ کا نام"؟ "آپ کا اسم گرامی" وغیرہ وغیرہ اس کے بعد اُس شخص نے جو ہمیں بعد میں معلوم ہوا بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری تھا، ہمارا تعارف ہر ایک سے کرایا - ہم نے ہر ایک سے ہاتھ ملایا اور تعارف سے فارغ ہو کر پھر کرسی پر آ بیٹھے - سکرٹری صاحب نے ہمارا نام ایک رجسٹر میں درج کر لیا اور رجسٹر ہمارے پاس لے آئے - صفحے کے اوپر ہی موٹے الفاظ میں لکھا تھا "جون ۲۲ء چندہ ماہواری ایک روپیہ" سکرٹری صاحب کہنے لگے "دو روپے فیس داخلہ اور ایک روپیہ چندہ دے کر مشکور فرمائیے" ہماری جیب میں اس وقت وہی ڈیڑھ روپیہ یعنی ہمارے پہلی مرتبہ کچہری آنے پر ہمارے پہلے مقدمے کی پہلی فیس کی رقم تھی ہم نے جھٹ ہاتھ جیب میں ڈالا جیب میں سے صرف ایک روپیہ نکلا ہم نے باقی تمام جیبیں ٹٹولیں مگر کچھ نہ نکلا ہم نے حیران ہو کر کہا "لاحول ولا قوۃ - ہماری اٹھنی کہاں گئی! ساتھ ہی خیال آیا کہ عرضی نویس نے اٹھنی واپس نہیں دی یعنی اُس سے نصف نصف کا فیصلہ ہوا تھا اور ہم نے اُسے دو روپے دیئے تھے مگر اُس کمبخت نے اٹھنی واپس ہی نہیں دی - بہت غصہ آیا - خیر - ہم نے وہ ایک روپیہ ہی سکرٹری صاحب کی نذر کیا اور کہا کہ باقی رقم یعنی دو روپے ہم کل دیں گے - انہوں نے روپیہ تو جیب میں رکھ لیا اور رجسٹر

میں وصولی کے اندراج کے لئے ہم سے ہمارا قلم مانگا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے اپنا سنہری پارکر پن جیب سے نکال کر اُنہیں دیا۔ اُنہوں نے ہمارے نام کے آگے لکھ دیا "وصول ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روپیہ" اور اِس کے بعد وہ کچھ اور لکھنے میں مشغول ہوگئے اور ہم باقی لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ کسی نے پوچھا "آپ کا وطن"؟ کوئی کہنے لگا "آپ نے کس سال سند حاصل کی"؟ کسی نے دریافت کیا "آپ نے اب تک کیوں پریکٹس شروع نہیں کی تھی"؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم ہر ایک کو باری باری سے مناسب جواب دیتے رہے۔ ہم اِن باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے کی چک اُٹھی اور وہی بڈھا ہمارے پہلے مقدمے والا ہمارا پہلا موکل ہانپتا کانپتا داخل ہؤا اور چھوٹتے ہی کہنے لگا۔ "بابو جی جلد آئیے۔ مقدمہ پیش ہوگیا" ہم کھڑے ہوگئے اور بار روم سے نکل آئے اور ہم نے اُس سے پوچھا "کس عدالت میں"؟ بڈھے نے جواب دیا "منصف صاحب کی عدالت میں" ہم جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے سب جج کے کمرے کی طرف چلے جی میں خوش تھے کہ ہم اِس وقت واقعی اپنا پہلا مقدمہ بھگتنے جا رہے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر ذرا رُکے، ٹوپی کو ٹیڑھا کر کے سر پر رکھا، کوٹ کا دوسرا بٹن بند کیا، نکٹائی کو ٹٹولتے ہوئے چک اُٹھائی اور اندر داخل ہوئے۔

سب جج صاحب ایک بہت بڑی میز پر بیٹھے کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ دو تین شخص میز کے اس طرف کھڑے تھے جن میں سے ایک پنسل کاغذ ہاتھ میں لئے کبھی اِدھر کبھی اُدھر بغور دیکھتا تھا۔ ہم فوراً تاڑ گئے کہ یہ شخص فریق ثانی کا وکیل ہے۔ خیر ہم بھی وہیں جا کھڑے ہوئے۔ جج صاحب نے کاغذات سے نظر اُٹھا کر کہا "مدعی آ گیا"؟ ہمارے بڈھے نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "ہاں حضور" جج صاحب کی نظر ہم پر پڑی پوچھنے لگے "آپ مدعی کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں"؟ ہم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں"

جج صاحب۔ (دوسرے وکیل سے) "کیوں صاحب ڈگری کیوں منسوخ کی جائے"؟

وکیل۔ "صاحب عرض یہ ہے کہ میرے موکل کو آج تک دعوے کی اطلاع ہی نہیں ہوئی یعنی سمن وغیرہ بھی اُسے نہیں پہنچے"۔

جج صاحب (ہم سے) "کیوں صاحب آپ کیا کہتے ہیں"؟

ہمیں چونکہ کہنا ہی کچھ نہ تھا اس لئے ہم خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب آپ کیا کہتے ہیں انہیں اطلاع ہوئی تھی یا نہیں؟" ہم بدستور خاموش کھڑے رہے۔

جج صاحب "بولئے کچھ تو فرمائیے"

ہم پھر چپ سادھے رہے۔ جی میں سوچ رہے تھے کہ "ہاں" کہیں یا "نہیں" کیونکہ ہمیں تو کچھ علم ہی نہ تھا۔

اس کے بعد جج صاحب نے ایک کاغذ اٹھایا اور اُس پر سے کچھ پڑھ کر دوسرے وکیل سے کہا "یہ دیکھیے اطلاع تو باقاعدہ ہو چکی ہے۔ یہ رپورٹ ملاحظہ کیجئے"!

وکیل - التماس یہ ہے جناب کہ اطلاع بالکل نہیں ہوئی آپ ان لوگوں کی چالاکیوں سے بخوبی واقف ہیں پیسے دے دلوا کر لکھوا لیا کرتے ہیں"

جج صاحب - (ہم سے) آپ کیا کہتے ہیں؟"

ہم (دبی آواز میں) "کچھ نہیں"

جج صاحب "ڈگری کتنے کی ہے"؟

دوسرا وکیل "صاحب چالیس روپے کی"

جج صاحب (کاغذ پر لکھتے ہوئے) اچھا ڈگری بر طرف۔ تاریخ ۱۲۔ اگست"

یہ سُن کر سب لوگ عدالت کے کمرے سے نکل آئے ہم کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے کہ جائیں یا وہیں رہیں ہمارا بڈھا بھی چل دیا تھا۔ خیر کچھ دیر کے بعد ہم بھی باہر نکل آئے۔ باہر آکر دیکھا تو بڈھا عرضی نویس سے جھگڑا کر رہا تھا" اچھا وکیل بنایا تھا تو نے۔ اُس کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ ڈگری بھی گئی"۔ عرضی نویس ہمارے قریب آیا اور کہنے لگا "آپ تو کچھ بولے ہی نہیں میں بھی وہیں ایک کونے میں کھڑا سن رہا تھا"، ہم نے کہا "کوئی ڈر نہیں کیا ہوا" اتنے میں دوسرا وکیل بھی آپہنچا اور پاس سے گزرتا ہوا کہتے لگا "آپ تو بولتے ہی نہیں کچھ۔ کام کرنے آئے ہیں یا تماشا دیکھنے"! یہ سُن کر ہمیں سخت غصہ آیا اور ہم نے لال پیلے ہو کر جواب دیا "چپ رہو جی تمہیں کیا"؟ اس پر بڈھا عرضی نویس اور وکیل سب کے سب چل دیئے اور ہم وہیں کھڑے رہے۔ جب ذرا غصہ فرو ہوا تو سوچا کہ واقعی غلطی ہوئی کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئے تھا۔ وکالت میں بولنے ہی کا تو کام ہے خیر ہم جی ہی جی میں افسوس کرتے رہے۔ اور کچھ دیر کے بعد "بار روم" کا راستہ لیا۔ داخل ہوئے تو دوسرا وکیل پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ہمارے داخل ہونے پر ادھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں "آیئے آیئے۔ سنا ہے آپ خوب بولتے ہیں"۔ "صاحب کہتے ہیں کہ آپ بحث خوب کرتے ہیں"۔ "فرمایئے مقدمہ جیت لیا"؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ فقرے سُن کر ہمارے غصے کا پارہ ایک سو بیس ڈگری پر پہنچ گیا۔ چاہا کہ اُس دوسرے وکیل کے کلے پر ایک گھونسا رسید کریں مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ ہم اکیلے ہیں اور وہ لوگ چالیس پچاس۔ جی میں سوچا کاش یہ لوگ لاہور میں ہوتے تو ذرا . . . .

غرض کہ ہم وہیں کھڑے کھڑے غصے سے کانپا کیئے اور جی ہی جی میں اپنے حریف کو۔ بار کے ممبروں کو۔ اپنے پہلے مقدمے کو۔ بڈھے کو۔ اور وکالت کے پیشے کو گالیاں دیتے رہے۔ ہم اپنی پوشیدہ گالیوں میں مشغول تھے کہ ایک شخص ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا "آئیے آئیے تشریف رکھئے شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے" ہم نے ذرا درشتی سے جواب دیا "نہیں صاحب معاف فرمائیے۔ ہم اب گھر جاکر ہی آرام کریں گے" یہ کہہ کر ہم بار روم سے نکل آئے اور سیدھا گھر کا راستہ لیا۔ واپسی میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھا۔ سڑک کے ایک کنارے چلتے رہے یہاں تک کہ نکٹائی کی گرہ کی بھی خبر نہ لی۔ جب گھر کے قریب پہنچے تو خیال آیا کہ چھڑی کہیں کچہری میں یا بار روم میں رہ گئی ہے۔ نہایت افسوس ہوا۔ خیر۔ گھر کے اندر داخل ہوئے اور سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے۔ کوٹ اتار کر رکھنے لگے تو اوپر کے جیب پر نظر جا پڑی۔ سنہری پارکر پن غائب تھا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد خیال آیا کہ بار ایسوسی ایشن کے سکرٹری نے رجسٹر میں ہمارا نام وغیرہ درج کرنے کے لئے لیا تھا اور اُس بدمعاش نے واپس نہیں دیا۔ اِس نقصان پر اور زیادہ غصہ آیا۔ کوٹ کو میز پر پھینک چارپائی پر دراز ہو گئے۔ اور جی ہی جی میں اپنے پہلے مقدمے کے واقعات کو دہرانے لگے۔

ہمارے پہلے مقدمے کی خاص باتیں جو اس روز پیش آئیں یہ تھیں۔

(۱) مقدمہ کی فیس تین روپے جن میں سے دو روپے عرضی نویس ہضم کر گیا اور باقی ایک روپیہ بار روم کی نذر ہوا۔

(۲) ہماری چاندی کے دستے والی چھڑی کہیں رہ گئی۔

(۳) پارکر پن یعنی سونے کے نب اور سونے کے کلپ والا قلم بار ایسوسی ایشن کا سکرٹری کھا گیا۔

لطیف الرحمٰن

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح اور موت کو خزاں کے پتوں کی طرح خوبصورت بناؤ۔

یہ ظلمت کا نظر نہ آنے والا شعلہ کیا ہے جس کی چنگاریاں آسمان کے ستارے ہیں۔

یہ دنیا وحشی طوفانوں کی دنیا ہے جسے حسن کی موسیقی نے رام کر رکھا ہے۔

ٹیگور

محفلِ ادب

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
من مندر میں پریت بسا لے   چھوڑ دے مسجد اور شوالے
دل کی دنیا کر لے روشن   اپنے گھر میں جوت جگا لے
پریت ہے تیری ریت پرانی   بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

اپنے من میں پریت
بسا لے
اپنے من میں پریت
بھارت ماتا ہے دکھیاری   دکھیارے ہیں سب نر ناری
تو ہی اٹھا لے سندر مرلی   تو ہی بن جا شام مراری
تو جاگے تو دنیا جاگے   جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
جاگ اٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا   چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن   ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہرداروں کی سنگت میں   کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسا لے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے   دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا   تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا   من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

نمی ارزد بجنّتِ باغِ گیتی روضۂ رضواں | نمی خواہم بہشتے دیگر اندر عالمے دیگر
تو بہرِ امتحانے دیگرے پیدا کن ابلیسے | کہ شاید از دگر خلدے بر آید آدمے دیگر
بہ مہرآں حسنِ کامل چوں مشعبد می کند بازی | دمے پیدا کند اما کند پنہاں دمے دیگر

ازیں پستی بہ آں رفعت نگاہم بردہ خاکم را
کہ من در عالمے و سایہ ام بر عالمے دیگر

حامد علی خاں "انقلاب"

زندگی ہنوز ایک راز ہے

چکاگو یونیورسٹی نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کو اُس کے سولہ پروفیسروں نے مل کر تصنیف کیا ہے اور جس میں علوم وفنون کی ترقیوں کی تفصیل کی ہے، اس کتاب میں ایک فقرہ یہ ہے "ہم پر فرض ہے کہ ہم نہایت صراحت کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ زندگی کا اصلی راز اب تک لاینحل ہے اس کے حل کرنے کے لئے بہتر سے بہتر جو طریقہ ہمارے پاس ہے وہ ہنوز ابتدائی مفروضات ہیں، زندگی کی ابتدا اور آغاز کی حقیقت کی گرہ اب تک ناخنِ عقل سے کھل نہیں سکی ہے اور جمادات اور زندہ مخلوقات کے درمیان جو ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی وہ اب تک اسی طرح ہے"۔

"معارف"

لفظِ ڈاکٹر

آج کل ڈاکٹر کا لقب، متعدد علوم وفنون کے ماہروں کو دیا جاتا ہے، مگر اس لفظ کے ابتدائی معنی اس قدر عام نہیں ہیں، ڈاکٹر لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے اصلی معنی معلم اور استاد کے ہیں، قرونِ وسطیٰ میں یہ لقب دینیات اور منطق کے معلموں کے لئے مخصوص تھا، جو اس زمانہ میں لاطینی زبان میں ان دونوں علموں کی تعلیم دیا کرتے تھے اور پھر جب لاطینی زبان میں طب کی بھی تعلیم شروع ہوئی تو طبیبوں کو بھی ڈاکٹر کہنے لگے، قانون کے کامیاب علما کو ڈاکٹر کا لقب سب سے پہلے ۱۱۳۰ء میں بولونی فرانس میں دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہاں تک وسعت اختیار کی کہ اب فلسفہ، زبان، تاریخ، موسیقی، اور دوسرے علمی شعبے کے ماہروں کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا۔

"معارف"

تبصرہ

رسائل

"تعلیم و تربیت"۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کا سہ ماہی رسالہ ہے جو ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب پی، ایچ ڈی، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم ۔ اے پی ایچ ڈی اور خواجہ غلام السیدین صاحب بی۔ اے، ایم ای ڈی ایسے ماہرین تعلیم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ ہندوستان تعلیم کے معاملہ میں دنیا کے مہذب ممالک سے ابھی بہت پیچھے ہے اور اس قسم کی کوئی باقاعدہ اور منظم تحریک بھی موجود نہیں جو ہماری قوم کو تعلیمی ضروریات اور اصلاحات سے روشناس کرتی رہے، دنیا کے تازہ ترین تعلیمی تجربات سے آگاہ کرے اور دوسری قوموں کے بار آور تعلیمی انقلابات سے ہر وقت ہم کو باخبر رکھے۔ یہ رسالہ انہیں کمیوں کو پورا کرنے کے لئے بعض دور بین اور ترقی پسند اصحاب نے جاری کیا ہے، چنانچہ موجودہ پرچہ میں "صنعتی تعلیم"، "جامعات اسکاٹستان" اور "ایک مدرسۂ جدیدہ جلجیم میں" وہ مضامین ہیں جن سے ان مقاصد کی تکمیل بوجہ احسن ہو رہی ہے۔ باقی تمام مضامین بھی نہایت بلند پایہ ہیں۔ جو اصحاب ملک کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے ہوں اور تعلیم و تربیت کی تحریکات جدیدہ سے واقف رہنا چاہتے ہوں انہیں یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہیئے حجم ڈیڑھ سو صفحے سے زیادہ اور قیمت پانچ روپے سالانہ ہے کاغذ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔

"مخزن" کا سالگرہ نمبر" مخزن" ایک ایسا رسالہ ہے جس نے دور حاضر کی عامیانہ روش سے انحراف کرتے ہوئے ملک کے سامنے مفید اور متین ادبیات پیش کرنے کے لئے اپنی کوششیں وقف کر دی ہیں حضرت حفیظ جن کے ہاتھ میں اس رسالے کی عنان ادارت ہے نہایت سلیم مذاق رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے سالگرہ نمبر کو ہر پہلو سے قابل تعریف بنایا ہے اُن کی کہانی" افسانہ در افسانہ" اور اُن کی نظم "تربیت کا گیت" اس نمبر کے بہترین مضامین ہیں حفیظ کی تحریر میں جھوٹی شان و شوکت نہیں اور نہ اُن کے تخیل میں دور از کار بلند پروازی ہے۔ اُن کا افسانہ ہماری تہذیب اور تمدن کا صحیح صحیح نقشہ ہے۔ اور اس پر اُن کی ٹھیٹ اور سلیس زبان نے اُسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ پرچے کا حجم ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہے اور قیمت چودہ آنے (۱۴؍) منیجر "مخزن" بھاٹی گیٹ لاہور سے طلب فرمائیے۔

"طور" لاہور سے اس نام کے ایک نئے علمی و ادبی مصور رسالے کا اجرا ہوا ہے۔ جلال الدین صاحب اکبر جن کا کلام اکثر ہمایوں میں شائع ہوتا رہتا ہے اِس کے ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ کو کارآمد اور دیدہ زیب بنانے میں انہوں نے کافی محنت کی ہے اور اُس کے لئے مشہور ادیبوں سے مضامین حاصل کئے ہیں۔ رسالے کی اُٹھان شاندار ہے اور ہمیں امید ہے کہ

یہ خوب ترقی کرے گا۔ اپنے ناظرین سے ہم سفارش کرتے ہیں۔ کہ وہ بھی "طور" کی سیر کریں۔ "طور" ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: مینیجر رسالۂ طور شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

"پیمانہ" مولانا سیماب اکبرآبادی اور جناب ساغر نظامی نے اس رسالے کو تیسری مرتبہ دار السلطنت دہلی سے جاری کیا ہے۔ ساغر و سیماب کے احباب اُن کے طرزِ تحریر اور اُن کی ادبی قابلیتوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے ہمیں یہاں اُن کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پیمانہ اپنی تمام قدیم خصوصیات لئے ہوئے تیسری مرتبہ دور میں آیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ میکشانِ ادب اس کا پُر جوش خیر مقدم کریں گے۔ رسالہ مصور ہے حجم ۴۰ صفحے ہے سالانہ قیمت للعہ ر علاوہ محصول ملنے کا پتہ دار التصنیف دہلی۔

تصاویر

یورپ کے بہترین مصوّروں کے شاہکار۔ پچیس کارڈوں کا ایک خوبصورت اور نفیس مجموعہ ہے جن پر اعلیٰ درجہ کے رنگ و روغن سے یورپ کے اُن مصوروں کی حُسن کاری کے منتخب شاہکار جمع کئے گئے ہیں۔ جو اقلیم فن میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ رنگوں کی نمائش شگفتہ اور دل کش ہے۔ اور کارڈوں کے کنارے سنہری ہیں بعض تصاویر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً دولت کا تعاقب۔ محوِ دریا۔ محبت کا دروازے کے باہر۔ طوفان۔ رومیو اور جولیا۔ اقلیمِ خداوندی کا سفر۔ حرم کا نیا چراغ۔ جھولا۔ دریافتِ موسیٰ علیہ السلام۔ سحرِ موسیقی۔ روتہ اور ناومی۔ ماں اور بچہ۔ رفعِ نقاب اور اندھا بھکاری۔ **دولت کا تعاقب** اتنی وسیع المعنی تصویر ہے کہ اُس کو دیکھ کر مصور کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے۔ دولت کی دیوی ایک پانی کے بلبلے پر سوار اُڑی چلی جا رہی ہے اس کے پیچھے ایک کم عرض پل پر جس کے نیچے زور شور سے ایک دریا بہہ رہا ہے دو سوار اس دیوی کے تعاقب میں اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے ہیں۔ سواروں میں سے ایک غالباً ناکامی اور نامرادی کا بھوت ہے جو دولت کے تمنائی کو روک رہا ہے مگر وہ ہر خطرے سے بے پروا ہو کر چلا جاتا ہے اُس کے گھوڑے کے پاؤں تلے ایک نازنین کچلی جا رہی ہے جس کا شاید یہ مطلب ہے کہ وہ دولت کے حصول کے لئے دنیا پر ہر ظلم و ستم توڑنے کے لئے تیار ہے **محوِ دریا** میں دکھایا گیا ہے کہ غروبِ آفتاب کے وقت ایک لڑکی سمندر کے کنارے پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کی موجوں کے زیر و بم میں محو ہے۔ اس تصویر کی خوبی یہ ہے کہ اس کی ہر چیز حیرت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ **محبت دروازے کے باہر** ایک ایسی تصویر ہے جس سے محبت کی مجبوریاں ٹپک رہی ہیں۔ اسی طرح تمام تصویریں نہایت بلیغ اور پُر معنی ہیں۔ البتہ دو تین تصاویر میں عریانی بھی موجود ہے گو باعتبارِ فن ہم اُن میں بھی کوئی نقص نہیں پاتے۔ مجموعہ کی قیمت للعہ روپے ہے۔ ایس احمد اینڈ کمپنی بوسٹ بکس ۲۵۴۱ سے منگائیے۔

دارالاشاعت پنجاب لاہور

لڑکوں کے لئے کتابیں

وہ تصانیف جو اخبار پھول کے سلسلے میں چھپکر بے انتہا مقبول ہوئی ہیں۔ اور جو لڑکوں کو مطالعہ کا شوقین بنا دیتی ہیں

ہندوستان ہمارا

از ابوالاثر حفیظ جالندھری ہندوستان کی تاریخ جس طریق سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے نہ وہ بچوں کو دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اردو کے نامور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بچوں کے لئے دلفریب اور سبق آموز بنانے کو پہلی مرتبہ تاریخ ہند کی مشہور کہانیاں آسان اور بہت موثر انداز میں نظم میں لکھی ہیں۔ اس کتاب میں رامائن۔ مہابھارت۔ سری کرشن مہاراج۔ گوتم بدھ۔ سکندر۔ پٹھان اور مغل بادشاہوں۔ سکھوں اور انگریزوں کے حالات پر بیحد روانی اور قادر الکلامی سے نظمیں لکھی گئی ہیں جس سے ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم واقعات آنکھوں کے سامنے گزر جاتے ہیں۔ اور ان تمام قوموں کی عظمت اور شوکت کا نقشہ نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ جو مختلف زمانوں میں ہندوستان پر حکومت کر چکی ہیں مصنف نے ایسی تمام باتوں کو نظرانداز کر دیا ہے۔ جنکا کسی جماعت یا فرقے کو ناگوار گذرنے کا ڈر تھا۔ اور ہر مضمون پر خود موثر ہو کر نظم لکھی ہے۔ کتاب میں ستّر کے قریب نظمیں ہیں۔ اور شروع میں علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب آئی سی۔ ایس۔ پرنسپل اسلامیہ کالج کا دیباچہ ہے۔ کتابت۔ کاغذ۔ طباعت نہایت اعلےٰ۔ چودہ رنگین بلاک کی تصویریں۔ نہایت خوبصورت جلد اور سرورق۔ تحفے کے طور پر دینے کے قابل کتاب۔ قیمت ۱عہ

عمر عیّار۔ داستان امیر حمزہ میں سے عمر عیار کے دلچسپ اور پرمذاق کارناموں کا لڑکوں کے لئے انتخاب حصہ اوّل عہ حصہ دوم عہ

زلفی۔ ایک لڑکے کی داستان جو بھیڑیوں میں پلا تھا۔ حیرت انگیز انداز بیان۔ قیمت ..... حصہ اوّل ۶ر حصہ دوم ۹ر

بن باسی رستم۔ رڈیرڈ کپلنگ کی مشہور کہانی رکی ٹکی ٹیوی۔ ہندوستانی لڑکوں کے لئے۔ قیمت ۴ر

گدگدی۔ بیحد دلچسپ اور ہنسانے والی کہانیاں اور نئے اور نہایت عمدہ لطیفے۔ روتوں کو ہنسانیوالی کتاب حصہ اول ۸ر دوم ۱۰ر

پرستان۔ پریوں کی بے انتہا دلچسپ اور پرلطف کہانیوں کا دلفریب مجموعہ۔ قیمت ..... حصہ اول ۷ر حصہ دوم ۵ر

پھولوں کی کلیاں۔ لڑکوں کیلئے سیّد امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے۔ کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ۔ حصہ اول ۷ر دوم ۹ر

الف لیلہ کی کہانیاں۔ لڑکوں کے لئے پھر لکھی گئی ہیں + علی بابا چالیس چور ۵ر۔ تین بہنوں کی کہانی ۵ر ابوالحسن ۶ر سندباد جہازی ۱۰ر۔ ماہی گیر کی کہانی ۵ر۔ سوداگر کی کہانی ۵ر۔ بدر بادشاہ اور جواہر شہزادی۔ قیمت ۱۰ر

پچیس کتابوں کا سٹ۔ گیارہ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کیلئے اور کم قیمت کی۔ مفصل حال فہرست میں دیکھئے۔ چند یہ ہیں:

شہزادہ عزیز ۵ر بادری کا دلچسپ قصہ ۳ر سنہری پری ۳ر صابر شہزادی ۴ر بھول بھلیاں ۵ر جورومار راجہ ۳ر دو بھائی ۶ر

دارالاشاعت پنجاب۔ ۱۹۵۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

جلد — فہرستِ مضامین — نمبر ۵

بابت ماہِ مئی ۱۹۲۸ء

تصویر:- امّاں کیا اچھّی ہے دنیا میں حیران ہوں امّاں

جہاں نما

ترک اور اسلام

رپوٹر نے خبر دی تھی کہ عنقریب ٹرکی میں مذہب کو سلطنت سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ "جماعتِ خلق" نے متفقہ طور پر عصمت پاشا کی اس تحریک کو ایک سو بیس مندوبین کی حمایت سے منظور کر لیا ہے کہ مذہب کے متعلق سلطنت کے تمام قوانین، آئینِ ترکی میں سے حذف کر دیئے جائیں۔ اب مجلسِ ملیہ میں اس تحریک کی منظوری محض ایک رسمی بات رہ گئی ہے۔ اِس ترمیم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آئندہ سلطنت کا مذہب اسلام نہ رہے گا اور جمہوریہ کے صدر اور ارکان خدا کے نام پر نہیں بلکہ اپنی عزت کے نام پر قسم اٹھایا کریں گے۔

اس کے بعد قسطنطنیہ کے اخبار "وقت" سے اس کی تصدیق یوں ہوئی:۔

"حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر افراد کا مذہب ہوتا ہے ہر حکومت کا مذہب قانون ہے جس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس دنیائے آب وگل میں امن امان قائم رکھے اور اُس کا اُن توہمات اور اُن مذاہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو افراد کے عقائد میں داخل ہوتے ہیں جب تک کہ وہ توہمات اور عقائد لوگوں کی آزادی اور حقوق میں حارج نہ ہوں اس لئے ترکی حکومت کو سوائے ملک کے قانون کے اور کوئی مذہب اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حکومتِ ترکی کے ارکان یا دوسرے ترک خود کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ وہ آزادی کے ساتھ کسی ایک مذہب کے پیرو ہو سکتے ہیں حکومت کو اس سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔ پچھلے زمانے میں جب حالات اب سے مختلف تھے ملک پر کسی ایک مذہب کے عقائد کے مطابق حکومت کرنا ممکن تھا مگر اب وقت بدل چکا ہے اور ہر ملک آفاقی عقائد کا پیرو بن چکا ہے۔ اس لئے اگر اب کوئی سلطنت لوگوں پر کسی خاص مذہب کی مقدس کتابوں کی رو سے حکومت کرنے کی کوشش کرے گی تو اُسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا علاوہ ازیں اس سے جمہوریت کے مفہوم کی نفی ہوتی ہے جسے لازم ہے کہ ہر شہری کو بلا لحاظِ مذہب مساوی حقوق دے"۔

یہ غلط ہے کہ مذہب افراد کا ہوتا ہے اور سلطنت مذہب سے بالاتر ہوتی ہے۔ سلطنت کا بھی مذہب ہوتا ہے بلکہ مذہب ہی کی سلطنت ہوتی ہے۔ آج تک دنیا میں جتنے مذاہب آئے سب سلطنت لے کر آئے اُن کے عدل والنصاف یگانۂ روزگار تسلیم کیا گیا اور اُن کی حریت و مساوات بے مثال سمجھی گئی۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ترکوں کو قانون

اسلام جس نے اپنے عدل و انصاف اور حریت و مساوات کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجایا تھا انصاف کش اور مساوات شکن نظر آرہا ہے؟ یہ محض یورپ کی مادہ پرستی کی کورانہ تقلید ہے جس نے اُن کے دلوں سے مذہب کی وقعت اور احترام کو کم کر دیا ہے، اور یہ صرف اُن جاہل علما کی عقلوں کا نقص ہے جو تبدیلِ زمانہ کے مطابق آئینِ اسلام میں نئے نئے اجتہادات کرنے سے قاصر ہیں۔

کیا خدا کے نام پر قسم کھانا بھی انصاف میں خارج ہوتا ہے؟ کونسا مذہب ہے جس کے پیرو خدا کو نہیں مانتے؟ یہی تو وہ کلمۃ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ ہے جس پر تمام قوموں کا اتحاد ہوتا ہے اور جس سے تمام قوموں کے حقوق و آزادی کی حفاظت ہوتی ہے۔ پھر تم خدا کی عزت کو چھوڑ کر اپنی عزت کے نام پر قسمیں اٹھاؤ گے؟ تمہاری عزتیں ہی کیا ہیں اَلعِزَّۃُ لِلّٰہِ جَمِیعًا

کامیابی کا ایک راز

ہربرٹ این کیسن نے ایک کتاب "کامیابی کے راز" لکھی ہے جس میں انہوں نے ایک راز یہ بھی بتایا کہ انسان کو بیوی اچھی ملنی چاہئے اور پھر خاوند میں اس بیوی سے کامیابی حاصل کرنے میں مدد لینے کی اہلیت بھی ہونی چاہئے وہ کہتے ہیں بہت سے لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کی عقل کا بڑا غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ اور اگر تمام عمر اس مغالطہ میں مبتلا نہیں رہتے تو کم از کم شادی کے پہلے دس سالوں میں تو ضرور رہتے ہیں۔ پہلے دس سال تک وہ اپنی بیوی کو اپنی ہی دانشمندانہ تقریریں سناتے رہتے ہیں، لیکن اس کے بعد وہ سناتے نہیں بلکہ سنتے ہیں۔

مسٹر کیسن نے لکھا ہے کہ دو دماغ مل کر ایک دماغ سے ہمیشہ کام کو بہتر انجام دیتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا امریکن ناشر سائرس کرٹس اپنی کامیابی کے لئے زیادہ تر اپنی بیوی ہی کا مرہونِ منت ہے۔ کرٹس نے ایک معمولی سا پرچہ جاری کر رکھا تھا۔ اس میں ایک صفحہ عورتوں کے لئے بھی مخصوص ہُوا کرتا تھا۔ ایک دن اُس کی بیوی نے کہا:-

"یہ صفحہ کس نے لکھا ہے؟"

کرٹس نے جواب دیا "اسے میں نے لکھا ہے"

اُس نے کہا "یہ تو بڑا مضحکہ خیز ہے"

کرٹس نے کہا "ہوگا۔ اب کے ایک صفحہ تم ہی لکھ ڈالو"

اُس نے یہ صفحہ لکھا جو اخبار کا بہترین حصہ تسلیم کیا گیا، اور جلد ہی اتنا مقبول ہُوا کہ تمام اخبار پر یہی صفحہ حاوی

ہوگیا یعنی اس اخبار کا نام "لیڈیز ہوم جرنل" رکھا گیا۔ آج اس اخبار کی اشاعت بیس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

ہوا کا نقشہ

امریکا اپنے ہوا بازوں کے لئے اسی طرح کے ہوائی راستے تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جیسے سمندر میں جہاز رانوں کے لئے تعمیر ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں ان نقشوں میں ریاستہائے متحدہ کے محکمۂ بحرپیمائی کی طرف سے شمالی اوقیانوس میں تیز ہواؤں، دھندلے رقبوں اور کم حرارت فضاؤں وغیرہ کی صراحت کی جائے گی۔

گو بلند ہواؤں کا نقشہ ابھی نہایت ہی ابتدائی حالت میں ہے تاہم جو معلومات حاصل ہوچکی ہیں وہ بھی کچھ کم قدر وقیمت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ اگر ایک ہوا باز کو کسی خاص مقام تک ہوا کی طاقت اور رخ کا علم ہو جائے تو اس سے وہ کسی نہ کسی حد تک آسانی کے ساتھ اندازہ لگا سکتا ہے کہ بلند تر طبقے میں ہوا کی حالت کیا ہے۔

نئے نقشے بحر اوقیانوس پر موسمی ہواؤں اور موسمی کیفیتوں کی صراحت کرتے ہیں۔ وہ ان تمام مفید مطلب معلومات پر مشتمل ہیں جن سے مختلف بلندیوں پر ہوا کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان نقشوں کے پڑھنے میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انہیں مختلف رنگوں میں چھاپا گیا ہے اور دس ہزار فٹ تک مختلف بلندیاں مختلف رنگوں میں ظاہر کی گئی ہیں۔

نقشوں کی پشت پر اُن راستوں کی تشریح ہے جو بحر اوقیانوس کو عبور کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں اور جن کا تجزیہ محکمہ مذکور اچھی طرح کرچکا ہے۔

یہ نقشے ہر مہینے نظر ثانی کرکے شائع کئے جاتے ہیں، تاکہ اُن میں تازہ ترین معلومات بھی درج ہوسکیں۔ امید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد ہوا باز بھی ان نقشوں سے اتنا ہی فائدہ اُٹھا سکے گا جتنا کہ اس وقت جہاز ران بحری نقشوں سے اُٹھا رہا ہے۔

از یار وفا کہ دید تا من بینم — راحت ز جفا کہ دید تا من بینم

تو عمر منی و بے وفائی چہ کنم — از عمر وفا کہ دید تا من بینم

حافظ

بچپن کی سہانی صبح

"امّاں کیا اچھی ہے دنیا، میں حیران ہوں امّاں!

کیسی اچھی ہے یہ دنیا

باغ سہانا، پھولوں والا!

ننھے ننھے بھونرے!

پھولوں پر منڈلاتے، امّاں پھولوں پر چھا جاتے!

"کامنی کامنی، موہنی موہنی، من کو لبھانے والی

کلیاں پیاری پیاری!

دوب کی طوطا سی ہریالی، دیکھو اچھی امّاں

آنکھوں میں کھب جانے والی دل میں سمانے والی

"دھیمی دھیمی نرم ہوائیں

چھائی ہے کیسی مستی؟

ناچ رہی ہے گھاس کی پتّی جھوم رہی ہے ڈالی!

گود سے مجھ کو نکالو امّاں، چھوڑ دیں میں بھی جاؤں

اِس دنیا کو دیکھوں

اِس گلشن میں ناچوں گاؤں پھولوں کا منہ چوموں

اُن کو سینے سے لپٹا لوں بھونروں میں مل جاؤں

میں بھی ناچوں میں بھی گاؤں!

دھیمی دھیمی نرم ہوائیں

باغ کی پیاری پیاری فضائیں"

ڈھوکا! از سرتا پا دھوکا! آہ فریبی دنیا!

میرے بچے، میرے بالے، میرے نازکے پالے!

اس گلشن میں پھول نہیں ہیں پھول کے بھیس میں کانٹے

سکھ کا مدفن دکھ کا مسکن!

دُکھ ہی سب کو بانٹے

اس گلشن میں پھول نہیں ہیں پھول کے بھیس میں کانٹے

"تتلیوں کے پر کیا رنگیں ہیں نیلے پیلے سنہرے؟

رنگ برنگ کے پھول ہیں کیا کیا!

ہرے ہرے کیا پتّے؟

دھوکا! از سرتا پا دھوکا! آہ فریب ہستی!

خونِ تمنّا سے رنگیں ہے یہ پھولوں کی بستی

"اس کی صبا میں زہر بسا ہے دل کی کلی مرجھا دے

اس کا خمیر جفا ہے

کس کو خبر ہے کب یہ اچانک کوئی تیر چلا دے

پہلو میں پیرا دے

"دھوکا! از سرتا پا دھوکا! آہ فریبی دنیا

اپنا دام بچھالے

جو آئے پھنس جائے اس میں آنکھ پہ پردہ ڈالے

میرے بچے، میرے بالے، میرے نازکے پالے

اس گلشن میں پھول نہیں ہیں پھول کے بھیس میں کانٹے"

حامد علی خاں

جامِ صہبائی

(۱)

اے کاش ہر اک آنکھ بینا ہو جائے
ہر سینہ فروغِ برقِ سینا ہو جائے
لذت کشِ جامِ عشق ہو جائے دل
بیگانۂ ذوقِ جام و مینا ہو جائے

(۲)

یہ وقت نہیں ہے سیرگاہوں کیلئے
کیوں وقف ہو کوئی خانقاہوں کیلئے
ہنگامۂ حسن ہیں جلوہ ہائے ازلی
نظارے عجیب ہیں نگاہوں کیلئے

(۳)

اے کاش فروغِ نور ہو جائے دل
یا آئینۂ برقِ طور ہو جائے دل
تاریکیٔ ... ہو جائے
یا حسنِ ازل کا آئینہ ہو جائے دل
یا ٹوٹ کے چور چور ہو جائے دل

(۴)

یا غرق ہے حسن سے لبالب پانی ہے
بہ جزو ہے بے خودی میں چھپا پانی ہے
فردوسِ بریں کے پھول کھاتے ہیں اثر
جب صبحِ بہار سے ارغوانی ہے

اثر صہبائی

فلسفہ

میرے دوست کی فرمائش ہے کہ دو تین صفحوں میں دنیا جہاں کا فلسفہ بھر دوں۔ حضرت ایک عالی شان قصر کی تعمیر میں منہمک ہیں اور چونکہ اس میں ایک مختصر سا کتب خانہ بھی جاگزین ہوگا اس لئے شاید فلسفہ بمقدار کمرہ یا فلسفہ بقدر جثہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ یہ وہ بھول گئے کہ جس سر بفلک قصر کے چمکیلے پھسلوان فرش رفعت کے اچھلتے ہوئے پاؤں کو جو میں گے اُس میں فلسفے کا کیا کام! بہر حال تعمیلِ ارشاد میں فلسفے کا خون کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں

کیا نیا کیا پرانا کیا مادی کیا ذہنی سب فلسفے اس اصول پر متفق ہیں کہ جو بات قطعی پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اُسے یقیناً غلط جانو۔ مثلاً ایک زمانے میں بعض لوگوں میں یہ تحقیقی طور پر ثابت شدہ تھا کہ خدا نے انسان کو بنایا ہے تھوڑی دیر بعد یہ ثابت ہوگیا کہ انسان نے خدا کو بنایا ہے اور یہاں تک کہا گیا کہ ایک دیانتدار خدا بنانا انسان کا بہترین کام ہے مگر جب لوگ اس حد تک پہنچ گئے تو پھر شبہ ہوگیا کہ ایسا خدا کس کام کا جو اپنی مرضی سے اپنے بنائے ہوئے قانون توڑ پھوڑ کر کچھ کا کچھ نہ کر دے۔ چنانچہ جب سے یہ نئے شکوک پیدا ہوئے ہیں تب سے پھر یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ خدا ہے یا کم از کم اگر خدا نہیں تو کچھ نہ کچھ ہے اور ضرور ہے۔ یہاں تک تو راستہ بالکل صاف ہے یعنی یہ کہ اگر شک ہے تو خدا ہے اور اگر خدا ہے تو شک ہے یا یوں کہیئے کہ خدا اور شک لازم ملزوم ہے۔ یہ وہ ہے وہ یہ ہے، مگر الجھن اس 'کیا' کے سوال سے پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی اس سے، کہ کیا ہے؟ کیونکہ جس معقول انسان کو ایک سوال کے دو جواب مل جائیں وہ کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ الجھن پیدا ہوتی ہے، کیوں؟ کے سوال سے جو بندی پوچھتا ہے کہ خدا یا شک یا دونوں الگ الگ یا اِن دونوں کی معجونِ مرکب کیوں ہے؟ اس کیوں کی دیوار کے ساتھ فلسفے کو سر پھوڑتے صدیاں گذر گئیں مگر ہنوز روزِ اول۔

کیوں کا سوال حل کرنے کے لئے خود فلسفے کی ماہیت پر چند فقرے تمہیداً لازمی ہیں۔ جس طرح باغوں میں خودرو بھنگ ہوتی ہے اسی طرح دماغوں میں فلسفہ اُگتا ہے اور جس طرح بعض باغوں کی بھنگ تیز ہوتی ہے اور بعض کی ذرا دھیمی اسی طرح بعض دماغوں کا فلسفہ گرم ہوتا ہے اور بعض کا سرد۔ اگر بھنگ بچاری سے پوچھا جائے کہ تم کیوں تیز ہو تو وہ کیا بتلائے گی، کچھ نہیں، یہ تو سوال کرنے والے کا فرض ہے کہ بھنگ والی زمین کے مزاج کا سائنٹیفک مطالعہ کرے اور اسی مطالعہ سے جو کچھ وہ اخذ کر سکے اُسے بیان کر دے۔ اسی طرح فلسفہ سے یہ پوچھنا کہ تم کیوں گرم ہو لاحاصل ہے۔ جن دماغوں میں اُس کی نشوونما ہے اُن کا مطالعہ لازمی ہے۔ اس

ہیں وقت یہ آپڑتی ہے کہ دماغوں کے مطالعہ کے لئے جن جماعتوں کے وہ دماغ ہیں اُن جماعتوں کا مطالعہ کیا جائے اور جماعتوں کے سمجھنے کے لئے دیگر ملحقہ جماعتوں کے تاثرات کا اندازہ لگایا جائے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ حالاتِ متقدم کی بھی اسی طرح چھان بین کی جائے - غرض یہ ایک لامتناہی سا سلسلہ ہے - اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ جب خود اپنی نسبت یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیوں کسی شوخ چشم کی نگاہ کی طرح بیباک ہے تو وہ تمام کائنات عالم کی "کیوں" کو کیسے حل کرے گا؟

چنانچہ اب رحجان یہ ہے کہ کیوں کے سوال کا جواب نہ دیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ سرے سے سوال ہی غلط ہے - ہزارہا کتابوں کی لاکھوں دلیلوں میں سے صرف ایک دلیل کی طرف اشارہ کافی ہے - کسی چیز کی کیوں تب بتائی جاسکتی ہے جب وہ ختم ہو - چونکہ نظامِ عالم ابھی ختم نہیں ہوا اس لئے اس کی کیوں کا سوال قبل از وقت ہے - یہ الگ بات ہے کہ جب نظامِ عالم ختم ہوگا تو پھر نہ کیوں ہوگی نہ کیوں والے ہونگے "کیا" اور "کیوں" کے علاوہ فلسفے میں صرف تین سوال اور ہیں - سب سے پہلے کس طرح کو لیا جاتا ہے - سائنس نے جب پیٹ میں سے پاؤں نکالے تو باوا آدم بچارے رخصت ہوئے اور ایک نامعلوم مگر حقیقی چچا بوزنہ سرکار کہلانے لگے - مگر سائنس کمبخت نے اس پر بس نہ کیا - بھاگتی گئی اور فلسفہ ہانپتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے پیچھے چلا گیا - آخر نتیجہ یہ نکلا کہ کل جانداروں کا موجدِ اعلیٰ کوئی قسمت کا مارا (Protoplasm) تھا اور کل جاندار اور بے جانوں کا نکڑ دادا میاں (Atom) خلف (Electron) ولد نامعلوم ہے - یہ (Electron) صاحب بڑے مداری ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانکلتے ہیں مگر درمیانی رستہ طے نہیں کرتے اور جب ان کی باضابطہ جامہ تلاشی لی جائے تو محض قلاش یعنی نہ کپڑا نہ لتا نہ جسم بلکہ صرف کشش کا گورکھ دھندا -

"کیا" "کیوں" "کس طرح" کے سوالوں کے بعد "کب سے؟" کا سوال پیدا ہوتا ہے اور موجودہ فلسفے کی رو سے یہ پانچویں سوال "کس جگہ سے" سے وابستہ ہے - حکیم آئن سٹائن کا خدا بھلا کرے اُس نے "کب سے؟" کو "کس جگہ سے؟" سے یوں ٹکرایا ہے کہ اب نہ وقت کا پتہ چلے نہ بُعد کا - بس فلسفہ ختم - جن لوگوں کو فلسفے کا امتحان دینا ہو اُن کی سہولت کے لئے سوال و جواب کی صورت میں تمام تحقیقات کا لبِ لباب درج کر دیا جاتا ہے -

سوال - کیا ہے؟

جواب - اندھے ہو، بہرے ہو، سوجھتا نہیں - دیکھ لو، سُن لو - چھولو، چکھ لو اور جو پھر بھی پتہ نہ لگے تو

مرجاؤ اور جو پھر بھی نہ مرنے تو جہنم کو جاؤ۔

سوال ۔ اگر کچھ ہے تو وہ کیوں ہے؟

جواب ۔ بیہودہ احمق نامعقول ۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو کیوں پوچھتے ہو اور اگر ہمیں معلوم ہے تو کیوں بتائیں ۔ ع

چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی

جب تھم تھما جائے تو پھر یہ سوال کرنا۔

سوال ۔ اگر کچھ ہے تو کس طرح سے ہے؟

جواب ۔ کسی قسم کی نامعلوم کشش کو ہذیان ہے۔

سوال ۔ یہ ہذیان کب سے ہے اور کس جگہ ہے؟

جواب ۔ تمہارے لئے جب سے تم ہو اگر تم ہو اور میرے لئے جب سے میں ہوں اگر میں ہوں اور اس تمام کیا ہے کے لئے جب سے یہ کیا ہے ہوا اور جہاں کہیں ہوا ۔ جاہل آدمی ابھی چند دن ہی تو گذرے کہ وقت کا مسافت سے نکاح ہوا اتنی جلدی یہ جوڑا کس طرح کوئی بچہ پیدا کردے ۔ جاؤ ہمیں سوچنے دو کہ الو پہلے تھا یا الو کا انڈا۔

فلک پیما

غزل

انہیں کیا ہمیں درد و غم گر جلائے ۔۔۔ ہمیں کیا اگر موت کے بعد آئے

ستاروں کے نیچے سر شام تم کو ۔۔۔ خموشی نے کیا کیا فسانے سنائے

ہماری وفا بھی ہماری خطا تھی ۔۔۔ کہ جس نے جفاؤں کے فتنے جگائے

بنے آبلے دل پہ آنسو جو رو کے ۔۔۔ تمہاری جفاؤں نے کیا گل کھلائے

خدا سے بصد اشکِ خوں واسطی کی

دعا ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو ملائے

محمد جمیل واسطی

حُسنِ فطرت

فطرت کا جو مطالعہ کرتے ہیں صبح و شام
دریائے حُسن سے وہ گزرتے ہیں صبح و شام

دم خالقِ جمال کا بھرتے ہیں صبح و شام
اِس لطفِ زندگی پہ وہ مرتے ہیں صبح و شام

دن ہو تو تاکتے ہیں گلوں کے ہجوم کو
شب ہو تو دیکھتے ہیں وہ بزمِ نجوم کو

قدرت کے جلوے ہیں جو نمایاں اِدھر اُدھر
پھرتے ہیں مست بادِلِ حیراں اِدھر اُدھر

پاتے ہیں حسن کو جو درخشاں اِدھر اُدھر
ملتا ہے اُن کو عشق کا ساماں اِدھر اُدھر

شمعوں کے گرد صورتِ پروانہ پھرتے ہیں
پھولوں پہ مثلِ بلبلِ دیوانہ گرتے ہیں

پھیلی ہیں اُن کے گرد نظاروں کی جنتیں
گھیرے ہوئے ہیں اُن کو بہاروں کی نکہتیں

آتی ہیں چار سو نظر اُن کو لطافتیں
شیریں صباحتیں ہیں تو رنگیں ملاحتیں

کڑیاں تلاشِ دید کی جب جھیلتے ہیں وہ
فردوسِ زندگی میں پڑے کھیلتے ہیں وہ

کہتا ہے حُسن اُن سے کہ دیکھو چمن مرا
ہر نخلِ تازہ میں ہے بھرا بانکپن مرا

بھرتے ہیں دم بہار میں سرو و سمن مرا
جلوہ ہر ایک رنگ میں ہے موج زن مرا

نیرنگِ زندگی مرا ہر ایک رنگ سے ہے
فطرت بھی دیکھ کر مرے رنگوں کو دنگ ہے

سانچوں میں شوخیوں کے میں ڈھلتا ہوں دم بدم
سج کر نیا لباس نکلتا ہوں دم بدم

تیوریں دلبری کے بدلتا ہوں دم بدم
بن کر چھلاوہ دل کو میں چھلتا ہوں دم بدم

ہر ایک طرزِ جلوہ گری جانتا ہوں میں
حسنِ ازل کی رمز کو پہچانتا ہوں میں

نقالِ دلبری یہ ستارے ہیں سب مرے تاروں کی چشمکوں میں اشارے ہیں سب مرے
یہ دامنِ شفق میں شرارے ہیں سب مرے بجلی کی شوخیوں میں طرارے ہیں سب مرے

پھیلا ہے اس فضا میں مرا نور دور تک
تاروں کی بھی رسائی نہیں میرے نور تک

شاعر کے دل پہ جب مرا الہام اُترتا ہے سیلابِ نور اُس کی رگوں سے گزرتا ہے
اک آفتاب مطلعِ دل سے اُبھرتا ہے نور اُس کا شاعری کے افق پر بکھرتا ہے

اُس کی زباں سے نور کی دھاریں اُبلتی ہیں
خامہ سے نخلِ طور کی شاخیں نکلتی ہیں

چاہوں اگر تو دل میں مصوّر کے آؤں میں تصویر کو بہشتِ تصوّر بناؤں میں
رنگوں کے وصل و فصل کی رمزیں بتاؤں میں صنعت میں دھوپ چھاؤں کا نقشہ دکھاؤں میں

ہوتا ہے جب رواں مری رنگیں روش پہ وہ
کرتا ہے وجد اپنے قلم کی کشش پہ وہ

کرتا ہوں جب حلول مغنّی کے ساز میں بھرتا ہوں رنگ راگ کے سوز و گداز میں
ہے ربط حسن و عشق کے ناز و نیاز میں نسبت وہ ہے سروں کے نشیب و فراز میں

جب اہلِ راز ساز کی آواز سنتے ہیں
ہر سُر کے سحر کو جان کے سر اپنا دھنتے ہیں

پرتو صنم تراش پہ پڑتا ہے گر مرا ہوتا ہے اُس کی چشمِ تخیل میں گھر مرا
پاتا ہے اپنے بت میں ہنر جلوہ گر مرا آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ روشن ہنر مرا

صانع کی آنکھ دیکھ کے صنعت جھپکتی ہے
اُس کے بتوں سے میری خدائی ٹپکتی ہے

ہر شہر کے حسینوں کی شہرت مجھی سے ہے جنسِ لطیف کی یہ لطافت مجھی سے ہے
منظر نما شاگاہوں کا جنت مجھی سے ہے جنت کے طالبوں کو بھی الفت مجھی سے ہے

دنیا و دیں سے کھیلتی ہیں شوخیاں مری
کونین کی زبان پہ ہے داستاں مری

وحید الدین سلیم

لیلیٰ

علی سعید بے، مصر کا مایۂ ناز فرزند، اپنے تمول و تشخص کے لحاظ سے نہ صرف شمالی افریقہ بلکہ یورپ کے تجارتی حلقوں میں بھی روئی کا ملک التجار سمجھا جاتا تھا۔ بحر الغزال اور نیل ارزق کی شاداب وادیوں میں لاکھوں ایکڑ اراضی اُس کی ملکیت تھیں۔ اس کے علاوہ قاہرہ، اسکندریہ، مانچسٹر اور الجزائر کی متعدد تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے میں جس اولو العزمانہ جدوجہد اور فہم و فراست کا ثبوت اُس نے ابنائے وطن کے سامنے پیش کیا وہ بیک وقت نوجوان مصریوں اور یورپ کے سرمایہ دار افراد کے لیئے استقلال اور بلند ہمتی کی ایک لائق تقلید مثال اور قابلِ رشک کامیابی کا ایک عدیم النظیر نمونہ تھا۔ علی سعید کے ہاں صرف دو اولادیں تھیں۔ ایک لڑکا خلیل بے جو اس وسیع کاروبار میں باپ کا دستِ راست اور یورپ کی تجارتی منڈیوں میں اپنے مال کی کھپت اور فروخت کا نگران تھا۔ دوسری لڑکی لیلیٰ جس کی تعلیم و تربیت زیادہ تر پیرس میں ہوئی تھی اور جس کی عمر کا ابتدائی حصہ علومِ مغربی کی تحصیل اور فنِ مصوری کی تکمیل کے لیئے اُن فرانسیسی مدارس میں بسر ہوا تھا جن میں عمائدِ فرانس اور امرائے یورپ کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب جنگِ عمومی کے خوفناک شرارے تمام یورپ کا متاعِ امن و امان تاراج کر رہے تھے لیلیٰ اپنی تعلیم ختم کر کے وطن واپس آگئی۔ اُس وقت دنیا کے تمام تجارتی مرکزوں میں سخت پریشانی اور اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا لیکن علی سعید کا کاروبار غیر معمولی طور پر چمک اُٹھا۔ مانچسٹر اور لنکا شائر وغیرہ کے تمام کارخانے انگریزی افواج کے لیئے کپڑا تیار کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے اور مصری روئی کا اجارہ کلیتًا علی سعید بے کے پاس تھا۔ خلیل بے کے لیئے یہ ناممکن تھا کہ وہ انگریزی منڈیوں کے تمام کام کی تنہا نگرانی کر سکے اسی لیئے ۱۹۱۵ء کے آغاز میں علی سعید اپنی لڑکی لیلیٰ اور ایک نوجوان رشتہ دار خالد کو، جو کچھ عرصہ تک روم اور پیرس کی منڈیوں میں اُس کا گماشتہ رہا تھا، قاہرہ اور اسکندریہ کے دفاتر کا اہتمام سپرد کر کے خود بھی انگلستان چلا گیا۔ خالد اور لیلیٰ نے جس انہماک، محنت اور دیانت داری سے چار سال تک یہ کام سر انجام دیا۔ اُس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب بوڑھا علی سعید مصر واپس آیا تو اُس نے ایک قانونی دستاویز خالد کے سپرد کی جس کی رو سے وہ بلا شرکتِ غیرے قریبًا ایک لاکھ روپے کی جاگیر کا مالک تھا۔ چار سال کی رفاقت نے خالد اور لیلیٰ کو ایک دوسرے کی طبیعتوں کا واقف بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس قرب و موانست نے دونوں کے خیالات و حسیات کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ بقیہ زندگی کے لیئے بھی صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے رفیقِ حیات

بن جائیں۔ سرد و گرم چشیدہ تاجر کچھ عرصہ تو انکار ہی کرتا رہا لیکن جب دونوں کے دل ایک دیکھے تو بخوشی اجازت دے دی
چار سال کی مسلسل مصروفیت اور شب و روز کے انہماک نے دونوں کی صحت پر نہایت ناخوشگوار اثر ڈالا تھا اس
لئے بحالیٔ صحت کی خاطر لیلےٰ تو وادیٔ حلفہ میں چلی گئی جو دریائے نیل کے کنارے ایک نہایت خوشنما اور پرفضا شہر ہے اور
خالد تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے چند ماہ کے لئے پیرس آگیا۔ تین ماہ تک تو ایک دوسرے کو محبت بھرے خطوط موصول
ہوتے رہے لیکن چوتھے مہینے خالد کی طرف سے نامہ و پیام کا سلسلہ یک قلم مسدود ہو گیا۔ لیلیٰ پھر بھی خط لکھتی رہی اور
اُس وقت تک لکھتی رہی جب اُس کے خطوط پیرس کے ڈاک خانوں سے واپس آنے لگے ان خطوط کے لفافوں پر یہ
الفاظ مرقوم ہوتے "مکتوب الیہ کا کوئی پتہ نہیں" کچھ عرصہ وہ امید و بیم کی حالت میں رہی پھر قاہرہ واپس چلی آئی
لیکن خالد کا کوئی پتہ نہ تھا۔ علی سعید نے کئی دوستوں کو خطوط لکھے لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر خالد کی
اُس جاگیر کے نگران سے جو علی سعید نے اُس کی خدمات کے صلہ میں عطا کی تھی، یہ معلوم ہوا کہ وہ نیویارک میں مقیم
ہے جہاں اُس نے ایک ارمن نژاد لڑکی سے شادی کر لی ہے۔

ایک دوشیزہ لڑکی کے لئے اس سے زیادہ دل شکن اور روح فرسا کوئی خبر نہیں ہو سکتی جب اُسے یہ معلوم ہو جائے
کہ وہ شخص اُس سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا ہے جس کے رنج و راحت میں برابر کی شریک بننے کی خواہش اُسے دن رات
بے چین رکھتی تھی اور جس کی خدمت و پرستش کے جذبات ہر لمحہ اُس کے محبت بھرے دل میں نشو و نما پا رہے تھے۔ وہ
حیران تھی کہ خالد کو کس کی چشم فسوں ساز نے اپنا دیوانہ بنا لیا اور وہ کیا وجوہ تھیں جن سے حقیقی وفا اور سچی محبت کا پیمان
چشم زدن میں ذاتی و نفسانی اغراض کی نذر ہو گیا۔ وہ بار بار گذشتہ واقعات و سانحات پر غور کرتی اور سوچتی کہ کس کج ادائی
اور کم التفاتی نے خالد کو اس سے بدگمان کر دیا لیکن سینکڑوں دفعہ سوچنے کے باوجود کوئی ایسی بات اُس کے ذہن
میں نہ آئی جو اس عقدہ کو صحیح طور پر حل کر کے اُس کی بے لوث روح کو اس بارِ گراں سے سبکدوش کر دیتی۔ شب و روز
کے اضمحلال و پریشانی نے اُسے نہایت لاغر و بیمار بنا دیا حتیٰ کہ اُس کی نقاہت اور افسردگی نے اُس کے اعزہ کی نظر
میں ایک تشویش انگیز حالت پیدا کر دی۔ اب دنیا کی کوئی دلچسپی اُس کے نزدیک قابلِ اعتنا نہ تھی، دولت و سامانِ راحت
کی فراوانی اُس کے مردہ جذبات میں نئی زندگی کا خون پیدا کرنے سے عاجز تھی اور اُس کے موسیقی و مصوری کے
محبوب ترین مشاغل ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کر سکتے تھے۔ وہ دنیا اور اُس کے متوسلین
سے اپنے تعلقات منقطع کر کے شہروں کی گنجان آبادی اور پر از شور و شغب زندگی سے دور کسی تنہا مقام پر حیات مستعار
کے بقیہ دن اُن تاثرات و جذبات کے سوز و غم میں بسر کرنا چاہتی تھی جنہیں اُس نے دنیا کے سب سے بڑے بے وفا

انسان کے لئے پرورش کیا تھا اور جو اُسے جانِ گرامی سے بھی زیادہ عزیز تھے۔

مشاہیر اطبائے مصر کے مشورہ کے مطابق اُس کے لئے خشک اور معتدل آب و ہوا زیادہ مفید تھی۔ اس لئے اکتوبر کے وسط میں وہ اپنی ایک وفادار خادمہ کے ہمراہ الجزائر کی طرف روانہ ہوگئی۔ شام کے وقت جب غروب ہونے والے سورج کی سنہری کرنیں سمندر کی ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ مضطربانہ رقص کر رہی تھیں، مصری جہاز "العبید" الجزائر کے بندرگاہ میں داخل ہوا۔ لیلیٰ نے وہ رات ایک فرانسیسی ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے روز دس بجے کے قریب وہ بن غازی کی طرف روانہ ہوگئی جو الجزائر سے تقریباً ایک سو میل کے فاصلہ پر تھا۔ بن غازی کی آبادی دو ہزار نفوس سے زائد نہ ہوگی صدر بازار کے قریب ہی فرانسیسی سپاہیوں کی بارکیں تھیں اور اُس کے عین مقابل رومن کیتھلک پادریوں کا گرجا اور اُس سے ملحق ایک شفاخانہ اور ڈاک خانہ بھی تھا۔ سرکاری عمارتوں سے دو سو گز کے فاصلے پر ایک نہایت خوش نما باغ اور اُس کے ساتھ قصبہ بن غازی کے چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک مکانات کا سلسلہ تھا اور اُن مکانات سے ذرا ہٹ کر اطالوی طرز کے چند پختہ مکانات قصبہ کے متمول عربوں نے سیاحوں کے قیام و آرام کے لئے بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک رہبر کی مدد سے لیلیٰ نے اُن میں سے ایک مکان اپنے لئے غیر معین عرصہ کے واسطے مخصوص کرا لیا۔

لیلیٰ کو بن غازی میں آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ کے قریب ہوگیا تھا لیکن اہلِ قصبہ کو اُس کے مسلسل قیام کے متعلق کوئی واقفیت نہیں تھی۔ مختلف قسم کے قیاسات اور افواہیں اُس سے منسوب کی جاتی تھیں لیکن حقیقت نفس الامری سے ہر شخص بے بہرہ تھا چونکہ وہ زیادہ تر فرانسیسی لباس میں رہتی تھی اس لئے مقامی اشخاص کا یہ گمان غالب تھا کہ وہ ایک مشنری عورت ہے جو اُن کے بچوں کو عیسائی بنانے کی خاطر بھگا لے جانے کے لئے اس دور دراز مقام پر متعین کی گئی ہے۔ بوڑھے پادری اور ادھیڑ عمر فرانسیسی ڈاکٹر سے چند وقتی ملاقاتوں نے لوگوں کے شکوک پر صریح بدگمانی کی مہر ثبت کر دی اور قصبہ کے ہر مرد اور عورت نے بچوں کو اُس کے مکان کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا۔ ایک دن صبح کے وقت جب افق مشرق سے طلوع ہونے والے آفتاب کی سنہری کرنیں عظیم الشان صحرا کی وسعتوں پر لمعاتِ نور بکھیر رہی تھیں لیلیٰ اپنے مکان کے صحن میں کھجور اور فلفل کے درختوں کے سایہ کے نیچے ایک آرام کرسی پر لیٹی جلوہ زارِ فطرت کے پرکیف مناظر کا لطف اٹھا رہی تھی۔ صحرائے اعظم کی نسیم حیات بخش کے ہلکے ہلکے جھونکے اُس کے مضبوط و خوبصورت بدن پر بکھرے ہوئے بالوں میں بے شمار حلقے پیدا کر رہے تھے۔ اُس وقت وہ محسوس کر رہی تھی کہ ریگ زار کے لیل و نہار اپنی اس سادگی اور خاموشی میں کتنی جاذبیت، شعریت اور مضطرب دلوں کو تسلی دینے والا طلسم پنہاں رکھتے تھے

دراصل یہ اُس کی عادت تھی کہ اپنے مکان سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹے سے نخلستان تک ہر روز سیر کے لئے جاتی اور واپسی پر کچھ دیر ستا کر غسل کرتی اور صبح کا ناشتہ صحن باغ ہی میں کھاتی اور دوپہر ہونے تک وہیں اخبار اور کتابیں دیکھا کرتی تھی۔ اس وقت وہ ایک سفید لباس پہنے، ناشتہ سے فارغ ہو کر بے معنی نگاہوں سے ریت کی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے گنجان درختوں کے نیچے عربوں کی جھونپڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان سے پرے صحرا کے دامن پر بکھرے ہوئے نخلستان اس طرح نظر آتے تھے جس طرح بحر ناپیدا کنار کے پانی میں پوشیدہ چٹانیں سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں اور پھر اس سے بھی دور افقہائے بعید پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساقیٔ فطرت نے صحرا کی لاتناہی وسعتوں کو تنگ و محدود کرنے کی خاطر آسمان کا پیالہ اُس پر اوندھا رکھ دیا ہو اور سورج کی کرنیں اُس پر اس طرح چمک رہی تھیں جس طرح کسی جام نیلگوں کی نیلاہٹ میں مئے ارغوانی کی لہریں جھلک رہی ہوں لیلیٰ بے خودی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور ایک قسم کا وجد اُس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔ اتنے میں اُس کے مکان کے احاطہ کا دروازہ کھلا اور ایک نو دس سال کی عمر کا عرب لڑکا آہستہ آہستہ، ڈرتا، ڈرتا قدم اٹھاتا احاطہ کے اندر داخل ہؤا۔ اُس کے ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ اور خشک پتوں کی چرچراہٹ نے اپنے خیالات میں مدہوش عورت کو بیدار کر دیا اور خلاف توقع ایک چھوٹے بچے کو منفعل انداز میں اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ کچھ مسرور سی ہوگئی اور خوشی و شادمانی کی حالت میں ایک لطیف تبسّم اُس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگا۔ خردسال نووارد کے اندازِ خرام سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دماغ میں اُن فرضی افسانوں کا اثر پوری طرح سرایت کئے ہوئے ہے جو اُس نے متعدد بار قصبہ کے لڑکوں اور خود اپنے والدین کے منہ سے لیلیٰ کے متعلق سنے تھے لیکن بچوں کی فطرت جس کام سے اُنہیں روکا جائے اُس کی مخفی دلچسپیاں انہیں اپنی طرف ضرور کھینچ لے جاتی ہیں۔

لڑکا ایک صاف ستھرے عربی لباس میں ملبوس، سر سے برہنہ لیلیٰ کی طرف استعجاب کی نگاہوں سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ نوجوان عورت نے کرسی پر کہنیاں ٹیک کر اپنی نشست درست کر لی اور بکھرے ہوئے بالوں کو پس پشت ڈال کر متبسّم نگاہوں سے خالص مصری لہجہ میں لڑکے کو مخاطب کر کے کہنے لگی "آجاؤ۔ لڑکے ڈرو نہیں، آوٴ۔ آوٴ۔ ......"

چھوٹا بچہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ـــــ گندمی رنگ کے خوبصورت چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور گھونگریالے بال لیلیٰ کو بہت بھلے معلوم ہوئے اور جب وہ شفقت آمیز الفاظ سن کر مسکرا دیا تو اُس کے گالوں کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں نے نوجوان عورت کے دل میں بچہ کا منہ چوم لینے کی خواہش پیدا کر دی۔ "بیٹھ جاؤ" لیلیٰ کے منہ سے نکلا اور وہ پاس رکھی ہوئی ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ پھر چند لمحوں کے سکوت کے

بعد نہایت بھولے انداز سے کہنے لگا۔ "کیا آپ مجھے پینے کے لئے پانی دیں گی؟"

"ضرور" لیلیٰ نے کہا اور نہایت شیریں آواز میں اپنی خادمہ کو پکارا۔ جب وہ حاضر ہوئی تو اُس نے اُسے پانی لانے کا حکم دیا۔ ننّھا لڑکا نہایت حزم و احتیاط سے لیلیٰ کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ لیکن چند ہی لمحوں میں اُسے معلوم ہوگیا کہ اُس سے خوف کھانے یا ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ اُس کا برتاؤ حد سے زیادہ شریفانہ اور محبت آمیز تھا۔ یہاں تک کہ لیلیٰ کی خوبصورت آنکھوں کی چمک، اُس کی آواز کی حلاوت اور بے تکلفانہ طرزِ تکلّم سے چند منٹ میں وہ ایسا مانوس ہوگیا گویا لیلیٰ سے برسوں کی جان پہچان تھی۔ اتنے میں مصری خادمہ نے ایک مکلّف خوان میں شیشے کے دو خوبصورت گلاس لاکر اپنی مالکہ کے سامنے پیش کئے۔ لیلیٰ نے ایک گلاس اپنے مہمان کو دیا اور دوسرا اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ٹھنڈے اور شیریں پانی نے دونوں کے دلوں میں ایک قسم کا مسرت نما سکون پیدا کر دیا۔ اگرچہ نوعمر لڑکے کے پاس اب گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہ تھا لیکن پھر بھی وہ خاموش بیٹھا لیلیٰ کی ہر چیز کو حیرت و استعجاب سے تکتا رہا، وہ خوش تھا کہ اُس کے میزبان نے اُس کی تعلیم یا مشاغل کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا اُدھر لیلیٰ بھی مطمئن تھی کہ کم سن ملاقاتی نے اُس کے حسب نسب کے متعلق دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ چونکہ دھوپ کی حدت لحظہ بلحظہ ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی اس لئے خادمہ حسبِ معمول اخبار اور کتابیں اُٹھانے کے لئے آگئی اور چھوٹا بچہ یہ محسوس کرکے کہ اُس کا میزبان گھر کے اندر جانے کی تیاری کر رہا ہے آہستہ سے اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہوگیا اور اپنے مخصوص عربی انداز میں "خدا حافظ" کہہ کر جس طرف سے آیا تھا اُدھر ہی کو چل دیا۔

اس معمولی ملاقات کے بعد بھی چھوٹا بچہ دو تین دفعہ لیلیٰ کے مکان پر آیا اور مختصر سی گفتگو کے بعد واپس چلا گیا۔ اس عرصہ میں خادمہ کے توسط سے لیلیٰ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قصبہ کے باشندے اُسے کس حد تک خطرناک سمجھتے تھے اور کس قسم کے خیالات اُس سے منسوب کر رہے تھے۔ ایک دن صبح کے وقت جب وہ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر صحنِ مکان میں اخبار دیکھ رہی تھی تو اُس کا خرد سال دوست فرانسیسی سگاروں کا ایک ڈبہ بغل میں دبائے اپنی فطری شوخی کو مصنوعی متانت میں تبدیل کرکے باغ میں داخل ہوا۔ لیلیٰ نے اُسے پیار سے بلا کر کرسی پر بٹھایا۔ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کیں لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی کہ آج اُس کے ملاقاتی نے خلافِ معمول اُس کا نام بھی دریافت کیا چنانچہ کچھ دیر تک وہ حالتِ تذبذب میں رہی بالآخر اپنے پریشان خیالات کو مجتمع کرکے کہنے لگی "میرا نام لیلیٰ ہے میں مصر سے آئی ہوں"

"مصر" لڑکے کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر ایک لمحہ کے توقف کے بعد کہنے لگا "میں بھی وہاں جا کر ابوالہول دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"بہت اچھا" لیلےٰ نے کہا "جس وقت تم بڑے ہو جاؤ گے، میرے پاس آجانا میں تمہیں سارے مصر کی سیر کراؤں گی ـــــ اچھا تمہارا نام کیا ہے"؟

"خالد بن عمر" لڑکے نے مستعدی سے جواب دیا۔

لیکن خدا معلوم ان الفاظ میں کیا سحر مضمر تھا کہ لیلیٰ یہ سنتے ہی ایک گہرے سوچ میں پڑ گئی "خالد" اُس نے آہستہ سے کہا اور اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ گذشتہ واقعات کی یاد کے مضراب نے اُس کے سازِ دل کے خاموش تار کو چھیڑ کر ایک غم آفریں نغمہ کی صدا پیدا کر دی۔ آنسوؤں کے چند قطرے دل کی گہرائیوں سے اُٹھ کر اُس کی خوبصورت آنکھوں میں جمع ہو گئے اور اس دھندلکے میں محبت کی یاد مردہ جذبات کے تابوت سے مٹی ہوئی امیدوں کا کفن ہٹا ہٹا کر جھانکنے لگی۔ کم سن بچے کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے نام میں اتنی حرارت موجود ہے کہ لیلیٰ کے منجمد جذبات کو تحلیل کر کے اُس کے دکھے ہوئے دل میں غم و اندوہ کا دریا بہا دے گی۔ اپنے میزبان کو اس درجہ متاسف و ملول دیکھ کر اُس کا جی ڈر گیا کیونکہ بادی النظر میں کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آیا تھا جس سے لیلے کا اس درجہ مغموم ہونا اُس کی سمجھ میں آجاتا۔ کچھ عرصہ تک دونوں خاموش ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے پھر کا یک کسی خیال کے برق نما تیزی کے ساتھ دماغ میں سما جانے کے باعث لیلیٰ نے اپنے آنسو آستین میں جذب کر لئے اور مصنوعی تبسم کے ساتھ بچے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی "خالد کیا تم مدرسے جایا کرتے ہو"؟

تاریک بادلوں میں جس طرح شعاعِ نور چمک جاتی ہے بعینہٖ خالد یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ کس طرح لیلیٰ کی پرنم آنکھوں میں شفقت کی چمک اور اُس کے غمگین چہرے پر فرحت کی سرخی دوڑ گئی تھی" میں سرکاری مدرسے جاتا ہوں" خالد نے فخر سے گردن بلند کر کے کہا "میرے باپ نے کہا تھا کہ اگر میں شوق سے پڑھوں گا تو وہ مجھے پیرس بھیج دے گا پھر میں فوج میں جرنیل بن جاؤں گا"۔

"کیا تمہاری والدہ کو معلوم ہے کہ تم میرے پاس آیا کرتے ہو" لیلیٰ نے کچھ دیر تامل کر کے پوچھا

"نہیں" خالد نے منفعل انداز میں جواب دیا

لیلیٰ چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی اور خالد اُس کے ہاتھ کی طلائی انگشتری کو نہایت دلچسپی سے دیکھتا رہا جس کا بیش قیمت نگینہ کھجور کے پتوں سے چھن کر آنے والی آفتاب کی کرن میں عجب انداز سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ چند

منٹوں تک خاموش رہنے کے بعد لیلیٰ نے مہرِ سکوت کو توڑا اور نہایت رسیلی آواز میں کہنے لگی "اور تمہارے اِس چھوٹے سے بکس میں کیا ہے؟ مٹھائی؟"

یہ سُن کر خالد کچھ محجوب سا ہو گیا۔ اُس نے اپنے ڈبّے سے نظر اُٹھا کر لیلیٰ کے دلفریب چہرے کی طرف دیکھا پھر نہایت بھولے پن سے کہنے لگا "نہیں اس میں مٹھائی نہیں ہے۔ میں اسے آپ کے پاس رکھنے کے لیئے لایا ہوں کیونکہ سلمیٰ میری چھوٹی بہن اس میں سے چیزیں نکال لیتی ہے" یہ کہہ کر اُس نے خود ہی وہ ڈبا لیلیٰ کے ہاتھ میں دے کر اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔

لیلیٰ نے لاپروائی سے ڈبے کا ڈھکنا اُٹھایا جس میں مختلف اقسام کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ سگریٹ کے ڈبوں کی چند تصویریں۔ دو تین خالی کارتوس، ایک چھوٹی سی خوبصورت قینچی، چاقو کا ایک پھل فرانسیسی عطر کی ایک خالی شیشی اور شکستہ آئینہ کا ایک ٹکڑا اُس کی کل کائنات تھی۔ اپنے بیش قیمت خزانے کو محفوظ ہاتھوں میں دیکھ کر خالد مسکرایا اور گھر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ چند لمحے بعد اُس کے متبسم ہونٹوں سے "خدا حافظ" نکلا۔

"خدا حافظ" لیلیٰ نے اُس کا نام لئے بغیر کہا۔ خالد نے آہنی پھاٹک تک جاتے ہوئے کئی بار مڑ مڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ اس وقت ایک قسم کی شوخی اُس کی آنکھوں اور معصومیّت اُس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی جب وہ دروازہ بند کر کے سڑک پر ہو لیا تو لیلیٰ دوڑ کر اپنے مکان میں گھس گئی اور شیشے کی اوٹ سے اس وقت تک اُسے دیکھتی رہی جب تک وہ ایک موڑ مڑ کر اُس کی نظروں سے غائب نہ ہو گیا۔

چند منٹ تک وہ اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ دراصل ایک قسم کا ہیجان اُس کے قلب مضطر میں برپا تھا اور وہ سمجھ نہ سکتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ وہ بار بار نظریں اٹھا کر سامنے کی سڑک پر کچھ دیکھنا چاہتی تھی مگر اُسے "وہی کچھ" نظر نہ آتا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی وہ اپنی جگہ پر واپس آ گئی اور بیسیوں دفعہ اُس نے ڈبّے کو کھول کھول کر دیکھا لیکن ہر بار دیکھنے کے بعد ایک بار اور دیکھنے کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ پھر اُسے اپنے کمرے میں لا کر ایک الماری میں بند کر دیا۔ کئی ہفتے گزر گئے لیکن خالد نے اُس ڈبّے کا ذکر تک بھی نہ کیا البتہ لیلیٰ کئی بار اُس کی عدم موجودگی میں بھی اُن ناکارہ چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی اور پھر نہایت احتیاط سے انہیں اپنی جگہ پر رکھ دیتی، رکھ دیتی اور سوچتی کہ ان چیزوں اور اس کے مالک کے ساتھ اس بے حد و غایت وابستگی کی کیا وجہ تھی لیکن اس سوال کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا اور اس معمہ کو حل کرنے کے لئے اُس کا دماغ یکسر قاصر تھا۔

ایک دن اپنی خادمہ کو لیلیٰ نے کسی دوسرے ضروری کام کے لئے بھیج دیا تھا اس لئے صبح کی ڈاک خود ڈاک خانہ سے

لینے جا رہی تھی مکان کے باہر اُسے خالد نظر آیا۔ جو بغل میں کتے کا ایک سیاہ بچہ دبائے اُس کی طرف آ رہا تھا لیلیٰ یہ دیکھ کر دوبارہ صحن باغ میں واپس آ گئی اور نہایت اطمینان سے ایک چوبی بنچ پر بیٹھ گئی۔ دوسرے لمحہ میں خالد اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ کتے کو زمین پر رکھ کر وہ کہنے لگا "میں اسے بازار سے اٹھا کر لایا ہوں یہ وہاں چیخ رہا تھا معلوم ہوتا ہے کہ بھوکا ہے۔ لیلیٰ ذرا اسے ہاتھ لگا کر تو دیکھو بھوک نے غریب کی ہڈیاں نکال دی ہیں۔ آہ! یہ چھوٹا سا بچہ، اسے کچھ کھانے کو دینا چاہئے ورنہ یہ مر جائے گا۔

لیلیٰ کو اس قسم کے جانوروں سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ وہ حیران تھی کہ بن غازی کی اس ذلیل ترین مخلوق کے ساتھ کیا سلوک روا رکھے اس وقت وہ اپنی ایک انگلی کے ناخن کو اپنے سفید دانتوں سے کاٹ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ متمدن دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک الگ تھلگ مقام پر بھی اُسے اطمینانِ قلب نصیب نہ تھا۔ اور جس زخم کے اندمال کے لیٔے وہ یہاں آئی تھی اُس میں ناسور پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرا خالد موجود تھا۔ اس وقت بنگلے اور اُس کے مضافات پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری تھا البتہ کبھی کبھی نرم ریت پر کسی کھجور کے گرنے یا نحیف ولاغر کتے کے بھاری سانس کی آواز اس خاموشی کے طلسم کو توڑ دیتی تھی۔ خالد اپنے دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے نہایت حیرت سے لیلیٰ کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ یکایک لیلیٰ نے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اب اُس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ باوجود انتہائی کشمکش کے وہ خالد کی بے لوث و معصوم محبت کے سامنے سرکشی و بغاوت کے تمام ہتھیار ڈال کر ایک فیصلہ کن شکست کا اعتراف کر لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ ایک خفیف سا تبسم اُس کے نازک ہونٹوں پر نمودار ہوا پھر ہاتھ بڑھا کر اُس نے نحیف ولاغر کتے کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

"خالد تم سچ کہتے ہو ہمیں اس کی نگہداشت کرنی چاہئے اور اسے دودھ پلانا چاہئے، ٹھیک ہے نا" پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگی "اچھا بتاؤ اسے کس نام سے پکاریں۔"

"اس کا نام" یہ کہہ کر خالد کچھ سوچنے لگا پھر دفعتہً چلّا اُٹھا "اس کا نام "مقراض" رکھنا چاہئے کیونکہ ابراہیم کے کتے کا بھی یہی نام ہے۔" چنانچہ اس کو دودھ پلایا گیا اور خالد بہت دیر تک اُس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اور لیلیٰ محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں مسرور ہوتی رہی۔ چند ساعتوں تک کھیلنے کے بعد خالد نے لیلیٰ کو مخاطب کر کے کہا "امید ہے کہ آپ اسے یہاں رہنے کی اجازت دیں گی میں اُسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا کیونکہ میری اماں ضرور اسے گھر سے نکال دیں گی۔"

"بے شک میں اسے یہاں رکھوں گی" لیلیٰ نے جواب دیا۔ خالد نے ایک بار اور کتے کے بدن پر شفقت بھرا ہاتھ

پھر اُسی طرح نہایت متانت سے کہنے لگا "خدا حافظ لیلیٰ اب مجھے جانا چاہیئے" اور دوسری طرف دیکھ کر کہنے لگا "خدا حافظ نفرامن"
دسمبر کے آغاز میں یکایک خالد نے لیلیٰ کے مکان پر آنا بند کر دیا اور جب متواتر دو ہفتے تک وہ نہ آیا تو لیلیٰ نہایت متفکر ہوئی۔ گذشتہ چند ماہ کی آمد و رفت اور اپنی معصوم گفتگو سے بھولے بچے نے لیلیٰ کے ساتھ ایک ایسا فطری رشتۂ محبت پیدا کر لیا تھا کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود اُسے دل سے فراموش نہ کر سکتی تھی۔ رات کے ہولناک سکوت اور دن کی خاموشی میں بھی اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خالد کی آواز اُس کے کانوں میں آ رہی ہے اور وہ اسی طرح خرم و دلشاد اُس کی نظروں کے سامنے پھر رہا ہے لیکن یہ واہمہ حقیقت سے ایسا ہی مختلف تھا جیسے سراب چشمۂ شیریں سے۔ شام کا کھانا کھا کر جب وہ پیانو بجاتی اور اُس کی مشاق انگلیاں مختلف پردوں کو دبا کر ایک ساحرانہ نغمہ پیدا کرتیں تو بے ساختہ اُس کے منہ سے عربی زبان کا وہ غم انگیز گیت نکل جاتا جو نوجوان عورتیں فراقِ محبوب میں گایا کرتی ہیں۔ اُسے مختلف ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ خالد بالکل تندرست ہے اور ڈاک کے ہرکارہ نے اُسے متعدد بار لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کا خیال اب یقین کے درجہ تک پہنچ گیا کہ کسی شخص نے اُس کے والدین سے ضرور چغلی کھائی ہے ورنہ خالد اُس سے ناراض نہ تھا۔ کئی دن گزر گئے لیکن خالد نے بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہ کیا اور وہ اسی امید پر ہر روز کھجور کے درختوں تلے پہروں اُس کا انتظار کرتی لیکن بے سود ـــ پھر کسی خیال سے اُس کی پلکیں نمناک ہو جاتیں اور وہ دل ہی دل میں کہتی خدا جانے ظالموں نے معصوم بچے کو کتنا زد و کوب کیا ہوگا۔

دسمبر کے اختتام پر لیلیٰ نے گاؤں میں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اُسے خیال تھا کہ وہ قصبہ کے بچوں کے ساتھ کھیلتا ہوا کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔ اگرچہ لیلیٰ اپنے چند ماہ کے قیام میں کئی بار صدر بازار کی دوکانوں سے ضروریات روزمرہ کی اشیا خریدنے گئی تھی لیکن قصبہ کی تنگ اور غیر مصفا گلیوں میں اُسے جانے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی ایک روز بعد دوپہر وہ اپنے مصری لباس میں گھر سے نکلی اور چاروں طرف بغور دیکھتی ہوئی قصبہ کی طرف چلدی جو اُس کے گھر سے چند سو قدم کے فاصلہ پر تھا۔ دور سے بچوں کا ایک گروہ کھیلتا ہوا اُسے نظر آیا اور وہ اسی طرف قدم بڑھائے چلی گئی لیکن خالد اُن میں نہ تھا پھر وہ گاؤں کی طرف گئی اور ایک معصوم برّے کی طرح جو اپنی ماں سے جدا ہو گیا ہو۔ ڈرتی ہوئی منفعل انداز میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرتی رہی لیکن جس کی اُسے تلاش تھی وہ اب بھی اُس کی نظروں سے پنہاں تھا۔ بالآخر دو گھنٹے کی بے سود جستجو سے دل برداشتہ ہو کر اُس نے مکان پر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک شکست خوردہ قائد کی طرح آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی، سرنگوں کئے دل میں کچھ سوچتی ہوئی اپنے

مکان کے قریب پہنچ گئی۔ اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب احاطہ میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیکھا کہ خالد بالکل خاموش سر جھکائے ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی وہ ہاتھ پھیلا کر اُس کی طرف بڑھی لیکن اُس کے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ نیچے چھوڑ دیئے پھر نہایت متین آواز میں کہنے لگی۔ ”خالد، او ہو! بہت دنوں کے بعد آئے ہو ۔۔۔ کیا تمہارے باپ نے تمہیں پیٹا تھا؟“

خالد نے شرم سے گردن جھکالی اور اعتراف کے طور پر دوبارہ اپنا سر ہلایا۔

”اور پھر تم نے اُس سے اقرار کیا تھا نا کہ تم یہاں نہیں آؤ گے؟“

”بیشک میں نے یہی کہا تھا“ خالد نے ندامت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

”ایسا وعدہ کرنے کے باوجود تم پھر یہاں آگئے ہو“ لیلیٰ نے کہا اور خالد حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا کیونکہ اُس کے نزدیک لیلیٰ نے آج تک اس سے زیادہ جاہلانہ سوال کبھی نہ کیا تھا۔ دوسرے لمحہ میں لیلیٰ کے منہ سے نکلا ”کس نے تمہارے والدین سے یہاں آنے کے متعلق کہا تھا؟“

”ولادہ نے“ خالد نے جواب دیا ”وہ ہماری خادمہ ہے اُس نے ایک دن آپکے مکان سے مجھے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا“

اُس وقت لیلیٰ کے دل میں ولادہ اور خالد کے والدین کے خلاف غصہ و نفرت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا جنہوں نے محض اپنی حماقت اور غیر صحیح اطلاعات کی بنا پر ایک بے گناہ بچے کو جسمانی سزا دی تھی۔ اپنے مشتعل جذبات کو وہ خالد پر ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی اور غیض و غضب کی حالت میں اپنے ہاتھوں کی گرم مٹھیاں زور سے بند کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ اپنے مکان کے اندر چلی گئی اور خالد کا بکس جس میں اُس کی نایاب اشیاء رکھی تھیں لا کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا خالد نے اُس کا ڈھکنا اُٹھا کر ہر چیز کو غور سے دیکھا پھر اپنی جیب سے ایک سیٹی نکال کر اُس میں رکھ دی۔ اُس کے بعد لیلیٰ نے خادمہ کو ”مفراض“ کے لانے کے لئے کہا۔ خالد اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ ایک کثیف و نحیف پلے کی بجائے ایک صاف ستھرا فربہ اندام کتا اُس کے سامنے موجود تھا۔

خالد نے نہایت شوق سے اُس کے بدن پر ہاتھ پھیرا پھر گود میں اُٹھا کر ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔ لیلیٰ انبساط و مسرت سے تالیاں بجا بجا کر کوئی مصری گیت گا رہی تھی اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اپنے خورد سال دوست کو متنبہ کرتی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ دوڑے ورنہ منہ کے بل گر پڑے گا۔

غروب ہونے والے آفتاب کی کرنیں کھجور کے درختوں کی بلند ٹہنیوں پر ہلکا نارنجی رنگ چھڑک رہی تھیں، اور ایک قسم کی خاموشی عظیم صحرا کی وسعتوں پر چھا رہی تھی۔ خالد کتے کے ساتھ کھیلتا ہوا باغ کے دوسرے حصے میں چلا گیا تھا،

اب اُس کی شیریں آواز لیلیٰ کے کانوں تک پہنچنے سے پیشتر ہی سکوتِ صحرا کے طلسم میں گم ہو جاتی تھیں اس وقت وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ ایک قسم کی خاموشی اور غنودگی کی زندہ لہریں اُس کے اردگرد حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ پھر یہ راحت، اطمینان اور مسرت و سعادت کے حلقے ایک مصفا پانی کے تالاب کے حلقوں کی طرح اُس کی نظروں کے سامنے وسیع سے وسیع تر ہو کر آہستہ آہستہ اُس خیالی دنیا میں گم ہونے لگے جو افق کے عناب زار کے اُس پار واقع تھی۔ اپنے تخیلات میں کھوئی ہوئی نوجوان عورت اتنا محسوس بھی نہ کر سکتی تھی کہ آیا اُس کا ممد حیات تنفس جاری تھا یا بالکل ساکت۔ اتنے میں ایک نوجوان عرب کی آواز نے اُسے چونکا دیا جو اپنی بکریوں کا ریوڑ لئے قصبہ کی طرف شاداں و فرحاں جا رہا تھا اور عشق و شباب کی امنگوں کے ساتھ اپنے میٹھے سروں میں صحرا کا یہ گیت گا رہا تھا "صرف میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا ہے"!!

دفعتاً ایک خیال، دبی ہوئی چنگاری کی طرح اُس کے دل میں چمک اُٹھا اور ہزار کوشش کے باوجود وہ اس تحریک جذبات کو دبا دینے میں ناکام ثابت ہوئی "صرف میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے کہ میرے دل میں کیا ہے" اُس نے کئی بار دہرایا پھر جی ہی جی میں کہنے لگی "آہ! یہ بالکل غلط ہے کیونکہ مجھے کچھ معلوم نہیں" اس وقت چند منٹ پیشتر کے سکون و اطمینان کی بجائے اُس کے دل میں ایک قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اب اُس کے متین و خوبصورت چہرے پر اضمحلال و وحشت کے آثار نمایاں تھے اور اُس کی آنکھیں ذکاوت و دانائی سے چمک رہی تھیں۔ کچھ عرصہ کی ذہنی کشمکش کے بعد وہ اپنے اور خالد کے تعلقات کے متعلق ایک آخری اور ناطق فیصلہ کر چکی تھی لیکن اس فیصلہ کا اطمینانِ قلب کے ساتھ کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور اس فیصلہ سے وہ کسی طرح خوش بھی نہ تھی۔

سورج کے غروب ہوتے ہی جب دسویں رات کا چاند اپنے محرم راز ہم جلیسوں کے جلو میں فلک کے تختِ نیلگوں پر جلوہ فرما ہؤا اور اپنی نورانی کرنوں سے صحرائے اعظم کے بلند و پست کو روشن و منور کرنے لگا تو لیلیٰ اپنی کرسی سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔ خالد کی تھکی ہوئی آواز مکان کے پچھلے حصہ سے آ رہی تھی جہاں لیلیٰ کی خادمہ کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ چند منٹ کے بعد وہ مقراض سمیت لیلیٰ کے سامنے آ گیا اور بے دم ہو کر اُس نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ اگرچہ مغرب کی جانب سے اُس وقت خنک ہوائیں آ رہی تھیں لیکن خالد پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر دوسری کرسی پر رکھ دی اور اپنی آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھ ڈالا۔ ابھی اُس کے حواس بھی درست نہ ہوئے تھے کہ لیلیٰ نے کرخت آواز سے اُسے مخاطب کر کے کہا "خالد — ادھر آؤ"

اس غیر متوقع اندازِ تخاطب نے خالد کو چونکا دیا وہ حیرت زدہ ہو کر لیلیٰ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر نہایت معصومانہ انداز

متانت بھرے انداز سے کہنے لگا "لیلیٰ کیا بات ہے؟"
"کچھ بھی ہو" اُس نے پہلے سے زیادہ غصہ آمیز لہجہ میں کہا "ادھر آؤ اور یہاں کھڑے ہو کر میری بات غور سے سنو"
اس تحکم آمیز آواز سے خرد سال خالد کی روح لرز گئی۔ وہ ایک سائے کی طرح دم بخود ہو کر کرسی سے اُٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا دوسرے لمحہ میں اُس کے منہ سے نکلا "میں سن رہا ہوں ۔۔۔۔۔۔ لیلیٰ تم نے مجھے ڈرا دیا ہے"!
"خالد" لیلیٰ نے جوش اور غصہ میں کہا "تم آئندہ میرے مکان پر مت آنا۔ میں نہیں چاہتی کہ تم یہاں آ کر مجھے پریشان کرنے کے علاوہ میرا وقت ضائع کرو۔ سنا"
اُس وقت تک اُسے خالد کے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرات نہ ہوئی تھی لیکن اب گردن جھکائے بغیر اُس نے اپنے مخاطب کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے رخساروں پر بہنے کے لئے تیار تھے خالد نے محبت بھری نگاہیں لیلیٰ کی طرف اٹھائیں پھر خود بخود مسکرا کر کہنے لگا "لیلیٰ خدا کی قسم تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو کیوں لیلیٰ ٹھیک ہے نا"
لیکن ایک گرجتی ہوئی آواز نے خالد کے رہے سہے ہوش بھی بھلا دیئے "ہرگز نہیں۔ چلے جاؤ اور خبردار جو میرے مکان کے اندر آنے کی جرات بھی کی"
لیلیٰ کی آنکھیں خالد کے سر سے اوپر ہی اوپر گڑ رہی تھیں پھر اُس سے بھی ذرا اونچی کھجور کے درختوں سے گذر کر ایک ٹمٹماتے ستارے کو دیکھنے لگیں جو چاند کی مصفا چاندنی کے سیلاب میں بہا چلا جا رہا تھا۔ اُس وقت ایک جہنم کی آگ تھی جو اُس کے سینے میں دھک رہی تھی جس کا سوز اور تپش اُس کی قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ خالد چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہنے کے بعد دو تین قدم اٹھا کر اُس کے قریب جا کھڑا ہوا پھر اُس نے اپنے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنا سر اُس کے جسم سے لگا دیا۔ لیلیٰ محسوس کر رہی تھی کہ خالد تھر تھر کانپ رہا ہے۔ اگرچہ اُس کی آنکھیں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ جانتی تھی کہ خالد اُس کے منہ کی طرف محبت اور رحم کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ دوسرے لمحہ میں لیلیٰ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر زور سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور سخت ہاتھوں سے اُس کے شانے پکڑ لئے پھر آگے کی طرف دھکیل کر کہنے لگی "بھاگ جاؤ، چلو، چلو۔ چلو، اپنے گھر جاؤ اور خبردار جو پھر اس باغ کے اندر قدم رکھا۔ یاد رکھو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔ چلو، بھاگو۔ بھاگو"
ہلکے قدموں کی چاپ نے لیلیٰ کو بتا دیا کہ اب وہ صحن کے آہنین پھاٹک کی طرف جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ خالد چند قدم چل کر کھڑا ہو جاتا اور غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتا۔ وہ اُس کی سسکیاں بھی سن رہی تھی لیکن پھر بھی اُس نے دور ایک ریت کے ٹیلے پر چمکنے والی روشنی سے آنکھیں نہ ہٹائیں حتیٰ کہ اُس نے لوہے کے

دروازے کو کھلتے ہوئے سن لیا اور پھر ———— بہت انتظار کے بعد اُس کے آہستہ سے بند ہونے کی صدا بھی اُس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ لیلیٰ نے اپنی آنکھیں نیچے جھکالیں لیکن اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ دوڑ کر اپنے مکان میں آگئی اور کھڑکی کے شیشے سے خالد کو سڑک پر جاتے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور وہ سڑک پر کچھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ اسی طرح روتی ہوئی اندھوں کی طرح دیکھتی ٹھوکریں کھاتی اپنی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ مقراض اپنی دُم میں ایک ہلال نما خم پیدا کرکے جذبۂ وفاداری سے اُس کے پاؤں پر اپنا منہ ملنے لگا۔ لیلیٰ کا سانس رک رک کر نکل رہا تھا وہ محسوس کرتی تھی کہ اگر زور زور سے چیخ کر نہ روئے گی تو یقیناً اُس کے تنفس کی آمد و رفت رک جائے گی۔

''اے خدا مجھے ہمت اور حوصلہ دے'' اُس کے منہ سے نکلا اور دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنے چہرے کو چھپا لیا۔

چند منٹ بعد اُس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر اِدھر اُدھر دیکھا چاروں طرف تنہائی اور خاموشی چھا رہی تھی البتہ کبھی کبھی تیز ہوا کا جھونکا فلفل ببول کے درختوں کے پتوں میں سے سرسراتا ہوا نکل جاتا تھا یا مشرق کی جانب سے خانہ بدوش عربوں کے خیموں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی تھی۔ وفورِ جذبات اور ہجومِ خیالات نے اُس سے سوچنے اور سمجھنے کی قوت سلب کر لی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح مقراض کو اپنی گود میں اُٹھا کر لوریاں گنگنانے لگی۔ آنسوؤں کی ایک رو تھی کہ اُس کی خوبصورت آنکھوں سے بہ رہی تھی اور تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اُس کا مشتعل دماغ کسی طرح بھی حالتِ سکون و قرار میں نہ آتا تھا ''خالد —— خالد'' بھرائی ہوئی آواز میں اُس کے منہ سے نکلا اور اپنے بائیں ہاتھ کو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔ ''خالد'' اُس نے ایک دفعہ اور بلند آواز میں کہا۔ آہ! اس نام میں کتنی لطافت اور شیرینی تھی۔ اُس نے پھر چلا کر کہا ''خالد —— خالد'' اور مقراض اُس کی گود سے نکل کر آہستہ آہستہ بھونکنے لگا۔

''لیلیٰ'' ایک ہلکی سی آواز اُس کے کان میں آئی —— اس طرح ڈر کر جس طرح کوئی بچہ متوحش خواب دیکھنے سے جاگ اُٹھتا ہے اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھول لیں۔ چاند کی مدہم روشنی اور آنسوؤں کے غبار میں اُس نے ایک پہچانی ہوئی صورت دیکھی۔ دوبارہ اپنی آنکھیں ملیں، انہیں آستین سے مل کر پھر دیکھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے!!

''لیلیٰ میں پھر آگیا ہوں'' خالد کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچی جو ایک ننھے فرشتے کی طرح بھولا منہ بنائے بے حس و حرکت اُس کے سامنے کھڑا تھا' لیلیٰ میں نے تمہاری آواز سے پہچان لیا ہے کہ تم مجھ سے اب ناراض نہیں ہو'' غم نصیب عورت نے پھر آنکھیں میچ لیں لیکن اُسے باور نہ آتا تھا کہ خالد ہی اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اور اُسی کے خوشنما لبوں سے محبت میں شرابور الفاظ نکل کر اُس کے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ بچے نے اپنے بدن کو اُس کے کاندھے کے

ساتھ لگا دیا۔ لیلیٰ نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور اپنے بائیں ہاتھ کو خالد کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔

"لیلیٰ میں اُس وقت سے یہیں گھوم رہا تھا پھر تم نے مجھے پکارا اور میں آگیا۔ اب میں نہیں روتا میں اپنی ٹوپی لینے آیا ہوں تاکہ اُسے پہن کر گھر جا سکوں لیلیٰ تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟ دیکھو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں" پھر ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھ کر اُس نے اپنے گال کو لیلیٰ کے رخسار کے ساتھ لگا دیا۔

"بس بس" وہ اس طرح آہستہ سے کہنے لگی جیسے کسی تیسرے آدمی کو مخاطب کر رہی تھی "اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی خدا مجھے ہمت دے۔ جو کچھ میں کر سکتی تھی کر دیا اس سے زیادہ میرے بس میں نہیں" اس کے بعد لیلیٰ نے خالد کو اپنی گود میں لے لیا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے جنونِ محبت کا اظہار کرنے لگی کبھی روتی کبھی مسکرا دیتی اور بار بار خالد کے خوبصورت چہرے کو چوم لیتی، اس کے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارتی، جوشِ مسرت میں گاتی اور اُس راحتِ قلبِ حزیں کو سینے سے چمٹا لیتی پھر محسوس کرتی کہ اُس کا کھولنے والا دماغ ایک قسم کی راحت اور ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے اور سیماب دار تڑپنے والا دل موسمِ بہار کی چاندنی راتوں میں نازک شاخوں پر جھولنے والے معطر رنگین گلاب کی طرح آرام و راحت کی حالت میں اونگھ رہا ہے۔

* * * * * * * * * *

اوائل جنوری کی ایک سہانی صبح کو جب مسجدوں کے بلند میناروں سے موذن کی صدا فرزندانِ توحید کو خیر و فلاح کا پیغام دے رہی تھی لیلیٰ بسترِ استراحت سے اُٹھ بیٹھی اور اس سے پیشتر کہ آفتابِ عالمتاب دریچۂ مشرق سے اپنا سر نکالے اُس نے خادمہ کو شیخ اسمٰعیل کے پاس ایک عربی گھوڑا عاریتہً لینے کے لئے بھیج دیا۔ اِس عرصہ میں خود سواری کے فرانسیسی لباس میں ملبوس ہو کر باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اتنے میں گھوڑا آگیا اور وہ سوار ہو کر صحرا کی جانب چلی گئی جہاں ایک چھوٹے سے نخلستان کے قریب خالد صاف ستھرا لباس پہنے ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سوار پہلے سے موجود تھا لیلیٰ کو دیکھتے ہی اس نے مسرت کا ایک نعرہ لگایا پھر دونوں صحرا کے ایک مشہور نخلستان "الاکبر" کی طرف روانہ ہو گئے جو بن غازی سے غالباً تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ ایک گھنٹے کے دلچسپ اور فرحت فزا سفر کے بعد دونوں اُس نہر کے کنارے پہنچ گئے جو اس وسیع شاداب نخلستان کو سیراب کرتی ہوئی شمال مغرب کی جانب چلی گئی تھی۔ دن کے سات بجے ہونگے کھجور کے بلند قامت درختوں کی چوٹیاں آفتاب کی کرنوں میں غسل کر رہی تھیں اور نخلستان پر ایک قسم کا سکوت مزار طاری تھا۔ لیلیٰ نے دونوں گھوڑے کھجور کے ایک گرے ہوئے درخت کے مضبوط تنے کے ساتھ باندھ دیئے اور بادامی رنگ کا چرمی بکس زین سے کھول کر اٹھا لیا۔ مصفا پانی کی نہر بیسیوں بل کھاتی نخلستان کے ہر حصہ سے گزرتی ہوئی اسی طرح گنگناتی، مسرت و شادمانی کے گیت گاتی اپنا سفر طے کئے جاتی تھی۔ لیلیٰ نے ایک کھلی جگہ پر نہر کے کنارے اپنا بکس رکھ دیا اور اپنی بیش قیمت ٹوپی کو سر سے اُتار کر

ایک درخت پر لٹکا دیا۔ خالد بلند آواز میں گاتا اور فرحت و آزادی کے قہقہے لگاتا آہوئے سبک رفتار کی طرح چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ لیلیٰ نے ایک مناسب مقام پر ہری ہری دوب کے اوپر ایک نہایت بیش قیمت چھوٹا سا مخملی قالین بچھا دیا اور خوبصورت چینی کے برتنوں میں اعلیٰ قسم کی مصری اور فرانسیسی مٹھائیاں اور ساحلی مقامات کے خشک پھل رکھ کر انہیں مکھیوں سے بچانے کی خاطر صاف ستھرے سفید رومالوں سے ڈھک دیا۔ اپنے کام سے فراغت پا کر اُس نے نہایت محبت بھرے انداز میں خالد کو پکارا۔

ننھا "صحرائی" ہاتھ میں کھجور کی چھڑی لیے صحرا کے گیت گاتا اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور بچپن کی للچائی ہوئی نگاہوں سے سفید رومالوں سے ڈھکی ہوئی چینی کی رکابیوں میں ابھری ابھری چیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ لیلیٰ نے مادری مہر و محبت سے اُس کی سرخ ٹوپی اُتار کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُس کی ڈھیلی ڈھالی قبا کے بند کھول کر اُسے اتار لیا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی "ہاں خالد یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اپنی اماں سے تم نے کیا کہا تھا؟"

"میں نے کہا تھا کہ میں غمارہ میں عم زاد اسحاق کے پاس دن بسر کرنے جا رہا ہوں" یہ کہہ کر وہ شریر ہنسی ہنسا اور داد خواہ انداز میں لیلیٰ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"بہت خوب" لیلیٰ نے کہا "لیکن خالد جب تمہاری اماں کو اس کی اطلاع ملے گی کہ تم اسحاق کے پاس نہیں گئے تو پھر؟" لیکن خود ہی چند لمحوں کے توقف کے بعد کہنے لگی "خیر کچھ مضائقہ نہیں، اُس وقت وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گی کیونکہ میں ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اُس کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ متانت و ملال کے آثار ہویدا ہونے لگے۔ چند منٹ تک وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ خالد نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ادھر اُدھر ہلانا شروع کیا پھر شوخ اور تحکمانہ لہجہ کے ساتھ چلا اُٹھا "لیلیٰ آؤ نا کھیلیں اور گائیں، مجھے "الحمرا" کا گیت بھی آتا ہے"۔

پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر انسانوں کی طرح نخلستان کے خاموش اور خوبصورت کنجوں میں پھرتے رہے اور نہر کے کنارے ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو کہانیاں سنانے اور محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ دوپہر کے وقت لیلیٰ نے کھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور طشتریوں سے رومال اُٹھا کر انہیں قرینے سے سجا دیا۔ اعلیٰ درجے کے بادامی کیک اور مشہور قہوہ خانوں کی لذیذ مٹھائیاں۔ ہسپانیہ کے قیمتی سیب اور انار، فرانس کا خشک سیاہ انگور، مغربی اطالیہ کی سرخ خوبانیاں اور دیگر نایاب و نادر پھل جنہیں خالد نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا لیلیٰ نے اُس کے کھانے کے لئے ایک ہی دسترخوان پر جمع کر دیئے تھے۔ بھوک سے بیتاب ہو کر خردسال بچے نے ایک طشتری کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن لیلیٰ نے اُس کا ہاتھ روک کر کہا "خالد یوں نہیں پہلے اپنے ہاتھ دھو لو، وہ بکس کے پاس صابن اور تولیہ

رکھا ہے۔ میں اپنے ہاتھ دھو چکی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ خالد بادلِ ناخواستہ اُٹھا اور بڑبڑا کر کہنے لگا "واہ لیلیٰ، تم بھی اماں کی طرح . . . . "

"بس۔ بس زیادہ تقریر کی ضرورت نہیں" اس نے ذرا محبت آمیز سختی کے ساتھ روک کر کہا۔

جی بھر کر کھا لینے کے بعد خالد اور لیلیٰ نے تمام برتن اُٹھا کر نہر کے کنارے رکھ دیئے اُنہیں دھو کر تولیہ سے صاف کیا پھر اُسی طرح اُنہیں قرینے سے بکس میں بند کر دیا خالد کچھ دیر بیٹھا خاموشی سے سوچتا رہا پھر اپنا سر اُٹھا کر کہنے لگا "لیلیٰ تم بہت امیر ہو، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں خالد" لیلیٰ نے سر ہلا کر کہا "اگر تم بھی محنت کے ساتھ پڑھو گے تو ہر روز ایسے کیا بلکہ اس سے بہتر پھل اور مٹھائیاں کھا سکو گے۔"

اس وقت تک دوپہر ڈھل چکی تھی۔ درختوں کی بالائی ٹہنیوں پر سورج کی چمکدار کرنوں نے نور برسا رکھا تھا لیکن نخلستان کی سرسبز زمین پر کچھ کچھ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ شیریں و مصفا پانی کی نہر اب بھی اُسی سلاست و روانی سے بہے چلی جاتی تھی اور درختوں کی اوٹ سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آ رہی تھی۔ لیلیٰ نے خالد کی فرمائش پر عربی زبان کا ایک مشہور گیت گایا اور اس دلی شوق و انہماک کے ساتھ گایا کہ اُسے اپنے ہی تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ جب وہ گیت ختم کر چکی تو دیکھا کہ خالد قالین پر پڑا سو رہا ہے۔ اور کھجور کے جھکے ہوئے درخت، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سحر کار نغموں کی آخری تان کو ابھی تک کان لگائے سن رہے ہیں جو نخلستاں کے تاریک کنجوں اور پانی کی روانی کے شور میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہی تھی۔ لیلیٰ خراماں خراماں ٹہلتی اپنے گھوڑوں کی طرف آئی، انہیں کھول کر پانی پلایا پھر اُن کے منہ پر محبت بھرا ہاتھ پھیر کر اُس نے صحرا کی طرف دیکھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا البتہ ڈوبتے ہوئے سورج کا رنگیں طلسم اُسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور اُسی کی سرخ کرنوں میں گم ہو کر وہ راحتِ ابدی کے فردوس میں پہنچ جانا چاہتی تھی۔

پھر وہ ٹہلتی ہوئی درختوں تلے واپس آ گئی جہاں نرم و نازک قالین پر خالد ابھی تک آرام کی نیند سو رہا تھا "خالد خالد، اٹھو، اب ہمیں گھر چلنا چاہیئے، دیکھو رات ہوا چاہتی ہے" لیلیٰ نے کہا۔ خالد ایک انگڑائی لے کر اُٹھا اور لیلیٰ نے قالین کو تہ کر کے بکس میں بند کر دیا۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر وہ بن غازی کی طرف چل دیئے اور چاند کے طلوع ہونے تک وہ قصبہ کے قریب پہنچ گئے۔ مسجدوں کے بلند مینار اب صاف دکھائی دیتے تھے اور دوسری طرف ریت کے ٹیلوں کی خوبصورت چوٹیاں اونٹ کے کوہان کی طرح ابھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ قصبہ کے زیادہ

قریب پہنچ گئے۔ چاندنی میں مساجد کے بلند میناروں کا سایہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریت کے فرش پر بڑے بڑے سیاہ سانپ رینگ رہے ہیں۔ خانہ بدوش عربوں کے خیموں سے دو سو قدم کے فاصلہ پر دونوں نے اپنے گھوڑے روک لئے۔ "خالد" لیلیٰ نے آہستہ سے کہا "اس مقام پر ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں جہاں کوئی غماز آنکھ ہمیں نہیں دیکھ سکتی" یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خالد کے قریب آکر اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ دو تین مرتبہ جھک کر اُس کا منہ چوما پھر خدا حافظ کہتی ہوئی اشک آلود آنکھوں کے ساتھ گھوڑے کو مہمیز لگا کر آن کی آن میں اُس کی نظروں سے غائب ہوگئی۔

دوسرے دن لیلیٰ غسل اور ناشتہ سے فارغ ہوکر اپنے اخبارات دیکھ رہی تھی کہ شیخ اسمٰعیل مالک مکان کرایہ لینے کے لئے اُس کے پاس آیا وہ اپنا حساب لے کر اُٹھا تو محض خبر سنانے کی خاطر کہنے لگا کہ کل رات شیخ عمر بن حلمی کا لڑکا خالد جب عمارہ سے واپس آرہا تھا تو خانہ بدوش قبائل کے کتوں کے بھونکنے سے اُس کا گھوڑا اتنا بھڑکا کہ چھوٹے بچے کو اس کی پشت پر اپنا توازن قائم رکھنا مشکل ہوگیا چنانچہ مشتعل جانور نے امام یحییٰ کی مسجد کی پختہ دیوار کے ساتھ اس زور سے اُسے دے مارا کہ لڑکے کا سر پاش پاش ہوگیا۔ لیلیٰ نے نہایت رنج واندوہ کے ساتھ اس خبر کو سنا اور معًا خالد کی بھولی بھالی تصویر اُس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔ چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد لیلیٰ نے اپنا سر اٹھایا اور درد وکرب سے لبریز آواز میں کہنے لگی "اور اب اُس کا کیا حال ہے؟"

"اب اُس کا کیا حال ہے؟" شیخ اسمٰعیل نے لیلیٰ کے استفسار کو انہیں الفاظ میں دہرایا پھر تردد آمیز لہجہ میں کہنے لگا "لڑکے کی زندگی خطرہ میں ہے۔ اُس کا اتنا خون ضائع ہوچکا ہے کہ اب اُس کا زندہ رہنا امر محال معلوم ہوتا ہے۔ معصوم بچہ ہسپتال میں پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ افوہ! اُس کی ماں ...... خدا اُس کو صبر کی توفیق دے ..."

لیلیٰ نے یہ سُن کر اپنا سر جھکا لیا اور اسمٰعیل نے اپنے گھر کی راہ لی۔ کوئی پندرہ منٹ تک لیلیٰ اپنے خیالات میں غرق کچھ سوچتی رہی پھر اپنا فرانسیسی لباس پہن کر ہسپتال کی طرف چل دی جہاں برآمدے میں دس بارہ عرب مغموم، سر جھکائے، آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ لیلیٰ ایک ولایتی نرس کے توسط سے ڈاکٹر کے پاس پہنچادی گئی اور چند منٹوں میں خالد کی خطرناک حالت کے متعلق اُسے اچھی طرح واقف کر دیا گیا۔

"لیکن ڈاکٹر" لیلیٰ نے فرانسیسی زبان میں کہا "کیا اس کے زندہ بچ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی؟"

"صرف ایک صورت ہے" ڈاکٹر کے منہ سے نکلا اور لیلیٰ کے چہرے پر رونق کے آثار نمودار ہونے لگے "لڑکے کا بہت خون ضائع ہوچکا ہے اگر کوئی شخص اپنا خون اُسے دے سکے تو اس کے زندہ بچ رہنے کا گمان ہوسکتا ہے

ڈاکٹر کی اتنی گفتگو سے لیلیٰ معاملے کی نزاکت کو سمجھ گئی اور سر جھکائے چند لمحوں تک خاموش کچھ سوچتی رہی پھر یکایک سر اُٹھا کر کہنے لگی "کیا آپ نے اُس کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے دریافت کر لیا ہے؟"

"آپ کے آنے سے بہت دیر پیشتر" ڈاکٹر نے ذرا عجلت سے جواب دیا "اس میں کوئی کلام نہیں کہ اخراج وادخالِ خون کا یہ طریقہ خطرناک ہے اور اس لئے اُس کے وارثوں میں سے کسی نے خود کو اس کام کے لئے پیش نہیں کیا۔ لڑکے کا باپ ادھیڑ عمر کا ہے، وہ اپنے بدن سے اتنا خون دے دینے کے بعد بمشکل زندہ رہ سکتا ہے"۔

لیلیٰ نے ایک بار پھر ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگی "کیا میں لڑکے کو دیکھ سکتی ہوں؟"

"کیوں نہیں" ڈاکٹر نے کہا اور وہ لیلیٰ کو لے کر ہسپتال کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ لوہے کے ایک سفید رنگ پلنگ پر خالد بے ہوش پڑا تھا اور اُس کے سر پر خون میں بھیگی ہوئی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ننھے سے خوبصورت چہرے پر موت کی زردی چھا رہی تھی اور ایک فرانسیسی نرس اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ چلنے والی نبض کا جائزہ لے رہی تھی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے خالد کی نبض دیکھی پھر نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا "بس اس کا وقت قریب ہے، یہ بچہ ایک گھنٹہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا"۔

لیلیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خالد کی پیاری پیاری باتیں اُسے سب یاد آگئیں پھر اپنے بازو کو ایک دو دفعہ ٹٹول کر جوش بھری آواز میں کہنے لگی "ڈاکٹر، میں اس بچے کو اپنا خون دینے کے لئے تیار ہوں"۔

"لیکن یہ عمل ایک حد تک خطرناک ہے آپ کو اس بات کا ضرور خیال کر لینا چاہئے" ڈاکٹر نے ہمدردانہ طور پر کہا۔

"کچھ مضائقہ نہیں" لیلیٰ نے مردانہ ثبات و استقلال سے جواب دیا "آپ اپنا کام جلد شروع کر دیں"۔

ڈاکٹر نے نرس کو ضروری احکام دے کر خالد کو "اپریشن روم" میں لے جانے کے لئے کہا اور خود ایک معاون ڈاکٹر کی مدد سے آلاتِ جراحی کے درست کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کوئی نصف گھنٹے کے عرصہ میں خالد اور لیلیٰ سنگِ مرمر کی میزوں پر پاس پاس لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے احتیاطی پٹیاں کس کر لیلیٰ کے دائیں بازو کی فصد کھول دی، اب ایک نلکی کے ذریعے سے گرم گرم خون لیلیٰ کے بدن سے نکل کر خالد کے بدن میں داخل ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بتدریج، جوں جوں خالد کے بدن میں خون داخل ہو رہا تھا اُس کے چہرے پر سرخی آ رہی تھی اور لیلیٰ کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی۔ تجربہ کار ڈاکٹر کا کمال تھا کہ لیلیٰ کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ کر رہی تھی البتہ ایک قسم کی کمزوری اور نقاہتِ لازمی کا اثر سے

ضرور محسوس ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد لیلیٰ پر ایک قسم کی بیہوشی طاری ہونے لگی۔ ڈاکٹر نے اپنے معاون کی طرف اشارہ کیا جس نے نہایت احتیاط سے نلکی کو خالد کے بدن سے علیحدہ کر دیا۔ دونوں ڈاکٹروں نے مسرت بھری نظریں تبادلہ کیں، عمل جراحی نہایت کامیاب رہا تھا۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد جب خالد بالکل تندرست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹر نے اس کی نادر اشیا کا بکس اور ایک سیاہ کتا اُس کی نذر کیا۔ دونوں چیزیں لے کر وہ گھر آ گیا لیکن اپنے محسن دوست سے ملنے کے لئے اُس کا دل ہر لحظہ بے قرار ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ علی الصباح والدین کی اطلاع کے بغیر لیلیٰ کے مکان کی طرف چل دیا۔ احاطہ کا بیرونی دروازہ کھلا تھا لیکن صحن میں نہ تو کرسیاں رکھی تھیں نہ لیلیٰ وہاں موجود تھی وہ قدم بڑھاتے مکان کے برآمدے کے پاس آ گیا لیکن دروازہ بند تھا۔ خالد نے آہستہ آہستہ اُسے کھٹکھٹانا شروع کیا، کوئی جواب نہ تھا اور کوئی صدا نہ تھی۔ پھر وہ وہاں سے نکل کر باہر کی کھڑکی کے پاس آ گیا اور پاؤں کی انگلیوں کے بل کھڑا ہو کر اندر جھانکنے لگا کمرہ بالکل خالی تھا البتہ دھوپ کی شعاعیں اُس کے فرش اور نصف دیواروں تک اپنا نور بکھیر رہی تھیں۔

”لیلیٰ . . . . لیلیٰ . . . . لیلیٰ“ اُس نے بلند آواز میں پکارا پھر وہاں سے دوسرے برآمدے کی طرف چلا گیا جس کے باہر عربی اور فرانسیسی حروف کا ایک بورڈ لٹک رہا تھا ”کرایہ کا فیصلہ شیخ اسمٰعیل سے ہو سکتا ہے“ اس نے پھر ایک دفعہ پکار کر کہا ”لیلیٰ —— لیلیٰ“ لیکن کھجور کے پتوں کے ہلنے کی صدا کے سوا اور کوئی آواز اُس کے کانوں تک نہ پہنچی۔ وہاں سے ہٹ کر وہ باورچی خانہ کی طرف چلا گیا لیکن اُس کا دروازہ بھی بند تھا۔ لیلیٰ کی یاد سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ برآمدے کے فرش پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کسی کے الطافِ عمیم کی یاد محبت کی ناکامیوں سے کتنی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ایامِ رفتہ کی دلچسپ صحبتوں کے مزے کچھ ایسا ہلکا سا نشان اُس کے حافظہ میں چھوڑ گئے تھے جس طرح گزشتہ موسمِ بہار کے مرجھائے ہوئے پھولوں سے ہلکی ہلکی سرخی اور دھیمی دھیمی خوشبو اُس کی رنگینیاں اور تعطر تو یاد دلا دیتی ہیں لیکن اُس کا صحیح تصور قوتِ باصرہ اور حسِ شامہ کو محسوس نہیں ہو سکتا۔ خالد گردن جھکائے کچھ سوچ رہا تھا اور پرانی باتوں کو بار بار اپنی آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کر رہا تھا . . . . اس وقت درحقیقت وہ ایک ایسے عزیز اور بے غرض دوست کی دائمی مفارقت کا ماتم کر رہا تھا جو اُس کے تصور و خیال سے بھی زیادہ وفادار تھا۔

(مختار)

محمد ضیاء الدین شمسی

التجائے محبّت

مُجھ کو نہ چھوڑ اے سحرِ تماشا ظالم، ظالم یہ کیسا دھوکا

اس کی بھی کُچھ تجھ کو خبر ہے کس مشکل میں دِل مضطر ہے

کیا تو مجھ کو چھوڑ سکے گا؟ رشتہ، الفت توڑ سکے گا؟

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

تجھ کو مری الفت کی قسم ہے جس کا عوض یہ رنج والم ہے

تجھ کو قسم ہے اپنی وفا کی جس نے مجھ سے آہ دغا کی

تجھ کو قسم میری مشکل کی تیرے تغافل کے حاصل کی

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

ظالم ساحر مجھ کو نہ چھوڑ

برنز

منصُور

سہیلی

شیلی نے سچ کہا ہے کہ حسب منشا شادی ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک نئی دنیا کا دروازہ ہے جس میں نئی نئی خوشیاں اور نئے نئے مشغلے پیدا ہو جاتے ہیں" چنانچہ چندرا کے ساتھ میرے حسب منشا شادی ہو جانے کے بعد میری زندگی بھی خوشیوں کا مرکز بن گئی۔ میں میرٹھ میں ملازم تھا، وہیں میری شادی ہوئی۔ مجھ میں اور چندرا میں صرف دو سال کا چھوٹا پڑا پایا تھا۔ پریم کے نشہ میں سرشار ہم دونوں دو جان ایک قالب تمام دنیا کے جھگڑوں اور غموں سے آزاد تھے۔

پھاگن کا مہینہ اور شام کا وقت تھا۔ چندرا گھر کے کام کاج میں مشغول تھی اور میں بالاخانہ پر بیٹھا ہوا پورنماشی کے چندرماں کی ہلکی ہلکی نور برسانے والی فرحت بخش چاندنی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ کیسا عجیب و غریب شاعرانہ نظارہ تھا آسمان اور زمین کے حسن کا ملاپ ہو رہا تھا۔ خوشنما ستارے، خوبصورت چاند، غرض کہ اس خوبصورت موسم بسنت میں قدرت کی ہر ایک چیز دلفریبی کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ مجھے تمام سنسار پریم رس میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرے مکان سے کچھ دور چاند کی تھرکتی ہوئی روشنی میں بے چین کوئل کوک رہی تھی۔ میرے دل میں نئے نئے جذبات اُٹھ رہے تھے۔ ٹھیک اُسی وقت میری چندرا نرم و نازک شانوں پر بالوں کی لٹیں چھٹکاتے ہوئے میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ مجھے عالم خیال میں ایسا معلوم ہوا گویا چندرماں زمین پر اتر آئے ہیں۔ میں نے چونک کر کہا کون! چندرا ——— یہ کہہ کر میں چندرا کو جو پیکر انسانی میں آسمانی حور تھی محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے دل میں سوچا کہ چاند کو چندرا سے کیا نسبت۔ آسمانی چاند میں تو داغ ہے لیکن چندرا کا حسن تو ظاہر و باطن میں یکساں ہے۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہے۔ میں نے چندرا کا نازک ہاتھ تھام کر اُسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ہم کو اس طرح یکجا دیکھ کر چمکنے والے شوخ ستارے آپس میں آنکھیں مٹکانے لگے۔ چندرا میری محویت کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی "پریتم کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا "پریتما تم کو دل ہی دل میں یاد کر رہا تھا"

چندرا نے شرما کر سر جھکا لیا اور میرے ہاتھوں کو پیار سے دباتے ہوئے کہنے لگی "اپنی داسی کو تم اتنا زیادہ نہ یاد کیا کرو کیونکہ ——— "

"کیونکہ ——— چندرا تم چپ کیوں ہو گئیں تم کیا کہنا چاہتی ہو تمہیں میرے سر کی قسم۔ صاف صاف کہو"

"کچھ نہیں"

"میں مان نہیں سکتا ضرور کوئی بات ہے، تم کو بتانا پڑے گا۔"

چندرا نے مجبوراً اپنا جملہ یوں پورا کیا "کیونکہ زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑ جانے کا ڈر رہتا ہے"

میں نے چندرا کا مطلب سمجھ لیا اور کہا "لیکن میری محبت کی مٹھاس میں کیڑے نہیں پڑ سکتے۔ تمہارے پریم کا نگینہ میرے دل کی انگوٹھی میں نہایت خوبصورتی اور مضبوطی سے جڑا ہوا ہے اُس کا تعلق کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ چندرا شاید تم کو میرے دل کی محبت کا اندازہ نہیں ہے۔ چندرا تمہارے دل میں ایسا خیال کیوں آیا۔ کیا تمہیں میری محبت پر اعتبار نہیں ہے"

"اعتبار کیوں نہیں ہے۔ میں نے تو یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی اور تم نے نہ معلوم اس کا کیا مطلب سمجھ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم سا سوامی پاکر میں خود کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ تمہاری روز افزوں محبت کو دیکھ دیکھ کر میرے دل میں پریم اور آنند کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں" اتنا کہہ کر چندرا نے ایک عجیب انداز سے میری آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "مجھے تو تمہاری ان جادو بھری آنکھوں سے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں یہ اپنی نگاہوں کے جادو اثر تیروں سے کسی اور کا دل بھی زخمی نہ کر دیں"۔

میں نے ہنس کر جواب دیا "چندرا اس وقت تمہارا خیال کدھر ہے۔ میری نگاہوں میں تو تمہاری موہنی صورت بسی ہوئی ہے اس میں کوئی دوسرا کیسے سما سکتا ہے۔ میں تو جدھر نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تمہاری صورت دکھائی دیتی ہے۔ مجھ پر آج یہ بلا وجہ الزام کیسا ——"

"واہ تم تو مذاق کی باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہو" یہ کہہ کر چندرا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس دلچسپ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

(۲)

ہمارے دن اسی طرح ہنسی خوشی میں گزر رہے تھے کہ یکایک میرا تبادلہ میرٹھ سے راولپنڈی کو ہو گیا۔ چندرا بھی میرے ساتھ گئی۔ راولپنڈی میں ہمارے دفتر کے ایک بابو بھولا ناتھ تھے اُن کی مہربانی اور کوشش سے مجھے ایک اچھا مکان مل گیا جو بابو صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا اور عورتوں کی آمد و رفت کے لئے دونوں مکانوں کے درمیان ایک کھڑکی تھی۔ بابو بھولا ناتھ کی عمر قریباً ۴۵ برس کی ہو گی اس عمر میں انہوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑی کا نام ممتا اور چھوٹی کا سوج مکھی تھا جب ان دونوں لڑکیوں کی ماں مر گئی تو انہوں نے دوسری شادی اپنے سے ایک نیچ ذات عورت تلسی سے کی۔ تلسی سے بھی اُن کے ۵ لڑکے اور ۵ لڑکیاں ہوئیں۔ بابو جی بہت نیک

اور شریف تھے لیکن برخلاف اس کے تلسی بڑی جھگڑالو، جاہل اور بدتہذیب تھی جس سے بابوجی کا ناک میں دم رہتا تھا۔ بابوجی تعلیمِ نسواں کے بڑے حامی تھے یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ممتا اور سورج مکھی کو انگریزی تعلیم دلائی۔ میں جب راولپنڈی پہنچا ہوں اُس وقت ممتا کی عمر اٹھارہ اور سورج مکھی کی سولہ سال کی تھی اور دونوں نے انٹرنس پاس کر لیا تھا لیکن اس وقت تک دونوں کنواری تھیں۔ بابوجی چونکہ آزاد خیال تھے اُن کے یہاں پردہ کا بھی بہت زیادہ رواج نہیں تھا جب ہم لوگ دفتر میں ہوتے تو بابوجی کی یہ دونوں جوان لڑکیاں میرے یہاں آ جاتیں اور چندرا سے بات چیت کیا کرتیں۔ چندرا نے کسی سکول میں تعلیم نہیں پائی تھی پھر بھی اُس نے گھر ہی پر کافی اردو اور ہندی پڑھ لی تھی۔ انگریزی سے بھی کچھ واقف تھی تعلیم یافتہ اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے بابوجی کی لڑکیاں چندرا سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں لیکن چندرا اور تلسی میں زیادہ میل جول نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ چندرا اور ممتا میں بہت زیادہ تعلقات بڑھ گئے اس کا اثر یہ ہُوا کہ سورج مکھی نے چندرا سے ملنا کم کر دیا جس سے ممتا اور چندرا کی محبت میں اور زیادہ ترقی ہوگئی ایک دن سہ پہر کو جب میں اپنے دفتر سے واپس آ کر اپنے مکان میں داخل ہُوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چندرا کسی نوجوان لڑکی سے صحن میں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہے میں جلدی سے الٹے پاؤں واپس ہُوا۔ اندر سے دروازے میں زنجیر نہیں لگی تھی اس وجہ سے میں مکان میں بے دھڑک داخل ہوگیا تھا اگر مجھے پہلے سے یہ معلوم ہوتا کہ چندرا کسی پردہ نشین سے باتیں کر رہی ہے تو میں ہرگز ایسی جرأت نہ کرتا۔ مجھے چندرا پر غصہ آ رہا تھا کہ اُس نے اندر سے زنجیر کیوں نہیں لگا رکھی تھی۔ چندرا نے مجھے واپس ہوتے دیکھ لیا تب شاید اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہُوا۔ میں اپنے گھر سے نکلا ہی تھا کہ چندرا نے آواز دی "اندر چلے آؤ اب کوئی نہیں ہے"

میں نے سمجھ لیا کہ بابو صبولا ناتھ کے یہاں کی کوئی لڑکی آئی ہوگی جو اب کھڑکی کی راہ سے اپنے گھر چلی گئی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ بابوجی کی ایک لڑکی کا سامنا ہُوا گو میں اُس کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ میری طرف اُس کی پشت تھی۔ میں نے اپنے کمرہ میں پہنچ کر چندرا سے دریافت کیا "چندرا تم کس سے باتیں کر رہی تھیں"

"اپنی ایک سہیلی سے"

"کون سہیلی"

"تم کو اس سے کیا غرض ہے میں نام نہیں بتاتی"

"اچھا سرکار نام نہ بتاؤ مجھے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن آئندہ سے اس بات کا خیال رکھنا کہ جب تمہاری کوئی سہیلی تم سے ملنے آیا کرے تو اندر سے دروازہ بند کر لیا کرو —— آج تمہاری بیوقوفی سے مجھے بڑی ندامت

ہوئی ہے۔"

"میں تمہاری اِس ندامت پر قربان جاؤں۔ اس مرتبہ میری غلطی معاف کردو آیندہ ایسا کبھی نہ ہوگا"

اس گفتگو کے بعد چند منٹ تک سکوت رہا۔ چندرا نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "کیا مجھ سے خفا ہوگئے؟ اچھا لو میں اپنی پیاری سہیلی کا نام بتائے دیتی ہوں۔ اُس کا نام ممتا ہے۔ بابو جی کی سب سے بڑی لڑکی یہی ہے بڑی ملنسار اور نیک ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے جس وقت وہ میرے پاس آتی ہے میں سب کام بھول جاتی ہوں یہی سبب ہے کہ آج وہ آئی تو میں اُس کی پیاری باتوں میں اتنی محو ہوگئی کہ دروازہ بند کرنا بھی بھول گئی"

میں نے ہنس کر کہا "کہیں اُس کے پیچھے مجھے بھی نہ بھول جانا"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ ممتا میری سہیلی ہے اور تم تو میرے سوامی ہو" یہ کہہ کر چندرا میرے لئے کھانا لانے چلی گئی

(۳)

حسن میں ممتا اور سورج مکھی برابر تھیں۔ دونوں قبول صورت تھیں لیکن اُن کی سیرت میں بڑا فرق تھا۔ ممتا نازک اندام چنچل ذہین اور نفاست پسند تھی لیکن سورج مکھی بے ڈول۔ بدتمیز۔ کند ذہن اور پھوہڑ تھی مختلف مزاج ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں کبھی نہیں بنتی تھی حقیقی بہن ہوکر بھی دونوں آپس میں لڑا کرتی تھیں تلسی ہمیشہ سورج مکھی کا ساتھ دیتی اُس کی خاص وجہ یہ تھی کہ سورج مکھی تلسی کا کام دل وجان سے کرتی۔ جھاڑو دیتی۔ کھانا پکاتی اور اپنے سوتیلے بھائیوں اور بہنوں کے میلے کچیلے کپڑے دھوتی۔ لیکن نازک مزاج اور صفائی پسند ممتا کو ان کاموں سے سخت نفرت تھی۔ پڑھنے، لکھنے، سینے پرونے کے سوا اور کوئی کام کرنا وہ ناپسند کرتی تھی۔ انہیں باتوں کے سبب تلسی سورج مکھی کی بہت خاطر کرتی لیکن ممتا سے ظاہر میں نہیں تو باطن میں ضرور بہت ناخوش رہتی تھی اور ممتا کو جلانے کے لئے اُس نے سورج مکھی کو سر چڑھا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ بابو بھولا ناتھ سورج مکھی سے زیادہ ممتا کو چاہتے تھے۔ ممتا کی ذہانت اور قابلیت پر وہ عاشق تھے۔ وہ ممتا کی کسی قسم کی شکایت سننا پسند نہ کرتے تھے اس سے تلسی اور سورج مکھی دل ہی دل میں جلا کرتیں اور ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہتیں کہ کسی طرح ممتا کو بابو جی کی نگاہوں میں ذلیل کریں۔

جب بدطینت سورج مکھی نے دیکھا کہ ممتا اور چندرا میں بہت میل جول ہے تو وہ آتش حسد سے جل گئی اور بدمزاج تلسی سے چندرا اور ممتا کے خلاف جھوٹی شکایتیں شروع کردیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلسی بھی چندرا سے ناراض ہوگئی لیکن اس پر بھی چندرا اور ممتا کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ ضد میں آکر ممتا نے میرے گھر میں آمد و رفت اور بھی

زیادہ کردی۔ اگر پہلے دن بھر میں وہ ایک مرتبہ آتی تھی تو اب کئی مرتبہ آنے لگی جب مجھے یہ سب حال چندرا کی زبانی معلوم ہوا تو میں نے ایک دن اُس سے کہا " چندرا تم ممتا سے محبت کم کردو یا سورج مکھی سے بھی دوستی پیدا کرو ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

" یہ عجیب بات ہے کہ جب میں اپنی کسی سہیلی سے زیادہ الفت کا اظہار کرتی ہوں تو تم کو رشک معلوم ہوتا ہے "

" چندرا یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممتا کے والدین اس بات کو کبھی پسند نہ کریں گے کہ تم ممتا سے تو گھل مل کر باتیں کرو لیکن سورج مکھی سے دور رہا کو "

" پران ناتھ دل پر کسی کا اختیار نہیں ہے میرا دل ممتا سے مل گیا ہے لیکن سورج مکھی سے نہیں ملا اب اس کو میں کیا کروں۔ ممتا مجھے ہمیشہ خلوصِ دل سے ملتی ہے لیکن سورج مکھی مجھ سے زمانہ سازی کی باتیں کرتی ہے۔ ممتا کو اُس کی سوتیلی ماں بہت تکلیف دیتی ہے۔ سورج مکھی بھی اس کی دشمن ہے اگر میں بھی ممتا سے قطعِ تعلق کرلوں تو اُس کو کتنا صدمہ ہوگا۔ جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ تلسی سورج مکھی کی تو قدر کرتی ہے لیکن ممتا کو خواہ مخواہ دق کرتی رہتی ہے تو مجھے سخت قلق ہوتا ہے " یہ کہتے ہوئے چندرا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کو دیکھ کر میرا دل بیتاب ہوگیا میں نے زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس دن سے میرے دل میں ممتا کی طرف ہمدردی پیدا ہوگئی۔

ممتا ہمارے یہاں برابر آتی جاتی رہی ایک دن اتفاقاً میرا اور اُس کا سامنا ہوگیا لیکن اس دن ممتا نے خلافِ معمول مجھ سے پردہ نہیں کیا میں باہر سے آکر اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن وہ چندرا کے پاس برآمدہ میں بیٹھی رہی چندرا نے مجھ سے کہا " ممتا کہتی ہے کہ میں جیجا سے اب کبھی پردہ نہ کروں گی " ممتا مجھے جیجا کہتی تھی۔ چندرا سے میں نے گھبرا کر کہا " یہ تو اچھی بات نہیں ہے اگر بابو بھولا ناتھ کو معلوم ہوگیا کہ ممتا مجھ سے پردہ نہیں کرتی تو وہ ناراض ہونگے۔

قبل اس کے کہ چندرا کوئی جواب دے ممتا نے بہت آہستہ سے کہا " بابوجی مجھ سے کچھ نہ کہیں گے۔ جیجا ڈرتے کیوں ہیں پردہ تو غیروں سے کیا جاتا ہے اپنوں سے پردہ کرنا بالکل فضول ہے "

ممتا کے الفاظ اور دلکش آواز کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ " ممتا مجھ پر اتنا اعتبار کرتی ہے۔ وہ مجھے غیر نہیں سمجھتی " یہ خیال کرکے مجھے دلی مسرت ہوئی میں نے یونہی ہنس کر کہا " تو میں بابوجی سے کہہ دوں گا "

ممتا نے جواب دیا " کیا پروا ہے "

(۴)

اُس دن سے ممتا نے مجھ سے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ پھر بھی میں نے اُس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کی جب کبھی میرا اور ممتا کا سامنا بھی ہوتا تو میں آنکھیں نیچی کرلیتا۔ جب کبھی وہ مجھ سے کچھ پوچھتی تو میں کوئی جواب نہ دیتا۔ ممتا

نے ایک دن چندرا سے شکایت کی "جیجا مجھ سے دُور دُور کیوں رہتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے ناراض ہیں اگر اُن کو میرا یہاں آنا برا معلوم ہوتا ہے تو صاف صاف بتا دیں میں کبھی نہ آوٗں گی"

چندرا نے جواب دیا "بہن تم میرے یہاں شوق سے آؤ تمہارے آنے سے میری عزت ہے۔ تمہارے جیجا تم سے ناراض نہیں ہیں بلکہ وہ تمہاری بڑی قدر کرتے ہیں تم اُن کی عادت سے واقف نہیں ہو اصل بات یہ ہے کہ وہ بڑے شرمیلے ہیں تم کسی بات کا خیال نہ کرو دیکھو میں ابھی اُن سے تمہاری بات کہتی ہوں"

میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا چندرا نے مجھ سے آکر کہا "ہاں جی یہ کیا بات ہے ممتا تو تم لوگوں پر جان دیتی ہے لیکن تم اس سے اچھی طرح سے بولتے بھی نہیں۔ ممتا میری سہیلی ہے اس سے بات کرنے میں تم کو کیوں شرم معلوم ہوتی ہے ——" میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ ممتا آگئی اور میں خاموش ہو گیا۔ ممتا نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "تم چپ کیوں ہو گئے میں چلی جاتی ہوں شوق سے جیجی سے باتیں کرو" یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگی چندرا نے کہا "ممتا! ٹھہر جاؤ تمہیں میری قسم ادھر آؤ ایک بات سنتی جاؤ" چندرا نے مجھ سے بھی چپکے سے کہا "ذرا تم بھی تو بلاؤ۔ نہیں تو میری سہیلی کو بڑا رنج ہوگا"

میں نے چندرا کی کبھی دل شکنی نہیں کی تھی میری زبان سے بیساختہ نکل گیا "ممتا! ادھر آؤ"

ممتا کے قدم رک گئے۔ وہ چندرا کے پاس آکر بیٹھ گئی اور مجھ سے ہنس کر کہنے لگی "اخاہ! آج جیجا کی زبان کیسے کھل گئی"

میں نے جواب دیا "تو کیا تم مجھے گونگا سمجھتی تھیں"

ممتا نے کہا "جی ہاں"

اس کے بعد بھی دو چار مہینے تک میں نے انتہائی تحمل و ضبط سے کام لیا اور کبھی ممتا کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھا گو چندرا کے اصرار اور ممتا کی خاطر میرا دل بہت چاہتا تھا کہ اُسے دیکھوں اور پھر دیکھوں لیکن میرا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے میرے استقلال اور میرے شریفانہ جذبات کی سراسر توہین ہوگی۔ میری ضد تریا ہٹ، بالک ہٹ یا راج ہٹ کی طرح نہ تھی بلکہ بالکل مختلف تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ میری یہ ناپائدار ضد کب تک قائم رہے گی چنانچہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں صحن میں بیٹھا ہوا تھا اور چندرا رسوئی میں کھانا پکا رہی تھی، ممتا میرے یہاں آگئی میری نظر یکبارگی اُس کے چہرہ پر پڑی تو اُس کی متین آنکھیں شرم سے جھک گئیں لیکن اُس کی نگاہوں میں کچھ ایسی زبردست قوت جاذبہ تھی جس نے میری رگ رگ کو رگوں سے کھینچ لیا ممتا کی جوانی کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا اُس کا شگفتہ چہرہ سرخ سرخ ہونٹ

چمکتے ہوئے خوبصورت رخسارے دیکھ کر میں بے خود ہوگیا۔ ممتا سے میری گھبراہٹ پوشیدہ نہ رہ سکی اُس نے پھر مجھ پر تیرِ نگاہ سے حملہ کیا اور کہا "دیدی جی کہاں ہیں"

میں کھویا ہؤا سا تھا۔ مجھ سے یارائے گفتگو سلب ہوچکا تھا۔ میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن زبان ہچکولے کھانے لگی میں نے انگلی سے رسوئی کی طرف اشارہ کر دیا۔

ممتا نہ معلوم کیوں اِس وقت چندرا کے پاس نہ گئی بلکہ اپنے گھر واپس جانے لگی اور مجھ سے بولی "دیدی جی کھانا پکا رہی ہیں اس وقت ان کو فرصت نہیں ہے میں پھر کسی وقت آؤں گی" یہ کہہ کر اُس نے میری طرف ایک کاغذ کا پرزہ پھینکا اور مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی غائب ہوگئی —— آہ ممتا کی ان سمٹی ہوئی نگاہوں میں میرے لئے جادو کی سی کشش تھی —— اُن میں میرے لئے دعوت کا ایک پُرجوش پیغام بھرا ہؤا تھا —— اُس کا دلفریب حسن میری آنکھوں کو بہت پیارا معلوم ہؤا اور نہ معلوم کیوں دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا گویا ممتا ایک خوش رنگ ناگن تھی جسے دیکھ کر آنکھیں تو خوش ہوگئیں لیکن دل خوف سے سمٹ گیا۔ ممتا کے جانے کے بعد میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کے پرزہ کو اُٹھایا اُس میں لکھا تھا:-

"—— بیشک تم شریف ہو۔ نیکی تم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے لیکن پریم جو انسانی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے وہ تم میں نام کو نہیں۔ میں تو تمہارے پریم کی پیاسی ہوں۔ ایسا پریم جو پاکیزہ ہو جذبات نفسانی سے پاک ہو پاکیزہ دل پارہ کی مانند ہوتا ہے جو کبھی خراب نہیں ہوتا اور کوئی چیز اُس کی صفائی یا پاکیزگی کو مکدر نہیں کر سکتی اگر تمہارے پاک و صاف دل میں میری طرف سے ذرا سا بھی پریم پیدا ہو گا تو تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ ایسے پریم کا مرکز ایشور ہے۔

تمہاری سہیلی —— "

آگ پر گھی جو کچھ کرتا ہے وہی ممتا کے اس مختصر محبت نامہ نے کیا میرے دل میں محبت کے جذبات امنڈ آئے میں نے سوچا "ممتا نے مجھے سہیلی لکھا ہے تاکہ اگر کوئی خط کو دیکھ بھی لے تو یہ نہ سمجھ سکے کہ کسی مرد کو لکھا گیا ہے۔ وہ کتنی عقلمند اور خوبصورت ہے" لیکن میرے ضمیر نے کہا کہ خبردار اس دھوکے میں نہ آنا سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے اتنا ہی وہ زہریلا بھی ہوتا ہے مگر نفس میرے ضمیر پر غالب آیا اُس نے سمجھایا کہ "کوئی پروا نہ کرو ممتا محبت کے لائق ہے۔ وہ علمی لیاقت اور حسن و جمال کی دیوی ہے اُس نے خود محبت کی درخواست کی ہے اس میں تمہارا کوئی نقصان نہ ہوگا تمہارا ضمیر اب بھی پاک ہے تم ایشور کے سامنے اب بھی بے گناہ ہو" اس استدلال نے میرے دل کو تسلی دی۔ گو میں نے ممتا کے

خط کا کوئی جواب نہ دیا پھر بھی اُس کی محبت نے میرے دل میں جگہ پیدا کر لی —— لیکن آہ چندرا کے ہوتے ہوئے ممتا سے محبت کرنے کا مجھے کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ بھی ایک طرح کا گناہ تھا مگر افسوس میں اُس وقت یہ بات نہ سمجھ سکا تعلیم یافتہ مہذب اور نیک چلن ہوتے ہوئے بھی میں نے دھوکا کھایا کیونکہ میں نوجوان تھا میرے پہلو میں ناتجربہ کار دل تھا۔ انسان تھا اور انسان بھی خطاؤں سے مرکب۔ ممتا کی جوانی کا بھی ولولہ خیز زمانہ تھا اُس کا جوبن اس وقت ساون بھادوں کی گنگا کی طرح دونوں کناروں کو غرق کرنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ محبت کی خاموش چنگاری جواب تک میرے دل میں سلگ رہی تھی دفعتاً بھڑک اُٹھی اور میرا غرور خاک میں مل گیا۔

(۵)

قاعدہ ہے کہ مجرم کا دل، گنہ گار کا ضمیر ملامت کرتا ہے میرے قلب کی بھی یہی حالت ہوئی جب میں اپنی محبت کی دیوی چندرا سے باتیں کرتا تو میں محسوس کرتا کہ میں چندرا کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میرا دل شرم اور نفرت سے چور چور ہو جاتا اُس وقت یہی جی چاہتا کہ ممتا کا سب حال چندرا سے کہہ دوں۔ ممتا کا خط اُسے دکھا دوں اور اپنی غلطی کی معافی مانگ لوں لیکن میرا دل کمزور تھا مجھے چندرا کے سامنے اعترافِ گناہ کی جرأت نہ ہوتی اور میں اس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا۔ میری حالت میں حیرت انگیز تغیر پیدا ہو گیا۔ جس طرح پورنماشی کی چاندنی رات اماوس کے آتے ہی تاریک ہو جاتی ہے اسی طرح میرے پاک و صاف دل پر نفس کا قبضہ ہو جانے سے میری زندگی کا خوشنما حصہ ایسی حالت میں تبدیل ہو گیا جس میں سوائے پریشانی اور غم کے اور کچھ نہ تھا۔

چندرا نے کئی مرتبہ مجھ سے میری پریشانی کی وجہ بھی دریافت کی لیکن میں نے کوئی نہ کوئی جھوٹا بہانہ کر کے اُسے مطمئن کر دیا کبھی دردِ سر کا بہانہ کر دیتا تو کبھی زکام کی شکایت کرتا۔ بھولی بھالی چندرا میری باتوں میں آجاتی وہ مجھے دیوتا سمجھتی تھی اُسے کیا معلوم تھا کہ میں بے وفا اور گنہگار ہوں۔

عورت میں ضبط و تحمل کی بہت طاقت ہوتی ہے اور وہ مرد کی بہ نسبت اپنے جذبات کو دبا لینے پر زیادہ قادر ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ مجھے ممتا سے ہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ جوانی نے اُس کو محبت کے جال میں پھنسا دیا تھا پھر بھی اُس نے رازِ محبت کو افشا نہ ہونے دیا اُس نے میرے یہاں آمد و رفت کم کر دی یہ میرے لئے بہت اچھا ہوا اگر کبھی وہ میری موجودگی میں آبھی جاتی تو میں کسی نہ کسی بہانے سے گھر سے باہر نکل جاتا مگر ممتا مجھ سے غیر ملتفت نہ تھی وہ چھپ چھپ کر مجھے دردیدہ نظروں سے تاکا کرتی۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے لیکن محبت کی قیامت خیز موجوں کا تلاطم کم نہ ہوا کوشش کرنے پر بھی ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے دلوں سے محو نہ کر سکے۔ میں نے کئی مرتبہ مکان تبدیل کرنے

کا ارادہ کیا لیکن چندرا راضی نہ ہوئی وہ اپنی سہیلی ممتا کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ مکان تبدیل کرنے سے میں ممتا سے دور ہوجاؤں گی" میرے دل میں چور تھا میں اُسے کیسے سمجھاتا کہ جس کو وہ اپنی پیاری سہیلی سمجھتی ہے وہ اُس کے راہ میں کانٹے بو رہی ہے۔

چندرا میری حالت سے بے خبر سہاگ کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی کہ یکایک وہ بیمار ہوگئی۔ اس سے میری پریشانیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ گھر کا تمام کام مجھے خود ہی کرنا پڑتا۔ چندرا اپنے کمرہ میں چپ چاپ پڑی رہتی ڈاکٹر نے چلنے پھرنے کی ممانعت کردی تھی۔ چندرا کی بیماری میں ممتا کی آمد و رفت پھر زیادہ ہوگئی جب وہ اپنے گھر سے فرصت پاتی تو چندرا کی مزاج پرسی کے لئے خود آتی اور اُس کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتوں سے دل بہلایا کرتی سوج کھمی اور تلسی کو تو ممتا اور چندرا سے ایک قسم کی ضد تھی وہ میرے یہاں بہت کم آتی تھیں اس وجہ سے ممتا میرے یہاں آکر بالکل آزاد ہوجاتی جب کبھی وہ مجھے کوئی کام کرتے دیکھتی تو وہ خود کرنے لگتی۔ کبھی کبھی میرے لئے ناشتہ بنا دیتی مجھے معلوم بھی نہ ہوتا اور وہ مجھے دفتر جانے کے لئے پان بنا دیتی۔ ان باتوں سے میرے دل میں ممتا کی قدر اور عزت اور بڑھ گئی۔

بدباطن سوج کھمی تو ممتا کی دشمن تھی ہی جب اُس نے دیکھا کہ ممتا کی آمد و رفت میرے یہاں پر پھر بہت زیادہ ہوگئی ہے تو اُس نے اور تلسی نے مل کر بابو بھولا ناتھ سے شکایت کردی کہ "چندرا کے پتی سے ممتا ہنسی مذاق کرتی ہے" حالانکہ سراسر بہتان تھا۔ بابو بھولا ناتھ ممتا کو بہت پیار کرتے تھے ممتا کے خلاف اتنا بڑا الزام سن کر انہیں سخت صدمہ ہُوا اور انہوں نے ممتا کا میرے یہاں آنا جانا بند کردیا۔ انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے بابو صاحب نے اپنی بدنامی کا تو خیال کیا لیکن یہ نہ ہُوا کہ ممتا کی شادی کا انتظام کر دیتے تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنی تعلیم یافتہ کنواری لڑکی کی طرف سے مطمئن ہوجاتے۔

نصیحت یا روک ٹوک آتش محبت کو اور بھڑکاتی ہے ممتا جو اس وقت تک اپنی طبیعت کو سنبھالے ہوئے تھی جس نے اب تک انتہائی صبر و ضبط سے کام لیا تھا جھوٹی شکایت سے آگ بگولا ہوگئی۔ انسان غصہ اور ضد میں اندھا ہوجاتا ہے ایسی حالت میں اگر ممتا جس نے بچپن ہی سے آزادی کا سبق پایا تھا کوئی ایسا فعل کرنے کے لئے تیار ہوگئی جو اُسے ہرگز نہیں کرنا چاہیئے تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں اُس کا الزام اس کے ماں باپ پر ہے جنہوں نے اُسے غلط راہ پر چلنے کی جرات دلائی اور وقت پر اُس کا بیاہ نہ کیا۔

(۶)

اماوس کی اندھیری رات تھی آج چندرا کی طبیعت اچھی تھی وہ سرِ شام ہی سوگئی تھی لمپ گل کر دیا گیا اور کمرہ میں

تاریکی چھائی ہوئی تھی ۱۰ بج چکے تھے لیکن میری آنکھوں میں نیند نہ تھی میں کوئی کتاب پڑھنا چاہتا تھا مگر خیال آیا کہ لمپ کے جلانے سے کہیں چندرا کی نیند نہ اچٹ جائے، یہ سوچ کر میں آہستہ سے اٹھا اور لمپ اور دیا سلائی لے کر ایک دوسرے کمرہ میں چلا گیا اور وہیں لمپ کو روشن کر کے ایک کتاب پڑھنے لگا۔ یکایک مجھے کچھ آہٹ معلوم ہوئی میں نے کتاب سے نظر ہٹا کر جو غور سے دیکھا تو سامنے ممتا کو کھڑے پایا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی اُس کے سرخ رخساروں پر بالوں کے گچھے متوالے بھونروں کی طرح لہرا رہے تھے سینہ پر کھلی ہوئی لٹیں ادھر اُدھر اپنا جال پھیلائے ہوئے تھیں اور وہ اپنے لوک پرلوک کا خیال چھوڑے ہوئے میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی ایسے ناوقت ممتا کو اپنے کمرہ میں تنہا دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن لب کھل کر رہ گئے کیونکہ ممتا کے رخساروں کا لطیف عکس جو لمپ کی روشنی پڑنے سے پیدا ہو گیا تھا میری آنکھوں میں ایک ایسے دلفریب انداز سے ناچا کہ اُس نے مجھے مست و بیخود بنا دیا۔ لیکن میں نے بہت جلد اپنی طبیعت کو سنبھالا میرے چنتا ساگر میں پریاگ راج کی تربینی کی لہریں اُٹھنے لگیں ـــــــ گنگا جمنا اور سرسوتی تینوں دریاؤں کا سنگم ہو گیا ـــــــ ایک طرف دل میں ممتا کی محبت کی آگ بھڑکنے لگی ـــــــ دوسری طرف چندرا کا خیال آگیا ـــــــ تیسری طرف انجام اور بدنامی کی فکر ہوئی ـــــــ میں نے دل ہی دل میں چندرا اور ممتا کی محبت کا مقابلہ کیا ـــــــ ممتا کی محبت ایک طوفان خیز سمندر کے مانند تھی جس میں لہریں تو بہت زور شور کے ساتھ اُٹھتی ہیں لیکن اُن کا نظارہ بھیانک ہوتا ہے ـــــــ چندرا کی محبت ایک صاف و شفاف دریا تھی جس کی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی مستانہ چال نہایت دلکش اور نظر فریب ہوتی ہے سر جھکائے میں اس قسم کی باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ ممتا نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ لمبی سانس میرے کلیجہ کو چیر گئی میری للچائی ہوئی نگاہیں ممتا کے خوبصورت چہرے پر پڑیں، چند منٹ تک ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے دونوں کے دلوں سے ایک آہِ سرد نکل گئی ممتا کی پرشوق اور محبت آمیز آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا ضبط پاش پاش ہو گیا میرے بدن میں ایک سنسنی محسوس ہونے لگی ممتا تھر تھر کانپنے لگی ـــــــ میں فرشتہ نہیں تھا۔ زاہد نہیں تھا۔ سنیاسی نہیں تھا ایک ضعیف العقل انسان تھا ـــــــ ممتا ایک ناتجربہ کار لڑکی تھی اُس کی چڑھتی جوانی تھی۔ ایسی حالت میں اگر نفس کا تازیانہ ہم دونوں کو کشاں کشاں پاپ ساگر میں لے جاتا تو کوئی تعجب نہ تھا ـــــــ لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا بھگوان نے ہم دونوں کو بچا لیا۔ جس طرح سے انہوں نے دروپدی کو دشٹ دوشاسن کے ہاتھوں سے بچا لیا تھا جس طرح سے اُنھوں نے سانپ کا روپ دھارن کر کے دمینتی کو بچا لیا تھا بس اسی طرح چندرا کے ذریعہ سے بھگوان نے ہم دونوں کی حفاظت کی ـــــــ جانبین سے ہاتھ بڑھنے ہی والے تھے کہ چندرا کمرہ میں داخل ہوئی گویا کوئی آسمانی دیوی

ہمیں باپ سے بچانے کے لئے آگئی۔ میرا سر ندامت سے نیچا ہوگیا مجھے اُس دن کی بات یاد آگئی جب میں نے چندرا سے کہا تھا کہ "میری نگاہوں میں تو تمہاری موہنی صورت بسی ہوئی ہے اس میں کوئی دوسرا کیسے سما سکتا ہے" میں شرم سے پانی پانی ہوگیا ممتا نے کمرے سے نکل جانا چاہا لیکن زمین نے اُس کے قدم تھام لئے۔

چندرا کے چہرہ پر نورانی جمال تھا اور آنکھوں میں رحم۔ رقابت یا ملامت کا کوئی نشان بھی نہ تھا وہ تھوڑی دیر تک ہم دونوں کو رحم بھری نظروں سے دیکھتی رہی میری اور ممتا کے ندامت آمیز انکسار نے اور کچھ اُس جوشِ عفو نے جو ایسی حالت میں دل پر طاری ہو جاتا ہے چندرا کو پگھلا دیا اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور مجھ سے رقت آمیز لہجہ میں بولی "پران ناتھ! میں اپنی اس مداخلت کی معافی چاہتی ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں۔ سنو مجھے تمہارا حال آج سے نہیں بلکہ عرصہ سے معلوم ہوگیا تھا بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ تمہارے قلب کی حرکت سے بھی خبردار ہوگئی تھی ــــ تم مجھ سے دور دور کیوں رہتے تھے یہ بھی جان گئی تھی۔ محبت کی علامتیں چھپ نہیں سکتیں۔ اور کسی سے پوشیدہ بھی ہو جائیں لیکن بیوی سے پوشیدہ نہیں ہوسکتیں۔ مجھے پہلے ہی سے سب کچھ معلوم ہوچکا تھا مگر میں جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی تاکہ تمہارا دل نہ دکھے لیکن آج تم کو ایک خطرناک راستہ اختیار کرتے ہوئے دیکھ کر میں خاموش نہ رہ سکی۔ عورتوں کا دل بہت کمزور ہوتا ہے میں نے بہت ضبط کرنا چاہا لیکن ضبط نہ کرسکی اور یہاں چلی آئی تم مجھے معاف کردو مجھے سب کچھ منظور ہے لیکن تمہاری بدنامی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگی میں تمہیں نصیحت نہیں کرتی داسی اپنے سوامی کو نصیحت نہیں کرسکتی نتیجہ کا خیال کرلو اور پھر جو تمہارا جی چاہے کرو ــــ پریتم تم میرے دیوتا ہو تم میری دنیا ہو ــ تم میری عاقبت ہو ــ تم میرے آرام ہو ــ چین ہو۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے تم مجھ سے کیوں شرماتے ہو۔ میں تمہیں خوشی سے اجازت دیتی ہوں کہ تم میری پیاری سہیلی سے بیاہ کرلو لیکن گناہ کا راستہ نہ اختیار کرو اس میں تمہاری اور میری پیاری سہیلی دونوں کی رسوائی ہوگی ــــ میرے لئے تم کوئی فکر نہ کرو۔ مجھے تو تمہاری من موہنی پیاری صورت میں سب کچھ ہے دنیا کے تمام سکھوں کا احساس مجھے اس کے درشنوں سے ہوتا ہے بس اُس سے مجھے کبھی نہ محروم کرنا یہی میری خواہش ہے" چندرا دلی تاثر کے جوش سے بجز اس کے کہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اوپر کی طرف دیکھنے لگی اور کچھ نہ کہہ سکی اُس کی آواز بند ہوگئی اور فرطِ جوش سے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔

ممتا جو اس وقت تک حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی یکایک چندرا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی اور بولی "بہن معاف کرو۔ ہاتھ جوڑتی ہوں معاف کرو میں نے تم کو دھوکا دیا میں نے تمہارے شوہر کو تم سے چھیننے کی کوشش

کی لیکن میں سچے دل سے اقرار کرتی ہوں کہ اب مجھے کوئی خواہش نہیں تمہارا شوہر تم کو مبارک رہے۔ تم نے اپنی پاکیزہ اور نصیحت آمیز باتوں سے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا تم نے مجھے پاپ سے بچا لیا۔ بھگوان تم کو ہمیشہ خوش رکھیں ــــ میں اپنی خطا پر نادم ہوں شرمسار ہوں کیا تم اس پاپن کو معاف نہ کرو گی" ممتا کے اعترافِ گناہ نے اُس کے ندامت آمیز الفاظ نے چندرا پر بہت اثر کیا وہ ممتا کو گلے لگا کر رونے لگی ــــ ان پاک آنسوؤں سے دونوں کے دل صاف ہو گئے ــــ آہ عورت کا دل بھی کیسی عجیب چیز ہے جس میں غصّہ کا قیام زیادہ دیر تک نہیں ہوتا۔

جب ممتا رو دھو کر چلی گئی تو میری بار آئی۔ جب ہم سے کوئی ایسا فعل ہو جاتا ہے جس پر ہم خود نادم ہوں تو دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ میری پیاری چندرا کے دل میں میری طرف سے کوئی غبار نہ تھا اور اگر رہا بھی ہوگا تو اب میرے اشکِ ندامت سے دھل چکا تھا۔ میں شرماتا ہوا اُٹھا۔ چندرا آگے بڑھی اور ہم دونوں بغل گیر ہو گئے چندرا نے مجھے زور سے دبا لیا گویا اُسے کوئی کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی ــــ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور معصوم خوشی میں محو ہو گئی اس وقت میں نے اُس کے طلائی رخساروں پر دائمی محبت کی مہر ثبت کر دی ــــ شیطان کرے سے باہر کفِ افسوس مل رہا تھا اور آسمانی راج پر بسنے والی پاک روحیں ہم پر خوشی اور مسرت کے پھول برسا رہی تھیں۔

دوسرے دن صبح اُٹھتے ہی میں نے اپنا مکان تبدیل کر دیا چندرا نے بہت کہا کہ "مکان نہ چھوڑو مجھے تم پر اعتبار ہے" لیکن میں نے یہ کہہ کر اُسے خاموش کر دیا کہ "مجھے خود اپنے اوپر اعتبار نہیں ہے"

ممتا سے میرے تعلقات منقطع تو ہو گئے لیکن اس سے ہماری زندگیاں اطمینان اور مسرت کی روشنی سے منور ہو گئیں۔

اعظم کُریوی

دنیا

نقش بر روئے آب ہے دنیا
چشمِ بیدار! خواب ہے دنیا

مختصر ہے فسانۂ ہستی!
اک ورق کی کتاب ہے دنیا

مدد اے پردہ دارِ بزمِ شہود
شاہدِ بے نقاب ہے دنیا

ہر حکایت ہے جس کی شورش خیز
اُس گلستاں کا باب ہے دنیا

سرد بازارئ تمنا حیف!
مثلِ جوشِ شباب ہے دنیا

ہم نوائے خامشی معلوم!
لفظِ کُن کا جواب ہے دنیا

کھا نہ جائے کہیں نگاہ فریب
اے مسافر سراب ہے دنیا

کیسی بے اعتبار ہے دنیا
گویا فصلِ بہار ہے دنیا

رنگِ الفت نہ جس میں بوئے وفا
کیسے پھولوں کا ہار ہے دنیا

نیش ہی نیش اس کے نوش میں ہے
سر بسر خار زار ہے دنیا

جس سے چکرا گئے تھے مستِ الست
اُسی مے کا خمار ہے دنیا

کون ہے محوِ خویشتن بینی؟
کس کی آئینہ دار ہے دنیا

گل و سنبل سے واسطہ اس کو؟
وقفِ دود و شرار ہے دنیا

کچھ نہیں جز ہوائے بربادی
دشتِ ہُو کا غبار ہے دنیا

محشرستانِ جبر ہے انساں
فتنۂ اختیار ہے دنیا

تپش

فطرت وقوّتِ نفس

نفس حیاتِ انسانی کا مالکِ مطلق ہے۔ حالات کی تخلیق وتشکیل کا اختیار اسی کو حاصل ہے اور وہی اپنے اعمال کے نتائج کا مرجع ہے۔ وہ اپنے اندر بہ یک وقت باطل سے دھوکا کھا جانے اور حقیقت کو پہچان لینے کی دونوں قوتیں رکھتا ہے

نفس قسمت کا جامہ باف ہے، خیال اُس کا دھاگا ہے نیک وبد اعمال تانا بانا ہیں اور زندگی کی کارگہ پر جو کپڑا بنا جاتا ہے وہ سیرت ہے۔ نفس اپنے آپ کو اپنی ہی بنی ہوئی پوشاک پہناتا ہے۔

انسان کو نفس پر تمام قوتیں عطا کی گئی ہیں اور نیک وبد کے انتخاب میں اُسے ایک غیر محدود اختیار دے دیا گیا ہے وہ تجربہ سے سیکھتا ہے اور وہ اپنے تجربہ کو گھٹا اور بڑھا سکتا ہے۔ اُسے کسی امر میں پابندی کی مجبوری نہیں۔ مگر وہ اپنے آپ کو بہت سے امور میں پابند بنا لیتا ہے اور جس طرح وہ اپنے آپ کو پابند بنا لیتا ہے اُسی طرح وہ جب چاہے اپنے آپ کو آزاد بھی کر سکتا ہے۔ وہ نیک یا بد، شریف یا غیر شریف، عقلمند یا بیوقوف جو چاہے بن سکتا ہے۔ کسی چیز کی مزاولت سے وہ اُس کو عادت بنا سکتا ہے اور پھر اپنی کوشش سے وہ اُس عادت کو ترک بھی کر سکتا ہے وہ اپنے سامنے باطل کی ایک دیوار تعمیر کر کے حق کو کلیتًا اپنی نظروں سے چھپا سکتا ہے اور پھر وہ اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجا کر حق کو دوبارہ بے نقاب کر سکتا ہے۔ اُس کے اختیارات غیر محدود ہیں اور آزادی کامل ہے۔

اپنے حالات کا پیدا کرنا نفس کی اپنی قدرت میں ہے اور جن کیفیات میں وہ رہنا چاہتا ہے اُن کا منتخب کرنا بھی اُسی پر منحصر ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ وہ کسی حالت کو بدل ڈالے یا کسی کیفیت سے نکل جائے اور اسی پر ہر وقت اور ہر لحہ اُس کا عمل ہوتا ہے جب وہ اپنے بڑھتے ہوئے تجربہ اور انتخاب در انتخاب کے ساتھ ایک حالت کے بعد دوسری حالت کا علم حاصل کرتا ہے۔

انسان کی سیرت اور زندگی اُس کے خیالات کے سانچے میں ڈھلتی ہے اور وہ اپنی قوتِ ارادی اور اپنی کوشش سے ان خیالات کو تبدیل کر سکتا ہے۔ عادت کمزوری اور گناہ کی بندشیں خود ساختہ ہوتی ہیں اور خود ہی یہ بندشیں توڑی بھی جا سکتی ہیں اُن کا وجود نفس کے بغیر اور کہیں نہیں ہوتا، اور گو وہ خارجی امور سے بلا واسطہ تعلق رکھتی ہیں لیکن اُن کا حقیقی وجود اُن خارجی امور میں نہیں ہوتا۔ رغبت کسی بیرونی شے میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس چیز کے لئے

نفس کی خواہشات میں پیدا ہوتی ہے۔ نہ غم اور کلفت خارجی امور اور حادثات میں موجود ہوتے ہیں بلکہ وہ اُس ناتربیت یافتہ انداز میں پوشیدہ ہوتے ہیں جو نفس ان امور و حادثات کے متعلق اختیار کرتا ہے وہ نفس جس کی تہذیب پاکیزگی اور جس کی حفاظت عقل و دانش سے ہوئی ہو تمام اُس ہوا و ہوس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو آفت و مصیبت کا جزوِ لاینفک ہے، اور اس طرح امن و عافیت کی اقلیم میں پہنچ جاتا ہے۔

دوسروں کو بُرا سمجھتے ہوئے قابلِ ملامت ٹھیرانا اور خارجی حالات کو برائی کا منبع قرار دینا دنیا کی کلفت اور بدامنی کو گھٹاتا نہیں بلکہ بڑھاتا ہے۔ جو کچھ [illegible] ہے وہ اندر ہی کا عکس اور اثر ہے اور جب دل پاک و صاف ہو جاتا ہے تو تمام بیرونی چیزیں بھی پاک و صاف ہو جاتی ہیں۔

تمام نشو و نما اور تمام زندگی کا رخ اندر سے باہر کی طرف ہے اور تمام انحطاط اور موت کا رخ باہر سے اندر کی طرف ہے۔ یہ ایک عالمگیر قانون ہے۔ تمام ارتقا نفس ہی سے شروع ہوتا ہے اور تمام اصلاح نفس ہی کی ہونی چاہیے وہ جو لوگوں کی مخالفت سے باز آتا ہے اور اپنی قوتوں کو اپنے ہی نفس کی اصلاح، تہذیب اور تربیت میں مصروف کر دیتا ہے، اپنی طاقتوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی ذات کو بدی سے بچاتا ہے اور جب وہ اپنے قلب کو مطمئن بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اپنی فیاضی اور مروّت سے اوروں کو بھی اس سعادت کی طرف لے جاتا ہے، کیونکہ امن اور بصیرت کا راستہ یہ نہیں کہ دوسروں کے قلوب پر حکومت اور قیادت حاصل کی جائے بلکہ اپنے ہی قلب کی حکومت سے اور اپنے ہی نفس کی قیادت سے نیکی کے رفیع و بلند مقامات حاصل ہو سکتے ہیں۔

ہر انسان کی زندگی کی ابتدا اُس کے قلب سے، اُس کے نفس سے ہوتی ہے وہ اس نفس کو اپنے خیالات اور اپنے افعال سے ترکیب دیتا ہے اور یہ اُس کی طاقت میں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو بدل کر اپنے قلب کو بھی بدل ڈالے اور قلب کو بدل کر وہ اپنی زندگی کو بھی بدل سکتا ہے۔

"ایلین"   منصور احمد

ہمارا ہر خیال، اچھا ہو یا برا، مادہ اور جسم کا جامہ پہنتا رہتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ایک حقیقت بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

ہم وہ ہیں جو ہم اپنے آپ کو بناتے ہیں، ہم وہ نہیں جو حالات ہمیں بناتے ہیں۔

کوئے

محفلِ ادب

اردو یا پنجابی؟

اردو کی قدامت | ہم اُردو کے آغاز کو شاہجہان یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن یہ زبان اُس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں! اردو کی قدامت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ گجرات و دکن میں اس زبان میں دسویں صدی ہجری کی ابتدا یعنی بابر کی آمد کے قبل سے، ادبیات کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے اور فارسی لغات کی شہادت سے جو نویں صدی ہجری میں ہندوستان میں لکھی جاتی ہیں، صاف واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان ان ایام میں، تمام اسلامی ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی۔ یہ لغات نگار اس کو ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ہندی سے اُن کا مقصد یہی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں ——— !

بھاشا کا تعلق اردو سے | ہم اردو کو برج بھاشا کی بیٹی سمجھتے رہے ہیں! لیکن جب ان دونوں زبانوں کی صرف ونحو اور دوسرے خط وخال اور خصائص پر غور کیا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے راستے مختلف ہیں! اردو جہاں اپنے اسماء و افعال کو الف پر ختم کرتی ہے برج واو پر ختم کرتی ہے۔ برج میں جمع کا طریقہ بہت سادہ اور سہل ہے لیکن اردو میں بہت پیچیدہ ہے اردو میں مرکب افعال کا مع توابعات کے بہت رواج ہے۔ بھاشا میں یہ بات موجود نہیں ہے اس لئے اردو کو بھاشا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں ہے بلکہ بہنوں بہنوں کا ——— !

اُردو کا ارتقا کس زبان سے ہؤا | کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اردو شاخیں ہیں قدیم پراکت سوراسینی کی یادگار ہے!

لیکن جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے بلکہ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ ہمیں تحقیق معلوم نہیں کہ جب مسلمان دہلی میں آباد ہوئے اس وقت اس علاقہ میں کیا زبان بولی جاتی تھی؟ آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہوتا ہے اور گریرسن نے تو صاف دہلی کو ہریانوی زبان کے علاقہ میں شامل کردیا ہے مگر راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہی اردو ہے جو گیارھویں صدی ہجری میں خود دہلی

میں بھی بولی جاتی تھی ۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے ۔ اگر ہم اس کو اردو نہ مانیں تو اردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہئے بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے ۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت دہلی کی زبان | اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کونسی زبان بولی جاتی تھی ؟ یا وہ راجستھانی ہوگی یا برج ! اس میں شک نہیں کہ آج دہلی میرٹھ مظفر نگر، سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا ! مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہانپور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ) باوجودیکہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے ۔ علی ہذا، مخدوم بہاءالدین برناوی، برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں ۔ لیکن اُن کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی ۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کردیا ۔ جس طرح ہریانہ کے علاقہ سے ـــــــ !

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہئے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو "دہلوی" لکھتے ہیں ۔ ابوالفضل بھی آئینِ اکبری میں اس کو "دہلوی کے نام سے یاد کرتا ہے ! اب شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ) بھی اس کو "دہلوی" کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً اردو ہے ـــــــ !

اُردو دہلی میں کس طرح پہنچتی ہے ؟ کیا پنجاب سے | اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی میں جاتی ہے ۔ اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کرکے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں !

اس نظریہ کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں لیکن سیاسی واقعات اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں ۔

شہادت لسانی اور اردو و ملتانی پنجابی کی مماثلت | اس کے متعلق شہادت لسانی کافی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو اپنی صرف و نحو میں ملتانی زبان کے بہت قریب ہے ۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمہ میں الف آتا ہے ۔ دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے ! یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک ہی قاعدہ جاری ہے ۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں ! پنجابی و اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں !

پنجابی اور اردو کا اشتراک آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتبِ تاریخ و لغات کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ہندوستان لاکھ کو لک، پاگ کو پگ، کھانڈ کو کھنڈ، بھانڈ کو بھنڈ۔ ماٹ کو مٹ، آنب کو انب، مونگ کو منگ، گاڑی کو گڈی، گڑیا کو گڈی، تالاب کو تل، بڑی چھپکلی کو دھنڈ اور چقندر کو گنگلو یا گانگلو کہتے تھے۔ اہلِ پنجاب انہی الفاظ کو آج بھی لکھ، پگ، کھنڈ، بھنڈ، مٹ، انب، منگ، گڈی، گڈی، دھنڈ اور گونگلو بول رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا رفتہ رفتہ اردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے۔

ایسے افعال و الفاظ مثلاً آکھنا۔ لوڑھنا۔ اپڑنا۔ پچھانا۔ سٹنا۔ لانا (لگانا) کھڑنا۔ سڑنا (جلنا) پانا (ڈالنا) لڑنا۔ رڈسنا، بنھنا (باندھنا) منگنا (مانگنا) نسنا (بھاگنا) کھیر (دودھ) نال۔ ول۔ یائے مخلوط التلفظ "ویں" قسم کا امر "سی" قسم کا مستقبل وغیرہ جو آج صرف پنجابی میں رائج ہیں دکنی اور قدیم اردو میں عام طور پر مستعمل تھے۔

اسی طرح اردو کے محاورات دن دہاڑے۔ ہلنا جلنا۔ چپ چپاتا۔ مانگنا تانگنا۔ بال وال۔ وغیرہ میں اردو خوان ان کے جزوِ ثانی کو تابع مہمل کہنے کے عادی ہیں۔ مگر پنجابی زبان میں یہ الفاظ بامعنی ہیں اور آج بھی استعمال میں آرہے ہیں۔

ادھر اردو کی اضافت کا۔ کے۔ کی۔ اگرچہ فی زمانہ اردو کے ساتھ مخصوص ہے پنجاب کے دیہات و قصبات نیز بعض دیگر اسما کے ساتھ اب بھی موجود ہیں۔ الغرض یہ امور اردو اور پنجابی زبانوں کے اشتراکِ قدیم کے بیّن دلائل ہیں۔

پنجاب پر بیرونی و سیاسی اثرات علاوہ بریں پنجاب ہندوستان کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کی کنجی بنا رہا ہے۔ اور شمالی اطراف سے ہندوستان پر ہر عہد اور ہر زمانے میں حملے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ مسلمان بھی شمال ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان کی ابتدائی بستیاں، سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں صفاریوں اور سامانیوں کی بنا پر مغربی پنجاب اور سندھ میں ایرانی اثر فروغ پانے لگتا ہے حتیٰ کہ چوتھی صدی ہجری کے

ملتان اور اس کے اطراف میں فارسی کا دور عرب سیاح لکھتے ہیں، کہ ملتان و منصورہ میں فارسی بولی جاتی ہے یہ سیاح یہاں کے بعض شہروں اور دریاؤں کے نام فارسی طرز میں لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی تمدن کے اثرات، ان اطراف میں بہت وسعت اختیار کر چکے تھے۔ چوتھی صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب آلِ نا

پنجاب پر ایرانی تمدن کا اقتدار کے زیرِ اقتدار آجاتا ہے۔ آلِ غزنہ کی حکومت تقریباً ایک سو ستر سال تک رہتی ہے۔

غزنوی دور میں مسلمانوں کی نئی زبان اگر آلِ غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے

کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصہ دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی و معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کو غوریوں کے عہد میں جب دار السلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے اسلامی فوجیں اور

پنجاب کی نئی زبان کا مرکز ثقل دہلی میں منتقل ہوتا ہے

دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں! دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے!

"پنجاب میں اردو"

چاند

تم ندی پر جا کر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطے کھائے — ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی اک سیڑھی لے کر — کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
ہنس ہنس کر ندی کے اندر — روتوں کو بھی ہنسائے چاند

جب تم اس کو پکڑنے جاؤ — بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے — اور پھر خود کو چھپائے چاند
اب پانی میں چپ بیٹھا ہے — کیا کیا روپ دکھائے چاند
چاہے جدھر کو جاؤ افسر
ساتھ تمہارے جائے چاند

"نیرنگِ خیال"

ماں کا دل

چاندنی رات تھی ——— ایک مستانہ خرام جوئبار کے کنارے دو نوجوان روحیں، دو جذباتِ شباب کی سرمستیوں میں مدہوش، روحیں! راز و نیاز میں مصروف تھیں۔

مہ جبین معشوقہ اپنے حسن و جمال کی سحر طراز رنگینیوں پر مغرور! اور نوجوان عاشق، اپنے قیامت سامان شباب کے سوز و گداز میں چُور!! ——— دونوں مخمور نظر آتے تھے ——— چاندنی ان کی بے خودانہ، خود فراموشانہ

حالت پر مسکرا رہی تھی!

نوجوان عاشق نے کہا "آہ، کیا تمہیں میری انتہائی محبت کا، میرے صمیمی عشق کا اب تک یقین نہیں آیا؟ دیکھتی ہو، میں نے اپنی زندگی کا عزیز ترین، بیش بہا ترین سرمایہ ـــــــ اپنا دل تم پر قربان کر دیا ہے۔

ملائک فریب محبوبہ نے اپنی نغمہ صفت آواز میں جواب دیا۔ دل قربان کرنا تو محبت کے راستے میں پہلا قدم ہے! میں تمہاری محبت کا اس سے بہتر ثبوت چاہتی ہوں! تمہارے پاس اپنے دل سے کہیں زیادہ بیش بہا، ایک موتی ہے اور وہ تمہاری ماں کا دل ہے! ـــــــ اگر تم اسے نکال کر مجھے لا دو، تو میں سمجھوں کہ ہاں تمہارا جذبۂ عشق صادق ہے!!"

نوجوان عاشق ایک لمحہ کے لئے گھبرا سا گیا ـــــ اس کے خیالات میں ایک قیامت سی برپا ہوگئی! ـــــ مگر بالآخر، نئی نویلی "معشوقہ کی محبت" ماں کی "سال خوردہ محبت" پر غالب آئی! ـــــ اسی مجنونانہ، مسحورانہ سکر کی سی حالت میں اٹھا، اور اپنی ماں کا سینہ چیر کر! اس کا دل نکال کر، اپنی محبوبہ کی طرف لے چلا ـــــ اضطراب عجلت میں پیر جو پھسلا، تو نوجوان عاشق زمین پر گر پڑا اور اس کی ماں کا خون آلود دل، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خاک پر تڑپنے لگا ـــــ دل میں سے ایک محبت بھری آواز آ رہی تھی:-

بیٹا! کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟!

"قوسِ قزح"

شاعر کے خیالات

شاعر کے پاکیزہ خیالات اُس صاف شفاف چشمہ کے مانند ہیں جو کسی خوشنما گلشن میں بل کھاتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ جس طرح اس صاف چشمہ میں تاروں کا عکس۔ چاند کا عکس متحرک نظر آتا ہے اسی طرح شاعر کے خیالات میں بھی فطرت اور قدرت کی رنگینیوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شاعر قدرت کا ترجمان ہوتا ہے وہ فطرت کی داستان اپنی دلکش نظم کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس کا لطیف احساس دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر چیز کو بھی قابلِ قدر سمجھتا ہے اور جب وہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چشمۂ آب میں ننھے ننھے ستاروں کا عکس جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔

لیکن جب شاعر کے خیالات مکدر ہو جاتے ہیں تو وہ اُس چشمہ کے مانند ہوتے ہیں جس میں مٹی اور ریت کی بڑی تعداد ہو اور اس میں کسی شے کا بھی عکس نہ دکھائی دے۔ پس شاعر وہ ہے جس کے خیالات پاکیزہ ہوں اور جو فطرت کا ترجمان ہو۔

"دین و دنیا"

تبصرہ کتب

پنجاب میں اردو۔ جناب حافظ محمود خانصاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کی ایک محققانہ تالیف ہے، جس میں انہوں نے اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے خصوصاً اُن مسائل پر جن کی رو سے پنجاب اس زبان کی ابتدا اور اس کے نشوونما کا گہوارہ مانا جاسکتا ہے۔ تاریخ اردو میں اُن کی یہ انقلاب آفرین تحقیقات ایک قابل قدر اضافہ ہے جس سے ہندوستانیوں کو عموماً اور پنجابیوں کو خصوصاً دلچسپی ہونی چاہیئے۔ کتاب سوا تین سو صفحات پر ختم ہوئی ہے اور قیمت دو روپے آٹھ آنے رکھی گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو اسلامیہ کالج لاہور سے طلب فرمائیے۔

پیغامِ سروش۔ میاں محمد اسلم صاحب کی خوبصورت کتاب ہے۔ اس سے پہلے میاں صاحب کی اسی قسم کی متعدد تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں اور بعض تو ان میں سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے مدرسوں کے لئے منظور بھی ہو چکی ہیں۔ پیغامِ سروش میں انہوں نے یورپ کے بعض بہترین اہلِ قلم کے مضامین کے تراجم اور طبع زاد افسانے اور مقالات و منظومات درج کئے ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے، اور زبان میں روانی اور سلاست ہے۔ حجم تین سو صفحات کے قریب ہے، اور قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ نسیم بک ڈپو بازار بارود خانہ لاہور سے دستیاب ہوتی ہے۔

ہماری شاعری۔ مصنفہ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم۔ اے۔ اس کتاب میں اردو شاعری کی حمایت میں ایسے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں جو اُن متفرنج دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جو انگریزی کی مزاولت اور اردو سے غفلت کے باعث اپنی شاعری کے صحیح مذاق سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ بحث نہایت مدلل ہے اور اندازِ تحریر اتنا دلچسپ کہ تنقید معلوم ہی نہیں ہوتی۔ کتاب غالباً نوٹو کے طریقہ سے دو رنگوں میں چھپی ہے اور مجلد ہے قیمت دو روپے مقرر ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن۔

غذا و صحت۔ مصنفہ جناب ممتاز احمد صاحب فاروقی بی۔ اے آنرز۔ ہندوستان میں حفظانِ صحت کی طرف لوگوں کی توجہ بہت ہی کم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کی اوسط عمر قریباً قریباً تمام دوسرے ملکوں سے کم ہے۔ ایسی حالت میں اس قسم کی کتابیں ملک کے لئے نہایت ہی مفید ثابت ہو سکتی ہیں اس کتاب میں مصنف نے آسان زبان میں تازہ ترین طبی معلومات کی بنا پر وہ ہدایات درج کی ہیں جو صحت کو قائم رکھنے کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ یوں تو یہ کتاب مردوں، عورتوں، بوڑھوں بچوں سب کے لئے یکساں مفید ہے لیکن نوجوانوں کو اس سے خاص طور پر فائدہ اٹھانا چاہئے کیونکہ ملک و قوم کی ترقی کے اس وقت وہی ذمہ دار ہیں۔ کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ مینیجر دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس لاہور سے منگائیے۔

پیغامِ درا۔ علامہ اقبال کی "بانگِ درا" کی صدائے بازگشت ہے جناب "گوشہ نشین" کو جو اس کتاب کے

مصنف ہیں، اقبال کی ہر کتاب کے مقابلے پر ایک کتاب لکھنے کا شوق ہے چنانچہ وہ "زبورِ عجم" کے مقابلہ "پر زبورِ شرق" بھی لکھ چکے ہیں۔ پیغام در اتقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ نظمیں عموماً قومی، اخلاقی اور اسلامی ہیں اور اُن میں بعض اشعار اچھے بھی ہیں۔ حجم ۲۸۰ صفحے اور قیمت صرف دس آنے ہے۔ ملنے کا پتہ: "گوشہ نشین"۔ وزیر آباد (پنجاب)

رسائل

"سائنس" انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری ۱۹۲۸ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اُردو زبان میں بہت سے علمی و ادبی رسالے جاری ہیں مگر آج تک کسی نے سائنس کو ایک مستقل علمی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ جہاں بڑے بڑے قابل ہندی پروفیسروں نے اس رسالے کو کامیاب بنانے میں اپنی کوششیں صرف کی ہیں وہاں یورپ کے بعض مشہور اور مسلمہ کیمیا دانوں اور ماہرانِ طبیعیات نے بھی اس تحریک میں شمولیت کی ہے اور اپنی قیمتی تحریریں خاص طور پر بھیجی ہیں جن کے تراجم اس میں شامل ہیں۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ ایسے رسالے ملک میں کامیاب ہوں اور لوگوں میں اُس تحقیق کا مادہ پیدا ہو جو علم کی ہر شاخ اور معاشرت کے ہر شعبے کے لئے ضروری ہے۔ سالانہ قیمت آٹھ روپے مقرر کی گئی ہے۔

"زمانہ کا جوبلی نمبر"۔ کانپور کے رسالہ "زمانہ" نے اپنی زندگی کے پچیس سال زبانِ اردو کی خدمت میں گزار دیئے ہیں اور اس طویل عرصے میں اُس کی مخصوص روش، اس کے بلند معیار اور اُس کے استقلال میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا۔ ہندوستان بھر میں شاید "زمانہ" ہی ایک رسالہ ہے جو اتنی مدت سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور یہ اس کی مقبولیت کی ایک بین دلیل ہے۔ جوبلی نمبر نہایت کامیاب اور شاندار نکلا ہے اس میں کل ۴۵ مضامین اور ۶۵ تصاویر ہیں۔ تمام مضامین ضرورتِ وقت کے مطابق اور مفید معلومات سے پُر ہیں۔ تصاویر میں بعض مشہور رہنمایانِ ملک کے علاوہ قریباً قریباً تمام ادبائے ہند کی تصاویر موجود ہیں جو بجائے خود ایک نادر و نایاب مرقع ہے۔ ۲۱۶ صفحات ہیں قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

"سرحد" شہر پشاور سے نکلتا ہے۔ پشتو اور اردو دونوں زبانوں کے مضامین اس میں چھپتے ہیں۔ دو سال سے ملک و قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ اس کی روش آزادانہ ہے اور زیرِ تبصرہ مارچ نمبر میں بعض مضامین اچھے ہیں۔ قیمت درج نہیں۔

"اصلاح" انجمنِ اصلاحِ رسوم، باغبانپورہ، لاہور کا ماہوار آرگن ہے۔ رسالے کے مقاصد بھی وہی ہیں جو انجمن کے ہیں۔ جنوری کے پرچے میں جو ہمارے سامنے ہے "تفسیرِ قرآن کا ایک ورق" "مسلمان اور چھوت چھات" اور "مسلمانوں کے دینی و دنیوی امراض کا واحد علاج" بہت اچھے مضامین ہیں۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔

فہرستِ مضامین

بابت ماہِ جون ۱۹۲۸ء

جلد ۱۳

تصویر:- شاہزادی

جہاں نما

امان اللہ خاں

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں سیاحتِ یورپ کے لئے گزشتہ دسمبر میں کابل سے روانہ ہوئے تھے۔ ہندوستان سے گزر کر مصر اور فرانس ہوتے ہوئے وہ انگلستان پہنچے جہاں اُن کا نہایت شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اور آج کل وہ روس کی سیاحت کر رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایران اور ترکی کو بھی اس طویل سیاحت میں شامل کیا جائے گا۔

آج سے چھ مہینے پیشتر یورپ کی نظروں میں افغانستان کا تصور اسی قدر تھا کہ وہ پہاڑی دروں کا ایک ملک ہے جس میں وحشی قبائل بستے ہیں مگر آج افغانستان کے جواں بخت و جواں سال بادشاہ کی بیدار مغزی اور شائستگی کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے ہیں۔ امان اللہ خاں اُن کے لئے مشرق کا ایک پُراسرار حاکم بن گیا ہے جس کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ مدتوں تک اُس کی شخصیت دنیا کے لئے ایک معمہ بنی رہے گی۔

امان اللہ خاں کی سیاحتِ یورپ کا مقصد اُن کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

"میں یورپ میں دو باتوں کے لئے آیا ہوں - اول اُن چیزوں کو افغانستان لے جانے کے لئے جو مجھے تہذیب یورپ میں بہترین نظر آئیں اور دوسرے یورپ کو یہ دکھانے کے لئے کہ افغانستان بھی نقشۂ دنیا میں ایک حیثیت رکھتا ہے"

اِس سے پہلے اعلیٰ حضرت امیر نے ہندوستان سے گزرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ "جہاں تک مجھے کتابوں میں سے علم ہو سکا ہے میں اپنی قوم کو اٹھا کر مغربی تہذیب کی سطح بلند کے برابر لانے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر اب وقت آگیا ہے کہ میں اس تہذیب کے مطالعات کو اپنے مشاہدات اور تجربات کی حد تک وسعت دوں"

اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سلطنت میں جو ابھی زمانۂ وسطیٰ کے معیارِ تہذیب و تمدن سے بمشکل آشنا ہوئی تھی ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ وہ جدید ترین سلطنتوں کی ہمسری کرنے لگی ہے۔ انگلستان، فرانس، اٹلی جرمنی اور دوسری حکومتوں کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کئے گئے ہیں اور افغان طالب علموں کو سائنس انجنیرنگ اور غیر زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجا گیا ہے۔

امیر نوجوانوں اور عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی ہیں۔ اُن کا پختہ عقیدہ ہے کہ عورتوں کو اس قابل بنا دینا

چاہیے کہ وہ ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔ اصلاحات کے معاملے میں قبائل بادشاہ کے مخالف ہیں مگر وہ اس مخالفت سے ڈرتے نہیں بلکہ اکثر تن تنہا باہر نکلتے ہیں اور بعض اوقات پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح بھیس بدل کر شہر کی حالت دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔

امان اللہ خاں بے اندازہ کام کرنے والے آدمی ہیں۔ ہر روز ۶½ بجے وہ پیدل یا گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کے لئے جاتے ہیں اور وہاں سے واپس آکر کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ افغانستان کی مجلس وزرا میں سات وزیر ہیں بادشاہ ہر روز ایک وزیر کو بلاتے ہیں جو ٹھیک نو بجے محل میں حاضر ہو جاتا ہے۔ وزیر ایک ایک معاملے کو بادشاہ کے روبرو پیش کرتا ہے اور اس پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتا جاتا ہے۔ امیر انتہائی دلچسپی سے اُسے سنتے ہیں، کیونکہ وہ انتظامات کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے بھی اپنے آپ کو آگاہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اتنی دیر تک کام میں مصروف رہتے ہیں کہ رات ہو جاتی ہے۔

امیر فرانسیسی زبان سے بھی واقف ہیں اور اخبار فرنچ پکچوریل و یکلی لی الٹریشن کا بالالتزام مطالعہ کرتے ہیں وہ یا تو اُسے اصلی زبان میں پڑھتے ہیں یا اُس کا ترجمہ کرا لیتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ اس میں دنیا کی ترقی و تمدن کا کامل و مکمل نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس پرچے کے لئے اُن کی سرپرستی کا یہ اثر ہے کہ "الٹریشن" ہی وہ یورپی اخبار ہے جس کے افغانستان میں ۲۳۷ خریدار ہیں۔

ملکۂ افغانستان

امیر افغانستان کی ملکہ ثریا خانم بھی یورپ کے سفر میں اُن کے ساتھ ہیں۔ فرائض شاہی کے سرانجام دینے میں ملکہ اعلیٰ حضرت کی دستِ راست ہیں اُن کے بچپن اور لڑکپن کا تمام زمانہ ملکِ شام میں گزرا ہے جہاں انہوں نے نہایت اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ ملکِ شام میں اُن کا قیام اُن انقلابات کے ماتحت ہوا جو افغانستان کی جدید کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ محمود طرزی کی صاحبزادی ہیں جو افغانستان میں امورِ خارجہ کے مستقل وزیر ہیں اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک پیرس میں افغان سفیر کی حیثیت سے رہے ہیں۔

ملکہ ہمیشہ مغربی لباس پہنتی ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے افغان امرا کے گھرانوں میں اس کی تقلید کی گئی ہے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو اُن کے چہرے پر برقعہ کے بجائے صرف ایک ہلکا سا نقاب ہوتا ہے۔ عورتوں کے تعلیمی معاملات میں وہ گہری دلچسپی لیتی ہیں اور اپنی والدہ کے ساتھ مل کر کابل کے زنانہ مدرسہ کا انتظام خود کرتی ہیں جس میں اس وقت سینکڑوں لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں پرانی وضع کے افغانوں نے اس دارالعلوم کی کافی مخالفت کی ہے اور اکثر اعلیٰ حضرت کو اس کے قیام و استحکام

کے لئے اُن لوگوں کی چشم نمائی بھی کرنی پڑی ہے

روس کی ہوائی طاقت

کون نہیں جانتا کہ ٹراٹسکی نے زار کی تباہ شدہ فوج سے از سر نو ایک مرتب و منظم بالشویک فوج آراستہ کی تھی وہی فوج جس نے پھر ڈینکن کولچک اور رینگل کی فوجوں کو ہزیمت دی، مگر اُس سعی وجہد سے بہت تھوڑے لوگ واقف ہیں جو روس فضائے آسمانی پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ سوویٹ روس کو دنیا کی ایک عظیم الشان ہوائی طاقت بننے کا خیال ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اپنی ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اُس دن کے بعد اُس نے جرمنی، ہالینڈ آسٹریا اور اٹلی سے مشینوں اور اُن کے اجزا کی ایک بہت بڑی تعداد خرید لی ہے اس کے علاوہ اُس نے اپنے تجارتی ہوائی راستوں میں اور ماہرین پرواز کی تعداد میں بھی توسیع کی ہے۔ ۱۹۲۵ء کے وسط تک اُس کے مستعمل جہازوں کی فہرست میں نو سو تناسی ہوائی جہاز تھے۔

سوویٹ حکومت نے خود تو ایک خاص رقم ہوائی جہازوں کی خرید اور تعمیر کے لئے وقف کر رکھی ہے اور باقی مصارف قوم کے روپے سے پورے کئے جاتے ہیں۔ روسیوں نے ایم رائیکاف کے زیر صدارت ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ اس کے ممبر جو ہوائی بیڑے کی ملکیت کے بھی شریک ہیں ساٹھ کوپک فی کس سالانہ چندہ دیتے ہیں پچھلے سال کے اختتام پر اس سوسائٹی کے تیس لاکھ ممبر تھے۔ تمام مملکتِ روس میں اس انجمن کی شاخیں قائم ہیں اور روز بروز اس کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اِن ہوائی جہازوں پر عوام کو بھی سیر کرائی جاتی ہے گویا انہیں محسوس کرایا جاتا ہے کہ ہوائی بیڑے پر اُن کے مالکانہ حقوق ہیں۔ اس کا یہ اثر ہے کہ لوگوں نے خوشی سے اُس کے لئے چندہ دیا ہے جس کی میزان ایک کروڑ اور دو لاکھ روپے سے بھی بڑھ کر ہے۔

امریکا کے مصارفِ تعلیم

نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ بلادِ امریکا آج کل اپنے مصارف کا تہائی حصہ مدارس عامہ پر خرچ کر رہے ہیں۔ ملک کے دو سو پچاس شہروں میں جن میں سے ہر ایک کی آبادی تیس ہزار نفوس سے زیادہ ہے ان مدرسوں کے جملہ مصارف کا اندازہ ۱۹۲۵ء میں ۹۸۵۳۰۷۰۵ ڈالر یا کل محاصل کا سینتیس فی صدی اور فی کس ۱۵ء۴۲ ڈالر کیا گیا ہے۔

جن شہروں کی آبادی ۱۹۱۶ء میں تیس ہزار سے زیادہ تھی وہ اندازاً ۲۰ء۳۰ ڈالر فی کس سکولوں پر خرچ کرتے رہے۔

۱۹۲۶ء میں یہ دو سو پچاس شہر سکولوں کی اصلاح و استحکام کے سلسلے میں ۹۸۲۰۰۰۰۰۰ ڈالر کے مقروض ہو گئے حالانکہ ۱۹۱۶ء میں یہی قرض ۳۸۵۰۰۰۰۰۰ ڈالر تھا۔

انہیں دو سو پچاس مدرسوں کی عمارتوں، میدانوں اور ساز و سامان کے لئے ۱۹۱۶ء میں ۷۵۰۰۴۰۰۰ ڈالر وقف تھے

لیکن ۱۹۲۶ء میں یہی رقم.... ۲۱۱۲۰ ڈالر تک پہنچ گئی۔

ایک ڈالر تقریباً تین روپے کے برابر ہوتا ہے۔ہماری بلدیات امریکا کی بلدیات کے مقابلے میں اپنی آمدنی کا کون سا حصہ تعلیم پر صرف کر رہی ہیں؟

ہندوستانی بیرون ہند میں

سمندر پار بسنے والے ہندوستانیوں کی حالت کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو روز بروز نہ صرف ترک وطن کرنے والوں کے لئے بلکہ ہم ہندوستانیوں کے لئے بھی اہم ہو رہا ہے آبادی کے اعداد و شمار کا یہ آخری نقشہ ہے جو دستیاب ہو سکا ہے۔اس کے بعد کے اعداد و شمار نہیں ملتے۔

ملک	ہندوستانی آبادی	سالِ مردم شماری
مقبوضاتِ برطانیہ:۔		
سیلون	۸۲۰۰۰۰	۱۹۲۶
برطانی ملایا	۶۶۰۰۰۰	”
ہانگ کانگ	۲۵۵۵	۱۹۱۱
ماریشس	۲۶۴۵۲۷	۱۹۲۱
سے کے لیز	۳۳۲	۱۹۱۱
جبرالٹر	۵۰	۱۹۲۰
نائی جیریا	۱۰۰	”
کینیا	۲۶۷۵۹	۱۹۲۶
یوگنڈا	۵۶۰۴ (ایشیائی)	۱۹۲۱
نیاسالینڈ	۵۱۵	”
زنجبار	۱۲۸۴۱	”
ٹانگانیکا	۹۴۱۱	”
جمیکا	۱۸۴۰۱	۱۹۲۲
ٹرینیڈاڈ	۱۲۱۴۲۰	۱۹۲۱
برطانی گی آنا	۱۲۴۹۳۸	”
جزائر فیجی	۶۰۶۳۴	”
باسوٹو لینڈ	۱۷۹	۱۹۱۱
سوئٹزری لینڈ	۷	۱۹۱۱
شمالی روڈیشیا	۵۶ (ایشیائی)	۱۹۲۱
جنوبی روڈیشیا	۱۲۵۰ (”)	”
کینیڈا	۱۲۰۰	۱۹۲۰
آسٹریلیا	۲۰۰۰	۱۹۲۲
نیوزی لینڈ	۶۰۶	۱۹۲۱
نٹال	۱۴۱۳۳۶	”
ٹرانسوال	۱۳۴۰۵	”
کیپ کالونی	۶۴۹۸	”
آرینج فری سٹیٹ	۱۰۰	”
(نٹال تا آرینج فری سٹیٹ)	۱۶۱۳۳۹	
میزانِ مقبوضاتِ برطانیہ	۲۲۹۴۷۲۴	
مقبوضاتِ غیر:۔		
ممالک متحدہ امریکا	۳۱۷۵ (ایشیائی)	۱۹۱۰
مدغاسکر	۵۲۷۲ (”)	۱۹۱۷
ری یونین	۲۱۹۴	۱۹۲۱
ڈچ ایسٹ انڈیز (تقریباً)	۵۰۰۰۰	۱۹۲۰
سُری نام	۳۴۹۵۷	نا
موزنبیق	۱۱۰۰ (ایشیائی اور نیم ہندی)	معلوم
ایران	۳۸۲۷	۱۹۲۲
میزانِ مقبوضاتِ غیر	۱۰۰۵۲۵	

شاہزادی

اے ماہِ رخشاں اے مہرِ تاباں
اے شاہزادی اے ماہ زادی
اے حورِ جنّت اے نورِ جنّت
تمکین سراپا
تزئین سراپا
تیرا تبسّم تیرا تکلّم
یہ دل فریبی وہ دِل نوازی
یہ لالہ و گل اور وہ مے و ل
رنگیں ہے اِس سے شیریں ہے اُس سے
دنیا کا گلشن
نغموں کا مسکن
وہ دِن بھی کیا تھے جب شاہزادے
سارے جہاں کے مفتوں تھے تیرے

اُن کی حکومت اور اُن کی شوکت
اُن کی شجاعت اور اُن کی عظمت
اُن کی شرافت اور اُن کی دولت
تیرے لئے تھیں تیرے لئے تھیں
اُن کی امنگیں اور اُن کی جنگیں
اُن کی تمنا
ارمان اُن کا
تیرا فسانہ افسوں ہے ایسا
افسانے جتنے مَیں نے سُنے تھے
بچپن میں اپنے سب مجھ کو بھولے
پر اک کہانی تیری نہ بھولی
وہ داستانی
تیری نہ بھولی

منصور احمد

سخن ہائے گفتنی

اگر مقصد نہ داری بوالفضولی
جھولی باز سے گویم جھولی

۱
جمودِ مسلم

اُنہیں سے ایک دن پوچھا کسی نے — "ترقی کیوں نہیں کرتے مسلماں
کہیں کیا ان میں نقصِ باطنی ہے؟ — بظاہر تو نظر آتے ہیں انساں!
تنزل کی قسم کھائے ہیں گویا! — ترقی سے تنفر ہے، نمایاں!
کہیں مغضوبِ فطرت تو نہیں کیا؟ — نظر آتے ہیں کچھ بے ڈھب سے ساماں!
نہ ہمت ہی سے ان کو واسطہ کچھ! — نہ استقلال ہی اُن کا حدی خواں!
پسے جاتے ہیں چونا ہو رہے ہیں! — مگر پھر بھی ہیں بے حس بے پرواں!
جمودِ مسلماں ضرب المثل ہے! — پھڑکتی ہی نہیں اُن کی رگِ جاں!

چہ راز است ایں؟ حزیں آخر بفرما
کہ بر ما خندہ زن شد گبر و ترسا"

۲
تذبذب

اُنہیں نے بھر کے اک آہِ جہاں سوز — کہا "لاریب انساں ہیں مسلماں
نہیں فطرت میں اُس کی کوئی بھی نقص — حریفِ برق ہے اُس کی رگِ جاں
تغافل کیش ہے بے حس نہیں ہے — دلِ مسلم ابھی تک ہے مسلماں
نہ ہمت میں نہ استقلال میں کم — ملائے آنکھ تو شیرِ نیستاں
کھجاتا ہو ازل سے جس کا تلوا — اُسے سہما نہیں سکتے بیاباں
سہ راہے پر رُکی ہے قوم کی قوم — کدھر جائیں؟ مذبذب ہیں مسلماں
رٹے جاتے ہیں اک لفظِ ترقی — ہیں گویا رہنما طفلِ دبستاں
کوئی پوچھے جو معنی پھر ہیں خاموش — مگر پوچھنے پر "خس بدنداں"

۳
"سہ راہا"

کہا اُس نے "سہ راہا" کیا بلا ہے؟ — ذرا ارشاد یہ بھی ہو یہ کیا ہے؟
اُنہیں نے مسکرا کر پھر کہا یوں — "سہ راہا ہے پر تو خود تو بھی کھڑا ہے
ترے درپیش ہیں اب تین راہیں — بڑھوں کس راہ پر تو سوچتا ہے
رہِ روحانیت دائیں طرف ہے، — مگر بائیں طرف جو راستہ ہے
وہی ہے جادۂ دنیائے فانی — فضا جس کی بظاہر دل کشا ہے
بزعمِ خود رہِ زاہد ہے پہلی — مگر وہ دوسری پر چل رہا ہے
زباں پر ترکِ دنیا ہے شب و روز — عمل لیکن خلافِ ادعا ہے
مگر جو سامنے تیرے سڑک ہے — اُسی کا نام "سیدھا راستہ" ہے

خدائے ما ہمیں را وسط خواند
نبیؐ ایں را رہِ مومن بداند"

حزیں

۴
مفہومِ ترقی

"ترقی سے ہے کیا لیڈر کا مفہوم؟ — مجھے ہے اس کے عنوانوں سے معلوم
بہ باطن دولتِ دنیا کا بندہ — بظاہر گو ہے مثلِ طفلِ معصوم
تصور میں تو ہے قاروں کی سج دھج — مگر تقریر سے غائب ہے مفہوم
اُسے ڈر ہے اگر دل کی کہی بات — تو جلسوں میں نہ ہوگی اُس کی یہ دھوم
کہ مسلم کا ابھی دل ہے مسلماں — وہ کہیں ہونے لگا جنت سے محروم؟

اُدھر زاہد کی بے نوائیاں ہیں   اِدھر حالت جدید اُس کی ہے مذموم
نہ کیوں زیر و زبر ہوں رنگ ہستی   نہ کیوں آپس میں لڑ مر کر ہوں معدوم
کوئی اک راہ پر مسلم کو لاؤ   کہ مر مٹنے سے بچ جائے یہ مظلوم

بیک جادہ برآں گام زن شو
بدل مومن - ملک - یا اہرمن شو"

۵

رہِ روحانیت

"رہِ روحانیت سب سے کٹھن ہے   اسے کرتے ہیں خاصانِ خدا طے
نہیں رغبت جنہیں دنیائے دوں سے   یہ صحرا اُن کے تلوؤں کے لئے ہے
ہے جن کی زندگی ہی ذکرِ جاناں   ہوئی قسمت میں جن کی عشق کی مے
فقط اللہ سے جو ہیں لَو لگائے   جنہیں ساقی پلاتا ہے پیاپے
جنہیں محبوب ہے محبوب کی یاد   نظر میں جن کی مال و زر ہیں لاشے
غرض رکھتے نہیں جو ما سوا سے   بھکاری جن کے در کے ہیں جم و کے
دلِ درد آشنا ہیں جو سراپا   جنہیں بے تاب کر دے نالۂ نے
جو اپنی زندگی میں مر چکے ہیں   رہِ روحانیت اُن کے لئے ہے

رضا جوئی شعارِ ناکساں نیست
دریں رہ یک قدم بے امتحاں نیست"

۶

رہِ دنیائے دوں

"ہے گر دنیائے دوں مقصود بالذات   نہیں تحصیل اس کی کچھ بڑی بات
تعلق رکھ نہ تو روحانیت سے   سمجھ مذہب کو طومارِ خرافات
نہ ہو اخلاق سے بھی واسطہ کچھ   ہوس پوری کرے گی تیری حاجات
سراپا خود غرض دل کو بنا لے   رہے پیشِ نظر تیرے تری ذات
خیانت کو جوانمردی سمجھ کر   دیانت پر سرے سے مار تو لات
جو ہوتا ہے تو ہو انصاف کا خون   خیالی ایک ہوا ہیں مکافات
غرض تو دیدہ و دانستہ وہ کر   روا رکھتے نہیں اخلاق جو بات
مگر دنیا بھی فانی! تو بھی فانی!   اور اک دن ٹوٹنا ہے یہ طلسمات

عذابِ جانِ قاروں شد زرِ او!
بہ گِل پیوست گنجِ پیکرِ او!"

۷

بشر

بشر تنہا نہیں یہ جسمِ خاکی   ختن ہی میں ہے آہوئے ختن بھی
سمجھتا ہے مکاں کو بے مکیں تو؟   ارے ناداں! اسی تن میں ہے من بھی
تکلّم میں ہیں جو تیری زباں پر   اسی تن کے مکیں ہیں یا دمن بھی
یہ نکتہ یاد رکھنے کے ہے قابل   چمن ہی سے ہے بوئے یاسمن بھی
نہیں افراد کا مجمع ہی محفل   ہے اُس کا جزو شمعِ انجمن بھی
تو ہی لیلیٰ بھی ہے دیوانۂ نجد   تو ہی شیریں بھی ہے اور کوہکن بھی
حریر و اطلس و دیبا کے شائق   پہننا ہے تجھے اک دن کفن بھی
بشر ہے ایک معجونِ مرکب   یہ گِل بھی ہے ملک بھی اہرمن بھی

نمے گویم ملک یا اہرمن شو
رہِ فطرت بگیر و گام زن شو

امینِ حزیں

تنہائی

پیاری۔

مختصر سی مجلس میں تم نے مجھ سے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اُن میں سے ایک سوال پر مجھے اب تک ہنسی آ رہی ہے۔ میری متضاد طبیعت کی کسی بے سر پیر بات سے متاثر ہو کر تم نے محض بھولے پن سے مجھ سے یہ پوچھا۔

کیا تم خود اپنے آپ کو سمجھتے ہو؟

پیاری۔ ہندوستان کے شعر زدہ نوجوانوں کا ایک فیشن ہو گیا ہے کہ وہ اپنے انچ بھر گہرے تالاب میں سمندر کو غوطے دیتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی فیشن میں مبتلا ہوں اور بُری طرح مبتلا ہوں۔ جب موقع ملتا ہے اس تاک میں رہتا ہوں کہ جو کچھ ہوں اس سے دس ہزار گنا زیادہ ظاہر ہوں۔ اور چونکہ پڑھا لکھا ہوں اس لئے یہ بھی اپنے آپ کو دھوکا دے لیتا ہوں کہ یُوں بہانہ کرنے سے کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ بن جاؤں گا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ چونکہ تم سے خواہ مخواہ سچ بولنے کو جی چاہتا ہے اس لئے نہیں بتا دیتا ہوں کہ مجھ میں اور مجھ سے اور سینکڑوں تضیع اوقات کرنے والوں میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو کبھی خط نہیں لکھتے اور میں لکھتا ہوں۔ واقعی اپنے آپ کو خط لکھ کر ڈال دیتا ہوں اور جب ڈاک آتی ہے تو بہت شوق سے اس خط کو پڑھتا ہوں۔ یہ خط میری طرف ہوتے ہیں مگر میری طرف سے نہیں ہوتے۔ ان کے لکھنے والے کی ہستی خود میرے لئے معمّا ہے۔ مثلاً آخری خط جو مجھے ڈاک میں ملا ہے وہ یہ ہے۔

خط

"چین کی، مصر کی، فرنگستان کی، ہندوستان کی پوری پچاس صدیوں کا میں وارث ہوں مگر باوجود اس کے زندگی مجھ سے چاہتی ہے تو یہی کہ وہی پرانا کھیل کھیلوں یعنی کسی حسینہ کے دل میں اپنی محبت پیدا کر لوں کسی نا اہل سے اپنی تعریف کے لوں اور کسی چالاک لکھ پتی سے مال دولت گھسیٹ لوں۔ زندگی کی عقل پر بھی لعنت ہے۔ کیا میں انہی کاموں کے لئے رہ گیا ہوں یا ان سے بھی بدتر ان مشاغل کے لئے کہ دلفریب فقرے ترتیب کر کے کسی کو بہلا دوں کسی کو پھسلا لوں اور یوں وقت کا خون کرتے ہوئے اس دنیا سے چل بسوں۔ مگر میرا اس میں کیا قصور ہے؟ خدا کو بھی تو جو مجھ سے بہت پرانا ہے آیا تو یہی آیا کہ کہیں کہیں کوئی صورت بنا دی۔ کیسی؟

ہونٹ جن پر تبسم قربان ہو، بال جن سے دم گھٹنے لگے۔ آنکھیں جن میں شریر ستارے شوخیاں کریں اور لمبی گردن کے

خم کی وہ شاہکاری کہ تقدیر چکّر کھاتی پھرے ۔
اس کے سوا تو خدا کی اور کوئی کاریگری دیکھی نہیں اور اسے جب اس قدر عمر میں ہی آیا تو میرا کیا قصور ہے ؟ اگر وہ کسی طرح وقت کو چلنے سے روک لیتا اور چمکتے ہوئے پیارے رخساروں کو جھرّیوں سے بچا لیتا تو میں بھی عمر یوں نہ کھوتا ۔ پرستش کرتے ہوئے چلا جاتا ۔ کس کی ؟ خدا کی نہیں ، بلکہ اُس جانِ حسن جہانِ حسن کی جو تصویر ہے ، راگ ہے ، شعر ہے مگر اب کیا کروں حسن ، شہرت ، دولت میرے کسی کام نہیں ۔ اُف اس دنیا میں مَیں کس قدر تنہا ہوں ہزاروں لاکھوں دنیائیں اپنے لئے بنا بنا کر بگاڑ دیں اور یہ تنہائی نہ گئی ۔ ہاں خوب یاد آیا ۔ ایک مَیں تنہا ہوں اور ایک وہ تنہا ہے ۔ وہی بھولی بے رحم جس نے اپنے آپ کو فریب دینے کے پرانے ایمان کو نئی شان سے قائم کیا ہے ۔ آئے دن اپنے پیارے پیارے خوابوں کو یہ کہہ کر قتل کرتی رہتی ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے لئے نہ جیئوں ۔ یہ کمبخت لفظ 'فرض' اُس کے تخیل کی گردن پر ایسا سوار ہوا ہے کہ تعجب نہیں کہ چند سالوں تک وہ شاید اپنے خوابوں کو بالکل ہی عاق کردے ۔ پھر وہ کس قدر غریب رہ جائے گی "۔

پیاری ۔ بس یہ خط تھا جو مجھے آخری ڈاک میں آیا ۔ خود حیران ہوتا ہُوں کہ کیوں لکھا ؟ مگر مجھے یہ اپنا کھیل پسند ہے ۔ اپنے آپ سے اجنبی بنے رہنا اور اس اجنبیت کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنا میرا فلسفۂ زندگی ہے ۔ پرانا فلسفہ یہ تھا کہ جس نے پہچانا اپنے آپ کو اُس نے پہچانا اپنے رب کو ۔ آج کل کے علم النفسیات والے بھی Know Thyself کے مضمون پر بہت زور دیتے ہیں ۔ مگر میری تمام کوششوں کا مرکز یہ ہے کہ اپنے آپ کو نہ جانو ۔ اس لئے تمہارے سوال پر دل ہی دل میں بہت ہنسی آئی ۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے لئے ایک نہ یاد آنے والا خواب بنا رہوں ۔

فلک پیما

جو ہم نے دیا وہ ہمارے پاس ہے
جو ہم نے خرچ کیا وہ ہمارے پاس تھا
جو ہم نے پیچھے چھوڑا وہ ہم نے گنوایا

طوفانِ تمنّا

میں پہروں بے خودی سے منزلِ عنقا میں رہتا ہوں
ہمیشہ پھر ستم آپے میں آجانے کے سہتا ہوں

خدا جانے یہ طوفانِ تمنّا کیا کرے مجھ سے
میں اس رو میں ہمیشہ صورتِ خاشاک بہتا ہوں

مجھے پھولوں کی اک اک پنکھڑی اک جامِ صہبا ہے
یہ مے پیتا ہوں میں اور روز و شب سرشار رہتا ہوں

کبھی وحشت میں پھولوں پر جو ہوتا ہے گماں تیرا
تو اپنی داستانِ دل اک اک پتّی سے کہتا ہوں

کہیں دھوکا نہ ہو جائے گلوں کو مجھ پہ گلچیں کا
جبھی کترا کے چلتا ہوں اور اُن سے دُور رہتا ہوں

برستا ہے جو ابرِ تر پگھل جاتا ہے دل میرا
اور اُس کے ساتھ مل کر صورتِ سیماب بہتا ہوں

رہا ہو کر کسی دن بارگاہِ حسن میں پہنچوں
یہ قیدِ با مشقّت بس اسی ارماں میں سہتا ہوں

(ا ح ـ ب)

ہندی رزمیات پر ایک مورخانہ نگاہ

مہابھارت اور رامائن ہندی آریوں کے دو عظیم الشان رزم نامے ہیں۔ ہندوؤں کے بیان کے مطابق "ان کی نظیر دنیا کی ادبیات میں از قبیلِ شاذ ہے۔ اگر ویدی ادبیات سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو صرف انہی دو چمکدار ہیروں کی آب و تاب قدیم ہندی آریائی عظمت و شوکت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہبی و اخلاقی لحاظ سے یہ رزم نامے کتنے ہی لاجواب کیوں نہ ہوں مگر تاریخی نقطۂ نگاہ سے وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ عصبیت پرور اور زود اعتقاد ذہنیتیں ان دو رزمیات کے تمام خلافِ قیاس اور مافوق العادت بیانات و واقعات کو حرف بحرف صحیح باور کرتی ہیں لیکن عقلِ دقیقہ رس انہیں ایک خیالی افسانہ سے زیادہ وقیع تصور نہیں کرتی۔ البتہ اعلیٰ اخلاقی تعلیم کا ادعا انہیں دوسرے افسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اور ڈاکٹر میکڈونلڈ کا خیال ہے کہ "رامائن کے واقعات اور کردار نہ تاریخی ہیں نہ تمثیلی بلکہ محض شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں"۔ مسٹر رومیش چندر دت کا بیان ہے کہ رگ وید میں "سیتا" کا لفظ "ہرائی" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ زراعت و فلاحت کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سیتا" کو اپنی یونانی بہن "پروسرپن" کی طرح دیوتائی اعزاز حاصل ہوتا گیا یہاں تک کہ بمرورِ زمانہ وہ ایک مقدس دیبی کی حیثیت سے پوجی جانے لگی۔ زمانۂ رزمیہ میں برہمنوں کے تخیل نے "سیتا" کو ایک جیتے جاگتے حسین و جمیل پیکرِ نسوانی میں تحویل کر دیا اور اُسے راجہ جنک کی جو نہ صرف تمام معاصر راجاؤں بلکہ برہمن رشیوں سے بھی زیادہ بزرگ اور عالم و فاضل تھا دختر قرار دیا۔ یہ تو "سیتا" کی اصلیت تھی۔ اب رامائن کے بطل رام کی حقیقت و ماہیت ملاحظہ ہو۔ پورانوں میں رام کو وشنو کا ساتواں اوتار تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن پوران زمانۂ مابعد کی تصنیف ہیں۔ زمانۂ رزمیہ میں یا اس سے پیشتر وشنو کو ہندی آریائی دیومالا میں کوئی نمایاں اور امتیازی درجہ حاصل نہ تھا۔ البتہ ویدی زمانہ ہی سے اندر آریوں کا سب سے بڑا محافظ دیوتا مانا جاتا تھا جو جنم بھوم باشندوں کے ساتھ معرکہ آرائیوں میں اُن کی ہر طرح مدد کرتا تھا۔ وہ آریوں کو کامیاب بناتا اور داسیو آسوروں اور دوسری وحشی قوموں کو تباہ و برباد کرتا تھا" پارسکر گریہ ستر" میں سیتا کو مادرِ گیتی تصور کر کے اُسے اندر کی زوجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر گمان کیا جاتا ہے کہ آکاش کا دیوتا اندر ہی اس عالمِ آب و گل میں رام بن کر جلوہ گر ہوا تھا۔ دنیا کی دوسری قدیم اقوام کے ہاں بھی زمین کی دیبی کو آسمان کے دیوتا کے حبالۂ عقد میں منسلک کیا گیا ہے۔ لیکن ہندوؤں کی اپنے دیبی دیوتاؤں کو مادی و مقرون شکل میں دیکھنے کی خواہش نے پدرِ فلک (اندر) اور مادرِ گیتی (سیتا) کو انسانی پیکر میں

تحویل کردیا۔ اندر آسمان پر ورِیتا کی طاغوتی فوج سے لڑا کرتا تھا۔ انسانی لباس میں جلوہ گر ہونے پر بھی اُس کی جنگی خو باقی تھی۔ اس لئے یہاں اُس نے راوَن اور اُس کے رکشش لشکر کو تہ تیغ کیا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ رامائن اجدھیا یا جزیرہ نمائے ہند کے حقیقی واقعات وصحیح روایات کی ترجمانی نہیں کرتی۔ قدیم الایام میں ہر قوم اپنے گذشتہ ناموروں کی تعریف کے گیت گایا کرتی تھی۔ نوشت وخواند سے انسان ابھی آشنا نہیں ہؤا تھا اس لئے یہ گیت زبانی طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے تھے۔ غالباً یہی شاعری کی ابتدا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت پرانے زمانہ سے اجدھیا میں کسی "اکشواکو" سورما کے حربی کارناموں کے متعلق اَن مل بے جوڑ اور بے ربط گیت اور روایات رائج چلی آرہی تھیں۔ زمانۂ مابعد میں کسی ذہین وجدت طراز شاعر نے ویدی اندر اور سیتا کے تصورات، اہلِ اجدھیا کی دھندلی روایت۔ ان کے مٹے مٹے سے نقوشِ خیالات اور منتشر گیتوں کو جمع کیا اور اُن میں اپنی شاعرانہ تخیل کی آمیزش سے ربط وترتیب پیدا کی۔ اور انہی موادوں کی بنیاد پر ایک عظیم الشان رزمیہ عمارت کھڑی کرلی۔ پرانوں میں جیسا کہ اوپر بیان ہؤا رام کو وشنو کا اوتار مانا گیا ہے لیکن رگ وید میں وشنو آفتاب کا مترادف ہے اس بنا پر رامائن میں رام کو سورج بنسی چھتری فرض کر کے ایک طویل شجرہ کے ذریعہ سے اُس کا حسب ونسب سورج سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ باوجود اس طول طویل شجرہ کے یہ امر مشکوک ہے کہ دسرتھ۔ بھرت۔ رام وغیرہ ناموں کے حقیقی بادشاہ اجدھیا میں گذرے ہیں یا یہ محض فرضی نام ہیں۔ دراصل اگر رامائن میں اکے دکے صحیح تاریخی واقعات ہوں بھی تو اُن میں صنمیاتی قصے اور افسانے اس قدر گتھے ہوئے ہیں کہ تحقیق کا ناخنِ تدبیر اس پیچیدہ گتھی کے سلجھانے اور تاریخی وصنمیاتی واقعات میں تمیز کرنے سے قاصر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ رامائن صحیح معنوں میں ایک رزمیہ تصنیف ہے کیونکہ اس میں رام کے شجاعانہ کارنامے شروع سے اخیر تک ترتیب وتسلسل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں مہابھارت کی طرح بے ربط وبے تعلق واقعات درج نہیں ہیں۔ اس کی زبان شیریں، طرزِ ادا دلنشین، عبارت شستہ وسلیس۔ بیان صاف اور رواں ہے۔ اس میں وہ اغلاق، تعقید، صنائع وبدائع کے چٹان اور مرکب الفاظ کے روڑے نہیں پائے جاتے جن سے پیشتر کے شرتی لٹریچر اور گپتا عہد کی سنسکرت ادبیات بھری پڑی ہیں آج کل ہندوستان میں رامائن کے تین قسم کے نسخے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بعض امور میں مختلف فیہ ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سے کونسا نسخہ والمیکی کی اصل تصنیف سے قریب تر ہے۔ اختلاف کی بڑی وجہ یہ ہے کہ رامائن اگرچہ مقدس ضرور خیال کی جاتی ہے لیکن ویدوں کی طرح الہامی نہیں سمجھی جاتی کہ ایک لفظ یا ایک حرف کے بدل دینے سے پوری عبارت یا پورے منتر کی مخفی قوت وتاثیر زائل ہوجائے۔ والمیکی کی تصنیف کردہ ابتدائی رامائن صرف پانچ کھنڈوں یا حصوں پر مشتمل تھی لیکن موجودہ رامائن کے سات کھنڈ ہیں۔ پہلا اور

ساتواں حصہ تمامتر زمانۂ مابعد کا اضافہ ہے۔ لقیہ پانچ حصوں میں بھی وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافہ ہوا کیا ہے۔ آج کل کی کمل رامائن چوبیس ہزار اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ رامائن کی حیثیت رزم نامہ سے بڑھ کر نہیں ہے تاہم برہمنوں نے اُسے "کتاب الصلوٰۃ" کا درجہ دے رکھا ہے جس کی تلاوت باعثِ برکت خیال کی جاتی ہے۔ چونکہ اب رام کو وشنو کا اوتار تسلیم کر لیا گیا ہے اس لئے رامائن کا پڑھنا وشنو کی عبادت میں داخل ہے۔ جو لوگ سنسکرت سے واقف نہیں ہیں وہ رامائن کا پراکرت ترجمہ پڑھا کرتے ہیں۔ سب سے بہتر ترجمہ جسے قبولِ عام کی سند حاصل ہے "رام چرتمن" ہے جسے گوسائیں تلسی داس نے اکبرِ اعظم کے زمانہ میں ہندی کا جامہ پہنایا تھا۔

آج کل مہابھارت کے بھی دو قسم کے نسخے مروج ہیں ایک شمالی دوسرا جنوبی۔ صحیح معنوں میں مہابھارت کا شمار رزمیات میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس ضخیم کتاب کا صرف ایک خمس کوروا اور پانڈو کی جنگی داستان کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اور یہی حصہ رزمنامہ کہلانے کا مستحق ہے۔ مابقی چار خمس میں مختلف قصے کہانیاں۔ اخلاقی اصول۔ مذہبی عقائد۔ رسم ورواج فلسفہ۔ اصولِ معاشرت وغیرہ کا استقصا ہوا ہے جن پر رزمیہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مہابھارت ایک ضخیم کتاب ہے جو اٹھارہ جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ اس میں "ہری ومسا" نامی ایک بسوط ضمیمہ بھی شامل ہے جو بجا طور پر مہابھارت کی انیسویں جلد کہلانے کے لائق ہے۔ اٹھارہ جلدوں میں کچھ اوپر ایک لاکھ اور "ہری ومسا" میں قریباً سولہ ہزار اشلوک ہیں۔ اکثر مورخین مہابھارت کو بجائے رزمنامہ کے "اخلاقی و مذہبی ضوابط کا ایک منظوم قاموس" خیال کرتے ہیں۔ اس کے اکثر حصے بالکل بے ربط اور بے تعلق ہیں جنہیں مختلف مصنفوں نے مختلف اوقات میں لکھا ہے۔ "بھاگوت گیتا" جیسی ادق فلسفیانہ تصنیف کو جو شش گانہ فلسفی مذاہب کا معجونِ مرکب ہے اور جو خود اٹھارہ فصلوں پر مشتمل ہے خواہ مخواہ مہابھارت کی چھٹی جلد میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ یہ ادخال بالکل انمل اور بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔

اکثر عصبیت نواز اور کٹر مذہبی آدمیوں کا خیال ہے اور نہ صرف خیال ہے بلکہ اس پر اُن کا ایمان و یقین ہے کہ مہابھارت میں جس جنگِ عظیم کا بیان ہے وہ فی الحقیقت "دواپر جگ" میں واقع ہوئی تھی اور بعضوں نے تو اُس کی ٹھیک تاریخ ۳۱۰۲ ق م قرار دی ہے۔ عقل و برہان کی روشنی میں مہابھارت کے واقعات کتنے ہی مبالغہ آمیز، غیر فطری۔ خلافِ قیاس اور مافوق العادت کیوں نہ معلوم ہوں لیکن بعض لوگوں کی زود اعتقادی انہیں سرتاسر حقیقی و صحیح باور کرتی ہے۔ سچ ہے کہ دانش و بینش کبھی ہٹ اور پاسداری کا حریف نہیں بن سکتی۔ منطق کی روشنی اوہام کی تاریکی دور نہیں کر سکتی۔ بہرحال اگر عصبیت کی عینک اتار دی جائے تو واقعات کسی اور ہی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ بہت سے یورپی محققین و نیز ہندی مبصرین کا خیال ہے کہ زمانۂ سلف میں بھارت اور پنچالہ قوموں کے درمیان ایک مقامی

جنگ ہوئی تھی جس کے متعلق مختلف رزمیہ گیت زبان زدِ خلائق چلے آتے تھے۔ جس طرح ہومر نے کسی حقیقی محاصرہ ٹرائے کے مٹے مٹے سے نقوشِ خیال کی بنا پر "ایلیڈ" جیسا ضخیم رزمنامہ تصنیف کیا جو ایک بے نظیر ادبی شاہکار خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بھارت اور پنچالہ قوموں کی جنگ کے متعلق مروجہ گیتوں اور روایتوں کی بنا پر مہابھارت کی رزمیہ نظم مرتب کی گئی تھی۔ چونکہ اس کتاب میں بھارت قوم کی جنگِ عظیم کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اس لئے اُس کا نام "مہابھارت" رکھا گیا۔ بھارت قوم کے راجاؤں کے خاندان کا نام کورو تھا۔ آگے چل کر بھارت قوم ہی کورو کہلانے لگی۔ اٹاریا برہمنا میں کوروؤں کا قدیم وطن ماورائے ہمالیہ بتایا گیا ہے۔ پروفیسر لیین کا خیال ہے کہ وہ کاشغر سے آئے تھے۔ لیکن ویدی زمانہ میں وہ کشمیر میں آباد تھے۔ پنچالہ کے معنی "پانچ فرقے" کے ہیں ممکن ہے کہ یہ قوم پانچ فرقوں پر منقسم ہو جن میں سے ایک فرقہ کا نام پانڈو ہو۔ بہرحال ویدی زمانہ کے بعد کوروؤں کی حکومت موجودہ دہلی کے قرب و جوار میں اور پنچالوں کی حکومت موجودہ قنوج کے گرد و نواح میں واقع تھی۔ ہمسائیگی کی وجہ سے وہ اکثر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتی تھیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا انہی کی ایک جنگ کے واقعات کو منظوم کر کے مہابھارت کا ابتدائی رزمنامہ تیار کیا گیا۔ لیکن بہ اقتضائے زمانہ مختلف شاعروں اور مغنیوں نے اس رزمیہ نظم میں اس قدر تغیر و تبدل اور ترمیم و اضافہ کیا کہ اُس کی ہیئت ہی بالکل بدل گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مہابھارت کے مصنفوں نے تاریخ کے صحیح اصول کو کبھی اپنا خضرِ راہ نہیں بنایا بلکہ اس رزمنامہ کے ہر ارتقائی زینہ پر انہوں نے صرف عوام کے عجائب پسندانہ ذوق اور برہمنی اخلاق کے مخصوص تصوّر کو ملحوظ رکھا تھا۔ اگرچہ برہمنوں نے اتحادی و اخلاقی مقصد کے پیشِ رفت میں اس جنگ کی تمام متحارب قوتوں شخصیتوں اور قوموں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک اور ایک ہی آریائی حلقہ میں شامل کر لیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ واضح رہے کہ صرف ویدی زمانہ میں آریائی و غیر آریائی قوموں کی تفریق قائم تھی لیکن زمانۂ مابعد میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ جنہوں نے برہمنی مذہب و معاشرت اور رسوم و ادابات اختیار کر لئے آریائی حلقہ میں داخل ہو گئے۔ اور جو لوگ صاحبِ حکومت تھے اُن کو نہایت آسانی کے ساتھ برہمنی ندوہ سے چھتری کی سند حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ دکن کی دراوڑی النسل اندھرا قوم کو "اٹاریا برہمنا" میں وسوامتر رشی کی اولاد کہا گیا ہے جنوبی ہند کی چولا۔ چیرا اور پانڈیہ قومیں خالص دراوڑی نسل سے تھیں لیکن منو انہیں چھتری قرار دیتا ہے۔ ہے ہایا قوم بقول ڈاکٹر ٹوڈ اور مسٹر ولسن سیتھی نسل سے تھی لیکن مہابھارت میں انہیں جدو بنسی چھتری بتایا گیا ہے۔ اسی طرح بدیسی گرجارا قوموں کی اولاد کو اگنی کولا چھتری بنا دیا گیا۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہ موقع اُن کے انفرادی احصاء و استقصا کا متحمل نہیں ہے۔ الغرض اس عام اصول کے مطابق جنگِ مہابھارت کے

تمام شرکا کو آریائی زمرہ میں شامل کر لیا گیا ہے اور کوروؤں اور پانڈوؤں کو تو ایک ہی خاندان سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور راجہ سنتانو کو اُن کا مشترکہ مورث قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اربابِ تفحص کے نزدیک جنگِ مہابھارت کی نہ صرف اعانتی وحمایتی فوجیں بلکہ خود کورو اور پانڈو مختلف النسل تھے۔ تحقیقِ جدیدہ سے ثابت ہے کہ ویدی زمانہ کی آریائی وغیر آریائی تفریق مٹ گئی تھی اور زمانہ مابعد کی آب بند ذات واری تقسیم ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھی اس لئے زمانۂ رزمیہ میں نسلی اختلاط و امتزاج کا دروازہ کھلا ہوا تھا چنانچہ کوروؤں کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نیم آریہ تھے اور اُن کی رگوں میں آریائی و دراوڑی دونوں قسم کا خون رواں تھا۔ لیکن پانڈو تو بالکل آریائی حلقہ سے خارج تھے۔ محققین کا گمان ہے کہ وہ دامنِ ہمالیہ میں بسنے والی پہاڑی قوموں کی نسل سے تھے لفظ "پانڈو" کے معنی "اُصفر الوجہ" کے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وسیع زرد فام منگولیائی قوم کی ایک شاخ تھے۔ علاوہ بریں کثرت البعول کی رسم آریوں کے ہاں بالکل ممنوع لیکن تبتی قوموں میں جائز و رائج تھی۔ دروپدی کا پانچوں پانڈو بھائیوں کے حبالۂ عقد میں بوقتِ واحد آنا ظاہر کرتا ہے کہ پانڈوؤں کے یہاں یہ بات معیوب نہ تھی بلکہ وہ تبتیوں کی طرح کثرت البعول کی رسم کے پابند تھے۔ یہ ایک مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ پانڈو تبتیوں کے ہم نسل اور وسیع زرد فام منگولیائی قوم میں شامل تھے۔ الغرض وہ حقیقی جنگ جس کی بنیاد پر مہابھارت کی عظیم الشان رزمیہ عمارت کھڑی کی گئی ہے دراصل دو مختلف النسل قوموں کے درمیان ہوئی تھی جن میں سے ایک نیم آریائی اور دوسری جبلی منگولیائی نسل سے تھی۔ لیکن برہمنوں نے اس عظیم الشان رزمیہ کو اپنی قومی دولت بنانے کے لئے متخاصمین کے حسب و نسب کو ایک فرضی شجرہ میں ایسا جوڑ لیا ہے اور جنگ کے واقعات کو توڑ مروڑ کر ایسا اپنے مطلب کا بنا لیا ہے کہ مہابھارت کی موجودہ حیثیت ایک طبع زاد افسانہ کی سی ہو گئی ہے +

اگرچہ مہابھارت کی داستان کو دلچسپ و مربوط بنانے کے لئے مختلف النسل کوروؤں اور پانڈوؤں کو بظاہر ایک ہی چندر بنسی چھتری خاندان سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس ضمن میں ایسے بے تکے اور عجیب و غریب واقعات بیان کئے گئے ہیں کہ جو نکتہ شناس ہیں وہ ایک ہی نظر میں تاڑ جاتے ہیں کہ یہ پھل مختلف درختوں کے ہیں چنانچہ مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کا نسب نامہ سوم یا چاند یا اس سے بھی پیشتر آرتی رشی سے شروع ہوتا ہے۔ چاند کی چھیالیسویں پشت میں ہستناپور کا راجہ سنتانو پیدا ہوتا ہے۔ سنتانو کی دو بیویاں تھیں ایک گنگا دوسری سیتاوتی۔ اول الذکر کے بطن سے بھیشم پیدا ہوا جس نے مدت العمر برہمچاری یا مجرد رہنے کا عہد کر لیا تھا۔ ثانی الذکر کے بطن سے وچترویر پیدا ہوا جس کی دو بیویاں امبیکا اور امبالیکا نامی تھیں لیکن وہ لاولد مرا۔

ستیاوتی کا ایک عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ سنتانو کے حبالۂ عقد میں آنے سے بہت پیشتر وہ کم سنی میں ایک دن دریا پار ہو رہی تھی۔ کشتی میں پرسرا رشی بھی سوار تھا۔ ستیاوتی کی چشم مخمور نے اُسے گرویدہ کر لیا۔ دریا پار اُتر کر پرسرا اُس سے ہمکنار ہوا جس سے بیاس رشی پیدا ہوا۔ اگرچہ بیاس کی رگوں میں سنتانو کا ایک قطرۂ خون بھی موجود نہ تھا تاہم بھیشم وچترویرا اور بیاس سوتیلے بھائی ہی کہلاتے ہیں۔ بیاس نہایت کریہہ المنظر تھا۔ اُس کا جسم جھبرے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بیاس راہبانہ زندگی بسر کرنے کے لئے بیابانوں میں چلا جاتا ہے لیکن اپنی ماں ستیاوتی سے وعدہ کر کے جاتا ہے کہ عندالضرورت وہ طلب کرنے پر حاضرِ خدمت ہوگا۔ اب سب سے بڑی ضرورت جو پیش آئی وہ یہ تھی کہ لاولد وچترویر کی بیوائیں کسی طرح اولاد حاصل کریں۔ ستیاوتی بیاس کو بلاتی ہے اور امبیکا اور امبالیکا کو اس کے حوالہ کر دیتی ہے۔ جب یہ مہیب رشی امبیکا کے خلوت کدہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ ڈر سے آنکھیں بند کر لیتی ہے جس کے باعث اُس کا فرزند دھرتی تراشٹر اندھا پیدا ہوتا ہے دوسری شب جب بیاس امبالیکا سے ہم کنار ہونے جاتا ہے تو خوف سے اُس کا رنگ فق ہو جاتا ہے اس لئے اُس کا بیٹا پانڈو زرد فام پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقدس و برگزیدہ بیاس رشی ہے جو مہابھارت بیدوں اور پوران کا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ بہرحال جب دھرتی تراشٹر بڑا ہوا تو اُس کی شادی گندھارا کے راجہ سوبالا کی دختر گندھاری سے ہوئی۔ ایک روز گندھاری نے بیاس رشی کی بڑی خاطر مدارات کی جس سے خوش ہو کر رشی نے دعا دی کہ وہ سو لڑکوں کی ماں بنے۔ کچھ عرصہ کے بعد گندھاری گوشت کا ایک لوتھڑا جنی جسے بیاس نے ایک سو ایک ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ سو ٹکڑے سو فرزند بن گئے اور ایک ٹکڑے سے ایک لڑکی بنی جو دہسالہ کہلائی۔ یہی سو فرزند مہابھارت میں ایک مشترکہ نام کوروے موسوم کئے گئے ہیں۔ پانڈو راجہ کے دو بیویاں تھیں ایک راجہ کنتی بھوج کی لے پالک بیٹی پریتھا اور دوسری سالیا راجہ کی بیٹی مدری تھی۔ پانڈو کو سیر و شکار کا بیحد شوق تھا اس لئے وہ راج پاٹ چھوڑ کر اپنی دونوں بیویوں سمیت کوہِ ہمالیہ کے دامن میں چلا گیا۔ ایک روز ایک ہرن اور ہرنی اُس کے تیر کا نشانہ بنے۔ لیکن در اصل یہ صید زبون ہرن اور ہرنی کے بھیس میں ایک رشی اور اُس کی زوجہ تھے۔ رشی نے تیر انداز کو بد دعا دی کہ وہ اُسی روز موت کا شکار ہو جائیگا جس روز وہ اپنی کسی بیوی سے ہم آغوش ہوگا۔ اس سراپ سے بچنے کے لئے پانڈو برہمچاری بن گیا۔ لیکن اُس کی بیویوں کو ہر وقت اولاد کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ بالآخر دیوتاؤں کو اُن کے حال پر رحم آیا۔ چنانچہ دھرم۔ وایو اور اندر دیوتا یکے بعد دیگرے پریتھا سے ہم کنار ہوئے جس سے جودھیشٹر بھیم اور ارجن پیدا ہوئے۔ اور پانڈو کی دوسری بیوی مدری سے توام دیوتا آسون ہم آغوش ہوئے جس سے نکل اور سہدیو پیدا ہوئے۔ یہی پانچوں بھائی پانڈو برادران کہلاتے ہیں یہاں بھی کثرت البعول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بہرحال کوروؤں اور پانڈوؤں کے حسب نسب کے متعلق یہی وہ واقعات ہیں

جو مہا بھارت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اسے نسب نامہ سمجھو یا گورکھ دھندا لیکن یہ امر واضح ہے کہ نہ ایک سو کورو دھرت راشٹر کے نطفہ سے تھے۔ نہ پانچوں پانڈو برادران برہمچاری راجہ پانڈو کی اولاد تھے۔ اُن کی رگوں میں چندر بنسی چھتری راجہ سنتانو کے خون کا ایک قطرہ بھی منتقل نہیں ہوا تھا۔ کوروؤں اور پانڈوؤں میں کوئی نسلی تعلق ظاہر نہیں ہوتا مندرجہ بالا مضحکہ خیز بیانات سے واضح ہے کہ کورو اور پانڈو مختلف النسل تومیں تھیں جن کو شاعرانہ عجوبہ پسند تخیل کی بے اعتدالی نے ایک رشتہ میں منسلک کرنے کی پیچ در پیچ کوشش کی ہے۔

یہ بیان کہ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام راجاؤں نے شرکت کی تھی یہاں تک کہ جنوبی ہند سے پانڈیہ راجہ اور اقصائے مشرق سے پراجیوتیشا یعنی آسام کا راجہ جنگلوں اور پہاڑوں کو چیرتے ہوئے کوروچھیتر کے میدانِ کارزار میں آ دھمکے تھے بالکل من گھڑت ہے۔ دہلی کے قرب و جوار میں ایک محدود رقبہ کے لئے ہستناپور اور اندرپرست کے دو تاجداروں کی معمولی مقامی جنگ میں دور دراز ممالک کے فرمانرواؤں کا ہزاروں میل کی مسافت طے کرکے آنا اور شریکِ جنگ ہونا خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ برِ اعظم ہند کا سب سے بڑا حصہ گھنے مہیب جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ذرائع آمد و رفت اور حمل و نقل مسدود تھے قیاس میں نہیں آتا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جنگ ٹرائے کے واقعات کو جب ہومر جیسے قادر الکلام شاعر نے اپنی آتش مقالی اور سحر بیانی سے آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا تو یونان کے اکثر تاجدار اس جنگ میں اپنے بزرگواروں کی شرکت اپنے لئے باعثِ صد ناز و افتخار خیال کرنے لگے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب کہ کرشنا دوائی پاینا بیاس نے اپنی طلسم کاری و جادو بیانی سے کوروؤں اور پانڈوؤں یا بھارت اور پنچالہ کی معمولی مقامی جنگ کے واقعات پر اغراق و مبالغہ کا رنگ و روغن چڑھا کر اُنہیں نہایت پُر شوکت پُر عظمت اور دلفریب لباس میں پیش کیا تو ہر شخص رجالِ داستان کے اولوالعزمانہ کارناموں اور مردانہ ہمتوں کا گرویدہ بن گیا۔ اور تمام ہندی راجاؤں کے دل میں شوق چرایا کہ وہ اپنے فرضی یا حقیقی مورثوں کو اس معارکۂ عظیم کی شرکت سے مفتخر کریں۔ حسنِ اتفاق سے ہومر کی ایلیڈ کی طرح بیاس کی تصنیف کردہ مہا بھارت جامد و ساکن نہ تھی بلکہ نہایت لچکدار اور تغیر پذیر تھی۔ اس لئے اس میں بہ اقتضائے زمانہ ترمیم و اضافہ ہوتا گیا۔ ہر گوشۂ ملک کے شہریاروں نے برہمن ادیبوں اور شاعروں کی مدد سے اپنے نامور مورثوں کو مہا بھارت کی جنگ میں شریک کرا لیا۔ یہاں تک کہ اقصائے جنوب کے تامل راجاؤں اور مشرقِ بعید کے پراجیوتیشائی حکمرانوں کو بھی اس عظیم الشان رزمنامہ میں معزز و ممتاز جگہ مل گئی۔

اگرچہ عام طور پر مہا بھارت کی تصنیف بیاس سے اور رامائن کی والمیکی سے منسوب کی جاتی ہے لیکن اُن کی غیر معمولی ضخامت اور اُن کے مختلف حصوں کے اسالیبِ بیان کے تباین و تنوع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فردِ واحد کے

رشحاتِ کلک و تراوشِ فکر کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مختلف شاعروں کی مغز پاشیوں اور ندرت طرازیوں کی رہینِ منت ہیں - ان دو رزمناموں کے تقدم و تاخر کا مسئلہ بھی متنازعہ فیہ ہے - مورخین کا ایک گروہ مہابھارت کو رامائن سے مقدم خیال کرتا ہے لیکن دوسرے گروہ کے نزدیک رامائن کو مہابھارت پر تقدیم حاصل ہے - ان دو رزمناموں میں معاشرہ و ہیئت اجتماعیہ کے جو مرقعے پیش کئے گئے ہیں وہ اکثر اعتبارات سے قریب قریب یکساں ہیں لیکن بعض امور میں دونوں تصویریں اختلاف کا پہلو بھی رکھتی ہیں - یہ مغائرت اُن کے بالاستیعاب مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے - اور یہی اختلاف و مغائرت اُن کے تقدم تاخر کے نزاعی مسئلہ پر بھی بہت کچھ روشنی ڈالتی ہے - چنانچہ رامائنی چھتریوں میں وہ آتش مزاجی - شوخ چشمی - جوش و خروش - غیظ و غضب - تہور - خودداری اور تمکنت نہیں پائی جاتی جو مہابھارتی چھتریوں کا سرمایۂ حیات تھی - رامائنی چھتری ہر جگہ برہمنوں سے عجز و انکسار اور کسرِ نفسی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں - اگرچہ راجہ جنک کو بلحاظ علمیت - تقدس - نیک کرداری اور راستبازی کے تمام معاصر برہمن رشیوں پر فوقیت حاصل ہے تاہم وہ ایک ادنیٰ خادم کی طرح برہمن سدنند کا ادب و احترام کرتا ہے - اسی طرح چھتری برن رام برہمن اور پرسو رام پر ہر اعتبار سے فضیلت رکھتا ہے اور اُسے زیر و مغلوب بھی کرتا ہے لیکن بڑی عاجزانہ التجاؤں اور خاکسارانہ معذرت خواہیوں کے بعد - رام اور پرسو رام کی جنگِ زرگری زمانۂ رزمیہ کے برہمنوں اور چھتریوں کی باہمی رقابت رشک و حسد اور معاندت و منافست کی آئینہ داری کرتی ہے - رامائن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کا مبارزانہ و شجاعانہ دور ختم ہو چکا تھا - دریائے گنگا اور جمنا کی زرخیز وادیوں میں صدیوں کے قیام نے ہندی آریوں کے قویٰ مضمحل کر دیئے تھے - رامائن میں ہم ایسے رجال و کردار کا فقدان پاتے ہیں جن کا جفاکشی - مشکل پسندی - اکھڑپن - ہٹ دھرمی وغیرہ ہو - لیکن یہ اوصاف مہابھارت کے سورماؤں کا طرۂ امتیاز ہیں - کرن دریودھن بھیم جیسے ضدی - جری - پُرنخوت - راسخ العزم - کوہ ہمت اور پیل تن کرداروں کی رامائن میں ایک بھی نظیر نہیں ملتی - رامائن کی ممتاز شخصیتوں میں حاسد و مکار کیکئی اور وہ فداکار و شوہرپرست لیکن بدنصیب سیتا شامل ہے جسے مدت العمر رنج و اندوہ سے چھٹکارا نہ ملا - رامائن کے ابطال نرم دل - معتدل مزاج - شائستہ و مہذب نظر آتے ہیں - وہ برہمن خوارنہ کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور آداب و مراسم کے بڑے پابند ہیں - وہ لڑتے بھی ہیں تو عزم و ثبات سے نہیں بلکہ محض ادائی و میکانی طریق پر - قصہ کوتاہ مہابھارت ایک ایسے معاشرہ کی تصویر پیش کرتی ہے جس کے افراد جفاکشی - دلیری - تہور اور جنگ آوری کے لحاظ سے ویدی آریوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن رامائن ایک ایسی ہیئتِ اجتماعیہ کے عادات و اطوار کی آئینہ دار ہے جس کے ارکان دریائے گنگا اور جمنا کی سیرحاصل وادیوں

میں مست سے رہتے رہتے کمزور۔ سدنہ بار۔ قانون پیرو۔ شائستہ وتعلیم یافتہ بن گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کے واقعات کو رامائن کے واقعات پر تقدیم زمانی حاصل ہے۔

تقدم و تاخر کے مسئلہ سے قطع نظر ان دو رزمناموں کی تاریخ تصنیف کا مسئلہ بھی بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔ تاہم اُن کی تصنیف کے زمانہ کا تعین ضروری امر ہے کیونکہ تاریخی نقطۂ نظر سے واقعات بغیر وقتیات (کرونولاجی) کے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ متعلم تاریخ کے نزدیک واقعات کی معنی خیزی وافادہ بڑی حد تک اُن کے زمانۂ ایقاع کی دریافت پر منحصر ہے۔ زمانہ کا تعین ہی وہ شے ہے جو تاریخ کو قصہ کہانیوں سے متمائز کرتی ہے لیکن رامائن اور مہابھارت کی تدوین و ترتیب کے زمانہ کی تعیین کے متعلق علما و مورخین کے پیش کردہ نظریات و آرا کی کثرت اور اُن کے اختلافات انسان کو آئینۂ حیرت بنا دیتے ہیں۔ اگر ایک فریق ان رزمناموں کا دامن چودھویں صدی قبل مسیح سے وابستہ قرار دیتا ہے تو دوسرا فریق انہیں ولادت مسیح سے پانچ صدیوں کے بعد کی تصنیف کہتا ہے۔ فی الحقیقت اُن کی تاریخ تصنیف کا مسئلہ ابھی تک اطمینان بخش طریقہ پر حل نہیں ہو سکا ہے۔ کیا یہ امر کچھ کم تعجب خیز ہے کہ جن ادبی شاہکاروں نے تمام عالم میں دھوم مچا رکھی ہو۔ جنہیں ربع مسکوں کے ہر حصہ سے حسن قبول کی سند حاصل ہو چکی ہو۔ جن کی نظیر نہ صرف ہندی بلکہ ساری دنیا کی ادبیات میں از قبیل شاذ ہو ان کے زمانۂ تصنیف کی تلاش میں بڑے بڑے محققین اور سراغ رسان تقریباً دو ہزار سال کا سفر کریں۔ اور ۱۴۰۰ سنہ ق م اور ۵۰۰ سنہ ء تک کے ہر سن و سال کو تحقیق کی کسوٹی پر کسیں تاہم اُن کی دقیقہ سنج محنتیں نگار کامیابی سے ہمکنار نہ ہوں اور اُن کی تفتیش کا دامن گوہر مراد سے خالی نظر آتے۔ بہرحال محققین و مبصرین نے کمی علم کو دادِ ذہانت دے کر پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوران تحقیقات میں انہوں نے ایسی ایسی موشگافیوں۔ نکتہ سنجیوں اور باریک بینیوں سے کام لیا ہے کہ اُن کی کاوش وکاہش رائے عامہ سے خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہتی۔ تحقیق قریبہ کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

عام طور پر رامائن کا مصنف والمیکی اور مہابھارت کا بیاس قرار دیا جاتا ہے لیکن ان رشیوں کے نام ویدی مصنفین کی فہرست میں بھی پائے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ویدی منتروں کی تشریح اور مذہبی کلام کی توضیح کے لئے متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں جو "برہمنا" کہلاتی ہیں۔ ہر چہار وید کے لئے الگ الگ "برہمنا" ہیں۔ برہمنا نہایت مبسوط نثری کتابیں ہیں۔ اُن کو ویدوں سے وہی تعلق و مناسبت ہے جو تلمود کو توریت سے یا احادیث کو قرآن سے ہے لیکن فرق یہ ہے کہ تلمود اور احادیث کا شمار وحی شدہ صحائف میں نہیں ہے لیکن وحی کا ہندوانہ تصور وید

اور برہمنا دونوں پر محیط ہے۔ چونکہ برہمن طالب علموں کا حافظہ "برہمنا" جیسی مبسوط و ضخیم تصانیف کی گرانباری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ویدی اصول و ضوابط کو نہایت مختصر اور جامع الفاظ میں بیان کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ کوششیں "سُتری ادبیات" کی شکل میں بارآور ہوئیں "سُتر" ضرب الامثال کی طرح مختصر الالفاظ لیکن کثیر المعانی ہوتے ہیں۔ "ستری مصنفین نے گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ شرح و بسط اور تفصیل و ایضاح برہمنا کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اُس کے برعکس اجمال و ایجاز و اختصار "ستری ادبیات" کے مایہ خمیر میں داخل ہیں۔ "ستر" وہ دستور العمل ہیں جنہیں پوجاریوں اور پروہتوں کے لڑکے بآسانی حفظ کر کے مذہبی رسوم کی ادائی کے لائق بن جاتے تھے۔ جس طرح ہر وید کے متعلق کئی کئی "برہمنا" تصنیف ہوئے تھے اسی طرح ہر وید کے اصول و احکام متعدد "ستری رسالوں میں متراکز و متراکم کئے گئے تھے۔ الغرض ہر وید کے متعلق چند "ستری دستور العمل موجود تھے۔ اس بحث سے غرض صرف اس قدر ہے کہ "ستری ادبیات" کی ماہیت ناظرین کے ذہن نشین ہو جائے۔ یجروید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیاہ یجروید دوسری سفید یجروید۔ آخر الذکر کے مصنفین کی فہرست میں بیاس پر سریا کا نام اور اول الذکر کے "ستری رسائل کے زمرۂ مصنفین میں والمیکی کا نام شامل ہے۔ "اتاریہ برہمنا" میں جو رگ وید کی سب سے قدیم و مشہور شرح ہے مہابھارت کے چند داستانوی رجال مثلاً جنامیجایا ابن پرکشت اور بھارت ابن دشیانتا کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ اس طرح مہا بھارت کے بعض عناصر کی قدامت ویدی زمانہ تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر کرشنا سوامی آئنگر کا قیاس ہے کہ وہ فرقہ وار جنگ جو مہابھارت کا نقرہ (ریڑھ کی ہڈی) ہے ۱۵۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیانی زمانہ میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔" مسٹر رومیش چندر دت اس جنگ کی تاریخ ۱۲۵۰ ق م قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر کا بیان ہے کہ ساتویں صدی قبل مسیح کے مشہور قواعد نویس پانی نی کے زمانہ میں مہا بھارت کا کوئی نسخہ ضرور موجود تھا۔ مسٹر پارجیٹر کا خیال ہے کہ جنگ مہابھارت دسویں صدی قبل مسیح میں واقع ہوئی تھی۔ پرفیسر ہاپکینس نے مہابھارت کی تصنیف کا زمانہ ۴۰۰ ق م اور ۲۰۰ ق م کا درمیانی دور قرار دیا ہے۔ پروفیسر کلہورن نے مہابھارت کی تصنیف کی تاریخ ۵۰۰ ق م۔ مسٹر جے کرسٹے نے ۱۰۰ء۔ اور "ٹرانسفارمڈ ہندوازم" (متبدلہ ہندویت) کے مصنف نے تیسری صدی عیسوی بیان کی ہے۔ پروفیسر ویبر کا قول ہے کہ مہابھارت نے اپنی موجودہ شکل ولادت مسیح کے کئی صدیوں بعد اختیار کی تھی۔

اسی طرح رامائن کی تصنیف کے متعلق بھی علما کے خیالات و افکار مختلف ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر کرشنا سوامی آئنگر کا قیاس ہے کہ رامائن کے واقعات ۱۰۰۰ ق م اور ۵۰۰ ق م کے درمیانی دور میں پیش آئے ہونگے۔ مسٹر گرائرسن کا بیان

ہے کہ آٹھویں صدی قبلِ مسیح میں رامائن اپنی ابتدائی شکل میں موجود تھی۔ پروفیسر ریپسن اور ڈاکٹر کیتھ نے رامائن کو تیسری صدی قبلِ مسیح کی تصنیف قرار دیا ہے۔ "ٹرانسفار مڈ ہندوازم" کا مصنف راوی ہے کہ رامائن پانچویں صدی قبلِ مسیح میں لکھی گئی تھی۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ رامائن نے دوسری صدی عیسوی میں اپنی موجودہ شکل اختیار کی۔ الغرض مختلف علما نے رامائن اور مہابھارت کے زمانۂ تصنیف کے متعلق متضاد و متباین رائیں پیش کی ہیں۔

اِن اختلافات کے مدِنظر ایک سطح آشنا شخص پکار اُٹھتا ہے کہ ان نام نہاد علما نے تلاش وتحقیق کی زحمت سے جی چرا کر محض اٹکل پچو سے کام لیا ہے اور جس کے دل میں جو آیا تکہ مارا ہے لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ ان بظاہر متضاد آرا و نظریات کی تہ میں واقعیت و صداقت کا پہلو مضمر ہے۔ غور و فکر کے بعد یہ متفرق بیانات ایک نظام و سلسلہ کے تحت لائے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر میکڈونلڈ نے اپنی مشہور کتاب "سنسکرت ادبیات کی تاریخ" میں رامائن اور مہابھارت کے زمانۂ تصنیف کے مسئلہ پر بڑی قابلیت کے ساتھ بحث کی ہے۔ اُنھوں نے مختلف آرا و نظریات کا موازنہ و مقابلہ اور واقعات کے مختلف پہلوؤں کی چھان بین کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہر آئینہ قرینِ قیاس و قابلِ تسلیم ہے۔ ہم پروفیسر صاحب کی رائے معہ ضروری ترمیم و اضافہ کے یہاں درج کرتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ان دو رزمناموں کے تاریخی جراثیم کا سراغ نہایت قدیم زمانہ میں ملتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ عوام مہابھارت کی تصنیف کو فردِ واحد سے منسوب کرتے ہیں جس کا نام بیاس رشی بتایا جاتا ہے لیکن تحقیق قریبہ کی رو سے "بیاس" علم نہیں بلکہ اسمِ صفت ہے۔ اس لفظ کے معنی "مصنف" کے ہیں۔ اس لحاظ سے اُس کا اطلاق ہر اُس شخص پر ہو سکتا ہے جس نے مہابھارت جیسی ضخیم کتاب کے کسی نہ کسی باب یا مقالہ کی تصنیف میں حصہ لیا ہے۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ کورو اور پنچالہ قوموں کے درمیان دسویں صدی قبلِ مسیح سے پیشتر ہی ایک محاربۂ عظیم واقع ہوا تھا جس میں آس پاس کے راجاؤں نے بھی فریقین کی حمایت کی تھی۔ اس جنگ میں نمایاں حصہ لینے والے ناموروں اور سورماؤں کے شجاعانہ کارناموں کے متعلق رزمی گیت ۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ وضع کئے گئے تھے۔ غالباً ان گیتوں کا مصنف وہی بیاس پرسریا رشی تھا جس کا نام ہم "سفید یجروید" کے رشیوں کی فہرست میں درج پاتے ہیں۔ ان گیتوں کو بھاٹ یا مغنی بڑے بڑے جلسوں مجمعوں۔ عظیم الشان "یگ" اور قربانیوں کے موقعوں پر گایا کرتے تھے۔ کئی پیڑھیوں تک یہ گیت زبانی طور پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتے رہے۔ بالآخر چار صدیوں کے بعد یعنی چھٹی صدی قبلِ مسیح میں ایک ذہین و ذکی شاعر کرشنا دوائی پائنا نے ان منتشر و پراگندہ گیتوں کو ترتیب دیکر ایک منظم مسلسل و مربوط رزمیہ کے قالب میں ڈھالا۔ یہ رزمیہ

بہت مختصر اور صرف آٹھ ہزار اشلوکوں پر مشتمل تھی۔ اس میں موجودہ مہابھارت کی طرح بے تعلق اور غیر ضروری عناصر شامل نہ تھے۔ اس رزمیہ کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اُس میں پانڈوؤں کو جو غالباً ایک زرد فام غیر آریائی پہاڑی قوم کی نسل سے تھے نہایت بے رحم ظالم اور سفاک دکھایا گیا تھا اور کوروؤں کو جن کی رگوں میں آریائی خون غالب تھا مظلوم ٹھیرا کر اُن کی تصویر ایسی المناک اور پُر درد کھینچی گئی تھی کہ پڑھنے والوں کا دل بھر آتا تھا اور مظلوم و مقتول کوروؤں کے ساتھ ہمدردی و غمگساری کے جذبے پیدا ہونے لگتے تھے۔ ایک برہمن نژاد آریائی شاعر کے لئے اس قسم کا مرقع پیش کرنا ایک فطری امر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ برہما کو پرجاپتی اور قادرِ مطلق ہستی مانا جاتا تھا۔ اور وشنو اور شِو کو برہمنی دیومالا میں کوئی امتیازی جگہ نہیں ملی تھی اور کرشنا کی حیثیت تو ارجن کے رتھ بان سے بڑھ کر نہ تھی۔

بمرورِ زمانہ مختلف شاعر اور مغنی اس رزمیہ میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ کرتے گئے۔ مذہبی خیالات و اعتقادات کی تبدیلیوں کے پہلو بہ پہلو مہابھارت میں بھی تغیر و تبدل رونما ہوتا گیا۔ نئی نئی باتیں اور نئے نئے واقعات اس میں داخل کئے گئے۔ بالآخر تین صدیوں کے بعد تصویر کی کایا ہی پلٹ گئی۔ آریہ و غیر آریہ کی تفریق بالکل مٹ گئی اور تمام اہلِ ہند مل جل کر ایک قوم بن گئے۔ بودھ اور جین مذہب کی مساویانہ تعلیم نے نسلی و فرقہ واری تشتت کے مٹانے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مختلف النسل کورو اور پانڈو نہ صرف متحد النسل بلکہ ایک ہی خاندان کے ارکان اور عمزاد بھائی قرار دئیے گئے۔ اب بے رحم پانڈو تمام نیکیوں اور خوبیوں کے سرمایہ دار بن گئے۔ اُن کی جنگجوئی و خونخواری جو پہلے قتل و سفاکی کی محرک ہوئی تھی اب دلیری و شجاعت کی دلیل بن گئی۔ پانچ شوہروں والی دروپدی جسے ویدی دھرم عصمت باختہ تصور کرتا تھا اب عفت کی دیبی بن گئی اور اندر کی اپسراؤں پر بھی بازی لے گئی۔ مظلوم و بے کس کورو اپنی کمزوری و شکست کی وجہ سے مجسمۂ شیطانی قرار پائے۔ الغرض پانڈوؤں کے محاسنِ اخلاق کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ایک کر دئیے گئے اور کورو ہدفِ ملامت و موردِ الزام بن گئے۔ خطاکار معصوم اور معصوم خطاکار ثابت کئے گئے۔ مہابھارت کے اشلوکوں کی تعداد پہلے سے تگنی ہوگئی۔ یہ تمام تبدیلیاں اُس زمانہ میں واقع ہوئی تھیں جب کہ برہمنی دیومالا میں وشنو اور شِو کو برہما کا ہمسر و ہم پایہ تسلیم کیا گیا اور بودھیوں کی دیکھا دیکھی برہمن بھی تثلیث (تری مورتی) کے قائل ہوگئے تھے۔ بودھی تثلیث کے ارکان (۱) بدھ یعنی بانیٔ مذہب (۲) دھرم یعنی مذہبی اصول و ضوابط اور (۳) سنگھا یعنی حلقۂ رہبان تھے لیکن برہمنی تثلیث تین دیوتاؤں برہما وشنو اور شِو پر مشتمل تھی۔ بہرحال سنہ ۳۰۰ ق م میں ویشم پائنا نامی ایک سحر بیان شاعر نے اس تبدیل شدہ رزمیہ میں ترمیم و اصلاح کر کے اس کے اشلوکوں کی تعداد چوبیس ہزار تک پہنچا دی ویشم پائنا ان چوبیس ہزار اشلوکوں

کا مصنف نہ تھا بلکہ اُس نے صرف مختلف شعرا کے کلام کو ترتیب دیا تھا اور جہاں جہاں کھانچے پڑے تھے انہیں پُر کیا تھا۔

اس کے بعد مہابھارت میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہونے لگا جوں جوں شعرا کی ملکی وجغرافیائی معلومات بڑھتی گئیں مہابھارت کی جزئیات وتفصیلات میں ترقی ہوتی گئی۔ جب ہندوستان کے دور ودراز علاقوں میں سلسلۂ مواصلات قائم ہوگیا اور مہابھارت کی شہرت ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچی تو ہر علاقہ کے فرمانرواؤں نے برہمن شعرا کے ذریعہ سے اپنے اسلاف کو مہابھارت کی جنگ میں شریک کرلیا۔ علاوہ بریں موجودہ مہابھارت میں یاونا، سکا، پہلوا وغیرہ کے بھی تذکرے پائے جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یونانیوں۔ سیتھیوں اور پارتھیوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد مہابھارت نے اپنی موجودہ شکل وہیئت اختیار کی ہے۔ موجودہ مہابھارت میں کوروؤں اور پانڈوؤں کے محاربے کے واقعات کے علاوہ مختلف روایات فلسفیانہ مباحث۔ توہمات وعقاید قصص وحکایات وغیرہ شامل ہیں۔ مسٹر جے کرسٹے کا خیال ہے کہ "جب ملک ہند کی فضا یاونا۔ سکا اور پہلوا وغیرہ بدیسی وحشی حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپ سے گرد آلود اور علم وفضل کا مطلع مکدر ہونے لگا تو برہمنوں کو خوف ہوا کہ اُن کے وہ قدیم ادارات وروایات۔ مذہبی قصص وحکایات اور رسوم وعقاید جو اس وقت تک ضبطِ تحریر میں نہیں آئے تھے کہیں بدیسی سیلاب کی زد میں آکر خس وخاشاک کی طرح بہ نہ جائیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے تمام غیر محررہ علمی ومذہبی جواہر ریزوں کو صرصرِ حوادث کے تخریبی اثرات سے بچانے کے لئے ایک جگہ جمع کیا اور پھر انہیں مہابھارت اور منا وادھرم شاستر کے قلعہ میں محفوظ کردیا۔" الغرض مہابھارت میں تمام غیر متعلق روایات و واقعات کی شرکت کا باعث غیر ملکی حملوں کا خطرہ تھا۔ اِن امور سے ظاہر ہے کہ مہابھارت کی آخری تشکیل ہندی اور بدیسی قوموں کے تصادم کے بعد عمل میں آئی تھی۔ اہلِ ہند یونانیوں سے تو اُس وقت روشناس ہوچکے تھے جب کہ سکندرِ اعظم نے ۳۲۶ ق م میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ لیکن یہ محض فوجی دھاوا تھا جس کا کوئی مستقل اثر اس ملک پر نہیں پڑا۔ البتہ ۱۹۰ ق م میں جب چوتھے یونانی باختری فرمانروا ڈمیٹریس نے پنجاب اور وادیٔ سندھ پر تسلط حاصل کیا تو اہلِ ہند یونانی تہذیب ومعاشرت سے اچھی طرح واقف ہوئے۔ یہی یونانی اہلِ ہند کی اصطلاح میں "یاونا" کہلاتے تھے۔ پارتھیوں کی قوت وعظمت سے اہلِ ہند پہلے پہل دوسری صدی قبل مسیح کے اواسط میں آگاہ ہوئے جب کہ اشکانیانی فرمانروا متھراڈیٹس اول نے پنجاب پر حملہ کرکے دریائے سندھ اور جہلم کے درمیانی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ پارتھیوں کو سنسکرت ادبیات میں پہلوا کہا گیا ہے۔ سکا سے سیتھی قومیں مراد تھیں پہلی

صدی قبلِ مسیح کے اوائل ہی میں سیتھیوں کے گروہ کے گروہ ہندوستان میں داخل ہوئے اور انہوں نے ٹکسیلا - متھرا - سندھ اور گجرات میں حکومتیں قائم کر لیں - ان تاریخی شہادتوں کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ پہلی صدی قبلِ مسیح کے اواخر میں مہابھارت نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی تھی جس آخری نامور شاعر نے مہابھارت کو ترتیب دے کر اُسے جدید قالب ڈھالا وہ ساوتی تھا - بعض مورخین کا خیال ہے کہ اُس کے بعد بھی مہابھارت میں ترمیم و اضافہ ہوا کیا اور اُس نے اپنی مستقل و معین ہیئت سنہ ۲۰۰ء میں اختیار کی - بہرحال موجودہ مہابھارت میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ اشلوک ہیں - موجودہ مہابھارت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کرشنا کو جو ابتدائی مہابھارت میں محض ایک جادو سردار اور ارجن کا رتھ بان تھا وشنو کا اوتار تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس رزمنامہ میں سب سے زیادہ واجب الاحترام ہستی کرشنا ہی کی ہے - الغرض مہابھارت کی ارتقائی تاریخ کے پانچ اہم زینے ہیں - اِس رزمنامہ نے پہلا زینہ سنہ ۱۰۰۰ ق م میں - دوسرا سنہ ۶۰۰ ق م میں تیسرا سنہ ۳۰۰ ق م میں - چوتھا سنہ ۱۰۰ ق م میں اور پانچواں سنہ ۲۰۰ء میں طے کیا -

یہی حال رامائن کا ہے وہ بھی کسی خاص زمانہ کی تصنیف نہیں ہے - عام طور پر مشہور ہے کہ رامائن کا مصنف والمیکی تھا - ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مہابھارت کے اولین مصنف بیاس پرسریا کا نام "سفید یجروید" کے رشیوں کی فہرست میں اور والمیکی کا نام "سیاہ یجروید" کے سُتروں کے مصنفین کی فہرست میں پایا جاتا ہے - اگرچہ ترتیبِ زمانہ کے لحاظ سے "سیاہ یجروید" "سفید یجروید سے زیادہ قدیم ہے لیکن سُتری ادبیات زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں - مسٹر رومیش چندر دت نے اپنی کتاب "تاریخ تمدنِ ہند" میں سنہ ۲۰۰۰ ق م سے سنہ ۱۴۰۰ ق م تک کے زمانہ کو ویدی دور، سنہ ۱۴۰۰ ق م سے سنہ ۱۰۰۰ ق م تک کے زمانہ کو رزمیہ دور اور سنہ ۱۰۰۰ ق م اور سنہ ۳۲۰ ق م کے درمیانی زمانہ کو عقلی دور سے تعبیر کیا ہے - ان کے خیال کے مطابق رگ وید ویدی دور کی - بقیہ تین وید اور برہمنا رزمیہ دور کی اور ستری ادبیات عقلی دور کی پیداوار ہیں - اس سے ظاہر ہے بیاس پرسریا والمیکی سے چند صدی پیشتر پیدا ہوا تھا - غالبًا آٹھویں صدی قبلِ مسیح ہی سے اکشواکو خاندان کے رام نامی ایک سورما کے شجاعانہ کارناموں کے متعلق مختلف گیت اور منظوم قصے اجدھیا کے درباری شعرا - بھاٹوں اور رامشگروں کے زبان زد چلے آرہے تھے بالآخر چھٹی صدی قبلِ مسیح میں والمیکی شاعر کی جدت طرازِ طبیعت اور زورِ بیان نے اِن گیتوں اور قصوں میں ویدی دیوتا اندر اور اُس کی زوجہ سیتا (مادر گیتی) کے صنمیاتی افسانوں اور روایتوں کی آمیزش سے ایک دلکش و دلچسپ رزمیہ نظم تیار کر لی - رامائن کا یہی قدیم نسخہ تھا - والمیکی کے تصنیف کردہ رزمنامہ کی قدامت اس امر سے ثابت ہے کہ اس میں کہیں پاٹلی پتر کا ذکر نہیں ہے -

حالانکہ رامائن کا بطل (ہیرو) کئی بار اس سرزمین سے گذرا تھا جہاں بعد میں پاٹلی پتر آباد ہوا۔ راجہ اشوک کا بھی اس میں حوالہ نہیں پایا جاتا۔ اُس وقت کا معاشرہ ابوی یا پدری (patriarchal) زینہ پر تھا۔ کوسالا کا پایۂ تخت اجدھیا سے سراوستی میں منتقل نہیں ہوا تھا اور نہ ابھی اُس کا نام سکیتا پڑا تھا۔ اس میں یاونا۔ سکا۔ پہلوا وغیرہ بدیسی قوموں کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ رآم اور دوسرے سورما محض انسان تصور کئے گئے ہیں جن میں الوہیت کا عنصر مفقود تھا۔ الغرض والمیکی کا زمانہ کسی طرح چھٹی صدی قبلِ مسیح کے بعد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی قدیم زمانہ میں والمیکی جیسے اعلیٰ قدرت فن کار و قادر الکلام شاعر کے ہاتھوں رامائن نے مربوط و منظم شکل اختیار کر لی تھی۔ اپنی رامائن میں والمیکی نے خود کو رام کا ہم عصر قرار دیا ہے لیکن یہ محض اُس کے تخیل کی پیداوار ہے۔ اول تو رآم کی شخصیت ہی مشتبہ ہے تاہم اگر اسے گوشت و خون کا انسان بھی تسلیم کر لیا جائے تو وہ والمیکی سے مدتوں پہلے اس تیرہ خاکدان میں جلوہ گر ہوا ہوگا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ والمیکی نے اپنی رزمیہ نظم رآم کے فرزند کوس اور لاوا کو یاد کرا دی تھی۔ رام نے جب "اسومیدھ" (قربانیٔ اسپ) کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی تو اس موقعہ پر کوس اور لاوا نے بھرے مجمع میں والمیکی کی رزمیہ نظم دھرائی تھی۔ یہ تمام باتیں حقیقت سے بعید اور شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں۔ دراصل لفظ "کوسیلاوا" کے معنی رامشگر یا مطرب کے ہیں۔ والمیکی کے تصنیف کردہ رزمناموں کو پیشہ ور "کوسیلاوا" (مطرب) ساز و ستار پر گاتے پھرتے تھے۔ پس شاعرانہ تخیل کی پرواز نے اُن رامشگروں کو رام کا فرزند قرار دے دیا۔ اور زمانۂ مابعد میں جب رامائن میں ترمیم و اضافہ ہوا تو کوس اور لاوا کی پیدائش، والمیکی رشی کے گھر اُن کی پرورش، رام کے رہا کردہ اسپ کے ساتھ جو فوج روانہ کی گئی تھی اُس سے ان دونوں فرزندوں کا مقابلہ، "اسومیدھ" کے موقع پر اُن کا مجمع کو رامائن سنانا اور رام سے اُن کا تعارف وغیرہ جیسے من گھڑت واقعات رزمنامہ میں داخل کر دیئے گئے۔ آج کل بھی شمالی ہند میں ایک قسم کے بھاٹ گاؤں گاؤں شعر خوانی کرتے پھرتے ہیں جنہیں صوبۂ بہار کی اصطلاح میں "رام جی کا ٹہلوا بیٹا" کہتے ہیں کوس اور لاوا کے واقعات موجودہ رامائن کے ساتویں کھنڈ (حصہ) میں درج ہیں لیکن والمیکی کی رامائن صرف پانچ کھنڈوں پر مشتمل تھی۔ ساتواں حصہ زمانۂ مابعد کا اضافہ ہے۔

پروفیسر لیسن کے بیان کے مطابق والمیکی سے پیشتر ہی اس رزمنامہ پر چار ارتقائی دور گذر چکے تھے۔ اول اول جو رزمیہ گیت یا روایات رائج تھیں اُن میں رام کی جلاوطنی پر قصہ ختم ہو جاتا تھا۔ جلاوطنی کے لئے کوہ ہمالیہ کا دامن منتخب کیا گیا تھا۔ اُس وقت دکن جیسے کالے کوسوں دور اور لامعلوم مقام میں بن باسی کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ بہت زمانہ کے بعد جب آریہ رشی کوہِ بندھیاچل کو عبور کر کے دکن میں وارد ہوئے اور یہاں کی بادیہ گرد وحشی

قوموں سے انہیں سابقہ پڑا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ سارا ملک جنگل ہی جنگل ہے جہاں بجز جنگلی قوموں کے مہذب انسان بستے ہی نہیں۔ اِن رشیوں کے ذریعہ سے شمالی ہند کے شاعروں کو جب دکن کے مہیب جنگلوں کا حال معلوم ہُوا تو اُنہوں نے رزمنامہ میں دلچسپ ترمیم و اضافہ کیا اور جلاوطنی کا مرکز کوہِ ہمالیہ سے دریائے گوداوری کے کنارے ڈنڈکارن میں منتقل کر دیا جہاں رام نے برہمن رشیوں کو وحشی باشندوں کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ رزمنامہ میں تیسرا بڑا اضافہ اُس وقت کا ہے۔ جب آریہ (اگر نسلی اختلاط و امتزاج کے بعد بھی وہ آریہ کہلانے کے مستحق ہوں) گروہ کے گروہ کلنگار کے راستے دکن میں داخل ہوئے اور اُن علاقوں میں آباد ہو گئے جو زمانہ مابعد میں ویدار بھا اور مہاراشٹر سے موسوم ہوئے۔ یہ علاقے اس وقت زیادہ تر جنگلوں سے ڈھکے ہوئے اور وحشی قوموں کے مسکن تھے۔ آریوں نے انہیں رام کرنے اور دائرۂ تہذیب میں لانے کی کوشش کی۔ رامائن میں اُن کی یہ کوششیں رآم سے منسوب کر دی گئی ہیں چنانچہ ہم رام کو بعض وحشی قوموں کے ساتھ دست و گریباں اور بعض کے ساتھ دست بداماں دیکھتے ہیں۔ لیکن اس وقت تک آریہ مہذّب تاملوں سے بالکل ناواقف تھے۔ چوتھی بار کا اضافہ آریوں کے لنکا سے واقف ہونے کے بعد کا ہے۔ جب اُن کو جزیرۂ لنکا کا علم ہُوا تو انہوں نے رآم کے لنکا پر حملہ آور ہونے اور وہاں کے رکشس راجہ کو قتل کرنے کے واقعات تصنیف کر کے رامائن میں شامل کر لئے۔

ساتویں صدی قبلِ مسیح کے مشہور قواعد نویس پانی نی نے متعدد نحوی اصولوں کی تشریح کے لئے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن میں شمالی ہند کے اکثر مقاموں کے نام درج ہیں لیکن جزیرہ نمائے ہند کی کسی جگہ کا حوالہ نہیں پایا جاتا علاوہ بریں پانی نی کے مصنفات میں مہابھارت کی چند شخصیتوں کا تذکرہ موجود ہے لیکن والمیکی یا اُس کی رامائن کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ شمالی ہند کے باشندے دکن سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ دوم یہ کہ اس زمانہ تک والمیکی پیدا نہیں ہُوا تھا۔ پروفیسر گولڈ اسٹر کرنے لسانی شہادتوں کی بنا پر ثابت کیا ہے کہ شمالی ہند کے آریہ چھٹی صدی قبلِ مسیح میں نو آباد کار کی حیثیت سے دکن میں وارد ہوئے لیکن بہت عرصہ تک اُن کی تگ و تاز صحرائی علاقوں میں محدود رہی اور وہ ڈنڈکارن کے وحشی باشندوں کے ساتھ کبھی آویزش کبھی آمیزش میں مشغول رہے۔ البتہ پانچویں صدی قبلِ مسیح میں اُن کو مہذب دراوڑی قوموں مثلاً اندھرا۔ چولا۔ پانڈیہ۔ چیرا وغیرہ سے اتحاد و اتصال کا موقعہ ملا۔ اور اس میل ملاپ کی وجہ سے انہیں جزیرہ نما سے پوری واقفیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح شمالی ہند کے باشندوں کو لنکا کا صحیح علم اُس وقت ہُوا جب کہ بہادر و حوصلہ مند راجہ وجیایا ایک زبردست بیڑا لے کر بنگال سے بحری سفر کرتا ہُوا لنکا پہنچا اور جزیرہ فتح کیا۔ وجیایا کی لنگر اندازی و فتحِ لنکا کا زمانہ پانچویں صدی قبل

مسیح قرار دیا جاتا ہے۔ اب والمیکی کی تصنیف کردہ رامائن پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دکن جنوبی ہند اور لنکا کے ملکی جغرافیائی اور معاشری حالات سے بالکل ناواقف ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ تمام ممالک گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں جن میں جا بجا بندر۔ ریچھ۔ ناگ۔ گرُوڑ۔ بلچھ۔ راکشس بھُوت پریت کے غار واقع ہیں۔ رام گوداوری کے منبع سے کوچ کرتا ہوا لنکا پہنچتا ہے لیکن راستہ میں اُسے کوئی شہر۔ قصبہ۔ قریہ یا مہذب و شائستہ انسانوں کی آبادی نہیں ملتی۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ والمیکی ساتویں صدی قبلِ مسیح کے بعد اور پانچویں صدی قبل مسیح کے پیشتر یعنی چھٹی صدی قبلِ مسیح میں پیدا ہوا تھا اور رامائن لکھی تھی۔

بہرکیف والمیکی کی تصنیف کردہ رامائن صرف پانچ حصّوں پر مشتمل تھی۔ لیکن بہ انقضائے زمانہ اس میں بھی مہابھارت کی طرح وقتاً فوقتاً ترمیم واضافہ ہوتا رہا۔ پیشہ ور مطرب ومغنّی جو غالباً شاعر بھی ہوتے تھے چنگ ورباب پر رام کے کارنامے گاتے پھرتے تھے یہ سامعین کے مذاق اور دلچسپی کے مطابق والمیکی کی رامائن میں ردوبدل کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل بنارس۔ بنگال اور بمبئی کے رامائنی نسخوں میں بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں شاعروں کی ملکی وجغرافیائی معلومات میں توسیع کے دوش بدوش رامائن کی تفصیلات وجزئیات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ موجودہ رامائن میں جب وانرراجہ سگریوا اپنے سپاہیوں کو سیتا کی تلاش کے لئے مختلف سمتوں میں روانہ کرتا ہے تو اُنہیں ویداربھا۔ ریچیکا۔ مہیشاکا۔ کلنگا۔ کسیکا۔ اندھرا۔ پوندرا۔ چولا۔ پانڈیہ۔ کرالا وغیرہ مملکتوں میں جانے کی ہدایت دیتا ہے۔ پانڈیہ ریاست کے پایہ تخت مدورا کی یہ نشانی بتاتا ہے کہ اس کے دروازے سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع ملیں گے۔ موچیری۔ سوپھارم اور بوہار کی عالیشان بندرگاہوں کا بھی موجودہ رامائن میں حوالہ ملتا ہے۔ کہاں تو سارا ملک گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہُوا محض غولِ بیابانی کا مسکن تھا اب وہیں اس قدر عظیم الشان ریاستیں۔ شہر اور بندرگاہیں نکل آئیں۔ الغرض رامائن میں رفتہ رفتہ خوب اضافہ ہُوا اور اس کا حجم دگنا ہوگیا۔ والمیکی کی رامائن کے پانچ حصوں میں ترمیم واضافہ ہونے کے علاوہ دو حصّے اس میں نئے سرے سے داخل کئے گئے۔ موجودہ رامائن کے سات کھنڈ ہیں۔ پہلا اور ساتواں کھنڈ زمانہ مابعد کا اضافہ ہے بقیہ پانچ حصّے قدیم ہیں۔ ڈاکٹر میکڈونلڈ کا خیال ہے کہ سات کھنڈوں والی رامائن تیسری صدی قبلِ مسیح میں تکمیل پذیر ہوئی تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی رامائن میں ضرور ترمیم واضافہ ہُوا ہے کیونکہ مہابھارت کی طرح اس میں بھی یاونا۔ سکا اور پہلوا وغیرہ کے تذکرے پائے جاتے ہیں جو پہلی صدی قبلِ مسیح کے اواخر کی حاشیہ آرائی خیال کئے جاتے ہیں۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ رامائن کی تغیر پذیری کا پہلی صدی قبلِ مسیح میں خاتمہ نہیں ہُوا بلکہ وہ بہت عرصہ بعد تک رنگ

بدلتی رہی اور بالآخر مہابھارت کی طرح اُس نے بھی اپنی موجودہ مستقل و مکمل ہیئت سنہ ۲۰۰ء میں اختیار کی۔ الغرض مہابھارت کے گیت رامائن سے دو صدی پیشتر ہی زبان زدِ خلائق ہو چکے تھے لیکن اُس نے مربوط و منظم شکل رامائن سے کم از کم دو صدیوں کے بعد اختیار کی۔ چونکہ یہ دونوں رزمنامے کسی خاص زمانہ کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ صدیوں کے ارتقاو ترقی۔ حک و اصلاح اور ترمیم و اضافہ کا نتیجہ ہیں اس لئے اُن سے مترشحہ واقعات کسی مخصوص زمانہ کے مذہبی۔ اخلاقی و معاشرتی حالات سے تطابق نہیں رکھتے۔ والمیکی کی رامائن میں رام محض ایک چھتری سورما تھا لیکن موجودہ رامائن اسے وشنو کا اوتار تسلیم کرتی ہے۔ اس لئے رامائن کا پڑھنا بہت بڑا کارِ ثواب خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خود رامائن کے پہلے حصّے کی تمہید میں جو بلا شبہ زمانۂ مابعد کا اضافہ ہے مرقوم ہے کہ "جو شخص مقدس رامائن کے روح افزا اشلوکوں کی بلاناغہ روزانہ تلاوت کرتا ہے اُس کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ اپنے تمام اعزہ و اقارب اور آئندہ نسلوں کے ساتھ اعلیٰ علیین میں جگہ پاتا ہے"

بہرحال اس طول و طویل بحث و تمحیص سے نکتہ رس و دقیقہ شناس حضرات پر واضح ہوگیا ہوگا کہ رامائن اور مہابھارت کسی خاص زمانہ کے صحیح تاریخی واقعات کی آئینہ داری نہیں کرتیں۔ اِن میں ایسے بے سروپا۔ خلافِ فطرت اور مافوق العادت واقعات کا بیان پایا جاتا ہے جنہیں عقلِ سلیم اول ہی نظر میں رد کر دیتی ہے۔ البتہ اُن میں سادہ مزاج و زود اعتقاد آدمیوں کے ذوقِ عجوبہ پسندی کی پرورش کے لئے کافی مواد موجود ہے۔ فی الحقیقت دونوں رزمنامے محض شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں۔ بعض حضرات انہیں اخلاقی تعلیم کا بہترین مکتب خیال کرتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ رزمنامے ہمہ گیر اخلاق کے وسیع میدان کے صرف ایک محدود رقبہ پر حاوی ہیں۔ وہ عالمگیر اخلاقی اصول پیش کرنے کے بجائے صرف انہی محاسنِ اخلاق کی ترجمانی کرتے ہیں جن کے جواز کا فتویٰ صرف برہمنی دارالافتا سے صادر ہو سکتا تھا۔ بعضوں کا یہ ادعا ہے کہ رامائن کے ابطال مکارمِ اخلاق کا ایسا رفیع الشان نمونہ پیش کرتے ہیں جو فرقہ دارانہ حدود سے نکل کر تمام بنی نوعِ انسان کو صلائے تقلید دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رام فرزندانہ اطاعت کا۔ سیتا فداکارانہ شوہر پرستی کا اور لکشمن برادرانہ وفاداری کا ایسا لاجواب معیار پیش کرتے ہیں جو رفعت کے لحاظ سے ہم دوشِ ثریا کہا جا سکتا ہے تاہم یہ امر مشکوک ہی ہے کہ یہ پرویں بدوش معیار عملی زندگی میں کہاں تک قابلِ تقلید ہو سکتا ہے۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ رامائن فضائلِ اخلاق کا مثالیہ معیار پیش کرتی ہے جو عملاً ناقابلِ اتباع ہے۔ مثلاً سیتا کی جاں نثارانہ شوہر پرستی قابلِ داد ضرور ہے لیکن اُس کے لئے اس فداکار زوجہ کو مدت العمر ایسی ایسی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ اس کی مثال کی تقلید تو بر طرف بہت و

عورتیں اُس کی مصیبت زا زندگی اور المناک انجام کے پیشِ نظر اپنی لڑکیوں کا سیتا نام رکھنا بھی فالِ بد سمجھتی ہیں بہرکیف چونکہ یہ اخلاقی بحث ہمارے موجودہ موضوع سے خارج ہے اِس لئے ہم اسے طول دینا نہیں چاہتے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ کے ترازو میں اِن رزمناموں کا کیا وزن ہے۔ یہ تو معلوم ہوچکا کہ رامائن اور مہابھارت کے واقعات خود ساختہ اور من گھڑت ہیں تاہم بعض مورخین انہیں تاریخی زاویۂ نگاہ سے اس لئے اہم سمجھتے ہیں کہ اُن کی دانست میں یہ رزمیہ کتب قدیم ہندی تمدن و معاشرت پر پوری روشنی ڈالتی ہیں لیکن یہ ادعا بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ اِن رزمیات کا زمانۂ تصنیف ہزار سالہ مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مدتِ مدید میں ہیئتِ اجتماعیہ نے بیسیوں انقلاب دیکھے ہونگے اور عادات و اطوار اور رسم و رواج نے سینکڑوں لباس بدلے ہونگے۔ لیکن ان رزمناموں میں جدید حالات و واقعات کو بھی قدیم ہی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے مہابھارت کے کردار رامائنی کردار سے پیشتر زمانہ کے ہیں لیکن کٹر ہندوؤں کا بیان ہے کہ رامائن کے واقعات ترتیا جگ سے اور مہابھارت کے واقعات دواپر جگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندی صنمیات کے مطابق زمانہ کو چار عہود پر تقسیم کیا گیا ہے۔ جو علی الترتیب ست جگ۔ ترتیا جگ۔ دواپر جگ اور کالی جگ کہلاتے ہیں۔ مہابھارت میں کہیں گاؤکشی۔ انسانی قربانی اور کثرت البعول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور کہیں اہمسا۔ تناسخ اور نظامِ ذات بندی کو جزوِ مذہب قرار دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں انسانی قربانی کی رسم جاری تھی اُس میں اور اہمسا پر عامل معاشرہ میں ہزاروں برس کا فصل ہوگا لیکن ان متضاد معاشری تصویروں کو ایسا خلط ملط کردیا گیا ہے کہ ان میں تفریق مشکل ہوگئی ہے۔ الغرض قدیم و جدید رسوم و عادات کو ترکیب دے کر ایک ایسا مرکب تیار کرلیا گیا ہے جو کسی زمانہ کے صحیح معاشری حالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ علاوہ بریں ہر دو رزمناموں میں آریائی یا برہمنی معاشرہ کی ایسی مبالغہ آمیز اور روشن تصویر دکھائی گئی ہے کہ اُس کا ہر فرد انسانی درجہ سے ترقی کرکے دیوتائی یا رشی عرشہ پر جلوہ گر نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے دکن کے باشندوں کی تصویر ایسی بھیانک اور وحشیانہ کھینچی گئی ہے کہ وہ انسانی زینہ سے گر کر بندر۔ ریچھ۔ ناگ۔ راکشس اور طاغوت کی اسفل سطح پر پہنچ گئے ہیں۔ قصّہ کوتاہ اِن رزمیات کے ہر پہلو میں نسلی و قومی عصبیت کی کارفرمائی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ان رزمناموں سے مبالغہ آمیزیوں۔ بے جا لن ترانیوں اور ظاہری ملمعوں کو دور کردیا جائے تو ممکن ہے کہ قدیم آریائی تمدن پر کچھ روشنی پڑے لیکن دکن کی قدیم دراوڑی اقوام کی تصویر دیکھنے کے لئے تو رامائن اور مہابھارت دونوں اُن محدب یا مقعر آئینوں کی سی ہیں جن میں ہر پہلو سے عکس ٹیڑھا ہی نظر آتا ہے مسٹر ونسنٹ اسمتھ

کا قول ہے کہ ہندی افسانوں میں رامائن اور مہابھارت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو برطانوی افسانوں میں نائٹس آف دی راونڈ ٹیبل (گول میز کے مبارزین) کو ——— ان رزم ناموں کی مدد سے قدیم ہند کی سیاسی یا معاشری تاریخ کی تدوین کی کوشش ویسی ہی بے معنی اور لاحاصل ثابت ہوگی جیسی مورٹی ڈی آرتھر یا آئی ڈیلیس آف کنگس (Morte d'Arthur or Idylls of Kings) کی بنا پر قدیم برطانوی تاریخ کی ترتیب کی سعی"۔ الغرض متعلم تاریخ کو چاہیئے کہ وہ قدیم تاریخی واقعات کی تلاش کے لئے ہرگز رامائن اور مہابھارت کو اپنی تکیہ گاہ نہ بنائے بلکہ قدیم سکہ جات ۔کتبات ۔ روایات ۔ قدیم اسناد و عطیات ۔عمارتی یادگاروں ۔ حضریات سے برآمد شدہ اوزار و ظروف ۔مہر ۔ دستاویز اور دوسرے آثار قدیمہ کے انبار میں گوہر مراد کو ڈھونڈھے

محمد حسین

آہ کہاں ہو

آسمانِ محبت کے تارے ۔ سمندر کے جگمگاتے موتی ۔ مصر کے یوسف ۔ ہند کے کنھیا ۔

آہ کہاں ہو؟

چمنِ حسن کے شاداب گل ۔ دل کی دنیا کے چاند؟ صبح محبت کے آفتاب

آہ کہاں ہو؟

میرا دلِ بیتاب ۔ میری چشم پرنم ۔ میرے ہوش منتشر ۔ میرے خیالات پریشاں ہیں ۔

آہ کہاں ہو؟

ستاروں کی چمک میں ۔ شبنم کی دمک میں ۔ صبح کے سکون میں باغوں کی بہار میں ۔ شفق کی رنگینیوں میں ساز کی آواز میں میں نے تمہیں ڈھونڈا ہے ۔

آہ کہاں ہو؟

فضائے آسمانی میں بسنے والے نورانی محبوب دیکھو مجھے دیکھو میری سراسیمگی کو دیکھو چشم پرنم کو دیکھو قلبِ شکستہ دیکھو چاکِ داماں پر نظر ڈالو ۔ بتاؤ ہاں مجھے بتاؤ

تم کہاں ہو؟

اچھا جاؤ ——— جاؤ اور تاروں بھری رات میں ماہ بن کے چمکو ۔ شاداب گلشنوں کی بہار کھلاؤ ۔ فضائے عالم میں ترنم اور سرور پیدا کرو ۔ رہنے دو مجھے میرے حال پر رہنے دو ۔ میں اپنے بیمار دل کی تیمار دار ہوں اور رہونگی ۔

شمسہ خانم

دنیائے خیال

اک موجِ نور تھی کہ اِدھر سے اُدھر گئی
کیف آفریں نگاہ سے بیتاب کر گئی

رنگینیٔ خرام کہ تھی مُسکرِ شباب
دیتی تھی نازِ حسن کو تعلیمِ اضطراب

ہونٹوں میں اک فضائے شگفتہ کہ کیا کہوں
آنکھوں میں اک ادائے نہفتہ کہ کیا کہوں

ہلکا سا اِک تبسّمِ شیریں نگاہ میں
موسیقیت کا رقصِ طرب جلوہ گاہ میں

نغموں نے لے لیا مجھے آغوشِ ناز میں
جذبوں نے لی پناہ سکوتِ نیاز میں

رگ رگ میں کیفِ جلوۂ رنگیں لئے ہوئے
بیٹھا ہوں یادِ حسنِ نگاریں لئے ہوئے

بے تابیٔ فسونِ تمنا خموش ہے
خود اضطرابِ دل ہے، کہ تمکیں فروش ہے

وہ گرمیاں نہیں تپشِ سوز و ساز میں
ڈوبی ہوئی ہے عشق کی دنیا نیاز میں

دل اب اسیرِ کاوشِ سود و زیاں نہیں
اللہ رے محویت! خبرِ دو جہاں نہیں

دھوکے نہیں رہے وہ طلسمِ نمود کے
سب راز کھل گئے ہیں فریبِ شہود کے

اک ساغرِ لطیفِ تخیل بدست ہوں
اپنے تصورات کی دنیا میں مست ہوں

ساغر کہ حسنِ روحِ تمنا کہیں جسے
شادابیٔ جمالِ سلیقہ کہیں جسے

کرتا ہوں ریزش اس میں دلِ خونفشار کی
اِس دل کی اس مرقعِ صد نوبہار کی

آئینۂ حیات ہے یہ جامِ آرزو
روشن ہے اِس کی ضو سے مری شامِ آرزو

اک تازہ زندگی کی نمو ہے وجود کوش
ہوگا نہ جس کی مست نوائی کو اذنِ ہوش

خوابوں کی روح چھیڑے گی تارِ ربابِ عشق
ساغر سے نغمے بن کے اُٹھے گی شرابِ عشق

چھا جائے گی الم کدۂ ہست و بود پر
اور نور بن کے برسے گی بزمِ شہود پر

دامن میں عطرِ سبزیٔ نزہت لئے ہوئے — پہلو میں انبساط کی جنّت لئے ہوئے
یہ زندگی نہ ہوگی شناسائے خارِ غم — ہوگا نہ کوئی درد کے ہاتھوں فگارِ غم

شاید خیالِ حسن ترنم فشار ہے
رنگینیٔ افق پہ وہ کیا جلوہ بار ہے

تصدّق حسین خالدؔ

برقِ خیال

رسوائی کا ڈر ہے تو یہ قصہ ہی مٹا دو — آنکھوں سے حجابات کے پردے کو اٹھا دو!
جاتے ہوئے مقتول کے ٹھوکر بھی لگا دو — دنیا کو جلانے کا تماشا بھی دکھا دو!
پھر خرمنِ ہستی پہ کوئی برق گرا دو — بجھتے ہوئے جذبات میں شعلہ سا اٹھا دو!
پھر خواہشِ اظہارِ تمنا ہے زباں کو — تم قلب کی حرکت کو ذرا اور بڑھا دو!
پھر زندگی بے لطف ہے افسردہ دلی سے — للہ تخیل میں وہی آگ لگا دو!
پھر دل کی شکایت ہے کہ تسکیں نہیں ہوتی — معیار سزاؤں کا ذرا اور بڑھا دو!
گر فاتحہ خوانی تمھیں منظور نہیں ہے — لو آؤ چراغِ سرِ تربت ہی بجھا دو!
ویرانیٔ زنداں پہ رُلانا نہیں مقصود — تم اور مری قید کی میعاد بڑھا دو!

اس کشمکشِ کاہشِ پیہم سے رہائی؟
طالبؔ یہ تو ہم ہے اسے دل سے بھلا دو!

طالبؔ باغپتی

رنگ میں بھنگ

رات کے دس بجے کا وقت ہے۔ دہلی اسٹیشن سے کانپور جانے والی گاڑی ابھی ابھی چھوٹی ہے اور پلیٹ فارم کے حدود میں آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے۔ ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے کمرے میں چار پانچ مسافر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر ہوئی کھانے سے فارغ ہوئے ہیں اور اب اپنی اپنی جگہوں پر قبضہ کر کے سونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور چاروں طرف سکون ہے۔

اتنے میں گاڑی کا دروازہ کھول کر لانبے قد کا ایک ڈول جلول سا آدمی جو صورت سے کسی کمپنی کا ایکٹر معلوم ہوتا ہے۔ گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ خاکی رنگ کا ایک نیا خوش وضع اوورکوٹ پہنے ہے اور اُس کے لباس سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس نے کسی خاص موقع کے لئے صندوق میں سے نکال کر آج ہی ان کپڑوں کو پہنا ہو۔ اُس کے چہرے پر بدحواسی کے آثار طاری ہیں۔ اندر پہنچ کر تھوڑی دیر ساکت کھڑے ہو کر وہ اپنی آنکھوں کو جلدی جلدی کھولتا اور بند کرتا ہے۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی ہے، چہرہ سرخ ہے اور وہ اس طرح گھبرا گھبرا کر اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا ہے جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔

"لاحول ولاقوت! پھر غلط درجے میں گھس آیا۔ توبہ، جان عاجز آگئی" اُس نے ہانپتے ہوئے زیرِ لب آہستہ آہستہ بڑبڑا کر کہا۔

اس پر ایک مسافر نے جو پیچھے کی طرف سہارا دئیے اور منہ کھولے بیٹھے ہی بیٹھے خراٹے لے رہا تھا چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیں اور تھوڑی دیر تک نووارد کو خوب غور سے دیکھنے کے بعد خوشی سے چلا اُٹھا۔

"ہائیں رستم؟ تم یہاں کہاں؟ ارے بھائی کہیں میری نظریں تو مجھے دھوکا نہیں دے رہی ہیں؟ یار جلدی بتاؤ۔ تم ہی ہو نا؟"

رستم نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے مسافر کو گھورنا شروع کیا۔ ایک لمحہ میں اُس کا چہرہ مسرت سے تمتما اُٹھا۔ "ارے! جمشید بھئی واہ عجب اتفاق ہے۔ یار خوب ملے۔ اخّوہ کتنے عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی ہے میں جانتا ہوں کوئی تین برس تو ہو گئے ہونگے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ تم بھی اس گاڑی سے جا رہے ہو ـــــ اچھے رہے؟"

جمشید نے سر سے پیر تک اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آخر تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو، خیریت تو ہے؟"

"سب اللہ کا فضل ہے۔ مگر ہاں یار اس وقت میں واقعی گھبرایا ہوا ہوں۔ بات یہ ہے کہ جلدی میں مجھے اپنا کمرا نہیں ملا۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی میں بدحواس ہو کے یہیں گھس پڑا ـــــــ کیا حماقت ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ"

رستم کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اُس نے کھڑکی کا سہارا لیتے ہوئے کہا:۔

"یار بعض وقت ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ خود اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگتی ہے ـــ گاڑی چھوٹنے سے ذرا دیر پہلے میرے جی میں آیا کہ اس وقت سردی زیادہ ہے چلو ریفرشمنٹ روم میں ایک برانڈی کا گلاس چڑھا لیا جائے ایک گلاس پی کر میں نے سوچا کہ اب خدا جانے دوسرے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے گاڑی کو کتنی دیر لگے، لاؤ ایک ہی مرتبہ چھٹی نہ کر لوں اسی خیال سے ایک گلاس اور منگوایا۔ ابھی پی ہی رہا تھا کہ گاڑی نے سیٹی دے دی۔ بس بھائی میں سر پر پیر رکھ کر الٹا سیدھا بھاگا۔ گھبراہٹ میں ٹوپی بھی وہیں رہ گئی۔ گاڑی چھوٹ تو چکی ہی تھی جلدی میں جو کمرا سامنے آیا میں کود کر اسی میں چڑھ گیا۔ اب وہاں پہنچ کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ میرا درجہ نہیں۔ پھر اُلٹے پیروں لوٹا تو اس میں گھس پڑا ـــــــ میں بھی عجب پاگل آدمی ہوں، کیا حماقت ہوئی ہے۔ لاحول ولا قوۃ"

"مگر دوست آج تم بہت مگن معلوم ہوتے ہو۔ خیر اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ چلتی گاڑی میں اب واپس تو جانے سے رہے۔ اتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے آؤ پھر کچھ گپ ہی رہے"

"نہیں یار مجھے اپنے درجہ میں جانے دو۔ او۔ ابھی تو ریل پلیٹ فارم ہی پر سے گزر رہی ہے مشکل ہی کیا ہے اچھا انشا اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ!"

"دیوانے ہو گئے ہو کیا؟ واپس جانے کی بھی ایک ہی رہی۔ ہنہ! آپ چلتی گاڑی میں درجہ بدلیں گے۔ کیا جان دینے کا ارادہ ہے؟۔ اب آؤ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں، اگلے اسٹیشن پر اُتر جانا"

رستم نے ایک لمبی سی سانس لی اور طوعاً و کرہاً بادلِ ناخواستہ جمشید کے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کا دماغ غیر معمولی طور پر مشتعل ہے۔ اُس کا چہرہ بدحواسی کے باوجود خوشی سے دمک رہا تھا۔ جمشید نے سگرٹ پیش کرتے ہوئے رستم سے سوال کیا۔

"آخر تم جا کہاں رہے ہو؟ ساری داستان بیان کر گئے مگر یہ کچھ نہ بتایا کہ قصد کہاں کا ہے"

"میں! مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں ـــــــ دنیا کے اُس سرے کو۔ سمجھے کہ نہیں! مگر یار اصل بات یہ ہے کہ میں اس وقت ایسی ترنگ میں ہوں کہ خود مجھے بھی نہیں معلوم کہ کہاں جا رہا ہوں۔ بس کچھ پوچھو مت۔ ہا ہا ہا! (قہقہہ لگاتا ہے) یارِ من تم نے کبھی کسی مسرور احمق کو دیکھا ہے؟ نہ دیکھا ہو تو اب خوب اچھی طرح مجھے جی بھر کر

دیکھ لو۔ اس وقت تمہارے سامنے دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ ..... اور تم بھی نرے گاؤدی ہو۔ میرے چہرے کو دیکھ کر بھی تم پتہ نہیں چلا سکتے کہ میں آج اسقدر مگن کیوں ہوں؟ تم تو بڑے ہوشیار تھے؟"

"ہاں کچھ معلوم تو ہوتا ہے۔ معلوم کیا ہوتا ہے وہ تو صاف ظاہر ہے —— اس کا معلوم کرنا بھی کوئی بڑی بات ہے۔ ایک بچہ بھی تمہیں دیکھ کر پہچان جائے گا کہ تم پر نشہ کا بھوت سوار ہے۔ یہ لت ابھی تک تم نے چھوڑی نہیں!"

"شراب کا نشہ نہیں پیارے۔ یہ خوشی کا نشہ ہے۔ خیر یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس وقت میرے چہرے پر بدحواسی کی وجہ سے ایسی ہوائیاں اُڑ رہی ہونگی کہ میں اچھا خاصا چغد معلوم ہوتا ہوں گا۔ اوفوہ کاش اس وقت میرے پاس آئینہ ہوتا! بے اختیار آئینہ میں صورت دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کہیں میں خوشی کے مارے پاگل نہ ہو جاؤں ...... اچھا لو تم بھی کیا کہو گے۔ بس بتا ہی نہ دوں۔ یار واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی دلہن کو بیاہ کر اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں —— اب تو سب باتیں سمجھ میں آگئیں؟"

جمشید اپنی سیٹ پر تعجب سے اچھل پڑا۔

"کیا کہا۔ دلہن کو ساتھ لئے جا رہے ہو۔ اچھا تو کیا تمہاری شادی ہو گئی؟ بھئی یہ اکیلے ہی اکیلے سب کچھ ہو گیا۔ ہمیں کانوں کان خبر بھی نہ کی"

"ہاں یار میری شادی ہو گئی۔ یہی تو بات ہے۔ ابھی کل ہی تو ہوئی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ شادی کے بعد سیدھا چلا آ رہا ہوں"

"تو یہ کہئے۔ جب ہی آپ اس قدر ٹھاٹ سے ہیں؟ جامہ وار کی شیروانی۔ نیا اوورکوٹ، ہاتھوں میں ایک چھوڑ تین تین سونے کی انگوٹھیاں۔ وہی تو میں کہوں آج رستم بالکل نیا کیوں معلوم ہو رہا ہے؟"

رستم واقعی خوشی کی وجہ سے پاگل معلوم ہو رہا تھا اُس نے اپنی آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہنا شروع کیا:۔

"بھئی میں تو کہتا ہوں کہ کوئی خوش قسمت ہو تو میرے جیسا۔ دنیا کی کسی چیز کی فکر نہیں۔ نہ کوئی غم نہ کھٹکا بس عیش ہی عیش ہے۔ خدا سب کو ایسی ہی بے فکری نصیب کرے! جیسے یکایک میں بڑا آدمی ہو گیا ہوں تمام عمر مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی"۔ اُس نے مسرت کے جوش میں آنکھیں بند کر لیں اور مگن ہو کر جھومنے لگا —— "اس وقت خوشی کے مارے میں پھولا نہیں سماتا ہوں۔ ذرا غور تو کرو مجھ سے بڑھ کر خوش قسمت اور کون ہو سکتا ہے؟ ایک منٹ میں اسٹیشن آجائے گا اور میں اُتر کر اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ وہاں کھڑکی کے قریب سمٹی سمٹائی گٹھڑی بنی ہوئی میری دلہن میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ ممکن ہے میرے نہ ہونے کی وجہ سے چپکے ہی چپکے آنسو بھی بہا رہی ہو۔ اوفوہ وہ مجھے کس قدر دل و جان سے چاہتی ہے! —— چھوٹے قد لانبے بالوں کی ایک ہلکی پھلکی پری۔ پتلی پتلی گاؤدم انگلیاں۔ کلی ایسی

ناک، چھوٹا سا دہانہ - میری پیاری! میری جان! میرے کلیجے کا ٹکڑا! ہائے مجھے اس سے کتنی شدید محبت ہے.....
اور اُس کی کالی کالی ہرن ایسی آنکھیں! خدا کی پناہ۔ واللہ میں تو شرط بدنے کو تیار ہوں کہ اُس کی ایسی آنکھیں کم از کم ہندوستان میں تو کسی عورت کی ہیں نہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے دو کنول کے پھول کھلے ہوں! مگر تم سے ایسی شاعرانہ باتیں کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ تم ٹھیرے ٹھیٹ فلسفی، تم اِن چیزوں کا مزا کیا جانو؟ یہ لطف پوچھو کسی شادی شدہ سے۔ تمہاری بھی کوئی زندگی ہے - کنوارپن کی خشک، بے مزہ، مردہ دل زندگی! توبھئی سمجھے۔ بس ایک منٹ میں بندہ تو اپنے کمرے میں ہوگا۔ ہا! بے چاری کس بے صبری سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں خوشی کی مسکراہٹ سے چمک اُٹھیں گی ـــ میں اُس کے برابر بیٹھ جاؤں گا" رستم کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ اُس کا چہرہ مسرت کی وجہ سے بے حد مضحکہ خیز بن گیا تھا - پھر میں اپنی ٹھوڑی اس کے کاندھے پر رکھ دوںگا اور اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال دوں گا ـــ کمرے میں چاروں طرف خاموشی ہے۔ وہاں میرے اور میری بیوی کے علاوہ کوئی تیسرا متنفس نہیں ہے۔ اُس کا گداز نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے...... ہنس رہے ہو۔ یار تم ہنسو گے خدا کی قسم اس وقت دل چاہتا ہے جو سامنے آجائے اس کو گلے سے لپٹا لوں۔ بھئی بُرا نہ ماننا بے اختیار طبیعت چاہتی ہے۔ کہو تو میں تمہیں کو لپٹا لوں"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے؟ بخوشی۔ بلکہ مجھے تو بڑی مسرت ہوگی"

دونوں دوست ایک دوسرے سے چمٹ کر گلے ملنے لگتے ہیں۔ اس پر تمام مسافر ایک ساتھ ہنس پڑتے ہیں۔ دولہا میاں کی زبان کی قینچی پھر چلنے لگتی ہے۔

"اور یار ایمان کی بات تو یہ ہے کہ یہی دو چار موقعے ہوتے ہیں جن پر جشن منایا جاتا ہے۔ اب تم مجھے بُرا بھلا کہو گے مگر سچ بتانا کیا پینے پلانے کا کوئی اور موقع بھی ہوتا ہے؟ اسٹیشن پر اُتر کر جہاں دو چار پیالے چڑھائے اور طبیعت مگن ہوگئی۔ بس پھر موج ہی موج ہے ـــ اور بھائی میری روح تو پینے کے بعد ایسی ہلکی ہو جاتی ہے جیسے فرشتوں کی سی۔ ویسے ہوں تو بہت کم حیثیت آدمی لیکن یقین مانو پی کر مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جیسے میرا رتبہ اتنا بلند ہوگیا ہے کہ میں ساری دنیا پر چھایا جا رہا ہوں!"

دولہا میاں نہایت چیخ چیخ کے باتیں کر رہے تھے۔ ان کا چہرہ کچھ تو غیر معمولی خوشی کی وجہ سے اور کچھ نشہ سے بالکل سرخ ہوگیا تھا۔ گاڑی کے تمام مسافر اُن کی بے تکی ہنسانے والی بک بک کو مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ اس وقت سب کے سب اُن کی طرف متوجہ تھے۔ اور اونگھنے کی بجائے اپنی اپنی جگہوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ ادھر ان حضرت کا عجب حال تھا کبھی ہنستے تھے۔ کبھی ترنگ میں آکر سیٹی بجاتے تھے۔ کبھی باتیں کرتے کرتے جمشید سے چمٹ جاتے تھے۔

اُن کے قہقہے بلند ہوتے جاتے تھے اور اُن کے ساتھ مسافر بھی ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے۔

"دوستو! میرے یارو! کسی بات پر سنجیدگی سے غور وفکر نہیں کرنا چاہئے۔ جھجکنے کی عادت بہت بری ہوتی ہے اگر کسی کا شراب پینے کو دل چاہتا ہے تو اس سے بڑھ کر گدھا پن اور کچھ نہیں کہ اب بیٹھے بڈھے فلسفیوں کی طرح سوچ رہے ہیں کہ ہمیں ایسا کرنا چاہئے یا نہیں۔ یہی عادتیں تو انسان کو خراب کر دیتی ہیں۔ خدا ان فلسفیوں کو غارت کرے۔ یہ وبا انہیں کمبختوں کی پھیلائی ہوئی ہے"

اتنے میں سیاہ وردی پہنے، ہاتھ میں ٹکٹ کاٹنے کی قینچی لئے ایک گول مٹول ٹکٹ کلکٹر اندر داخل ہوا اسے دیکھتے ہی دولہا میاں بولے:-

"یار تم بھی مزے کرتے ہو۔ واللہ کمال ہے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جب چاہا چلے گئے۔ اس مشاقی کا بھی کوئی ٹھکانا ہے ...... ارے بھئی ایک کام ہمارا بھی کر دیجئے جناب ٹکٹ کلکٹر صاحب! تکلیف تو ہوگی دیکھئے وہ زنانہ درجے کے برابر والے ڈیوڑھے درجے میں میری بیوی بیٹھی ہے۔ اکیلی بیچاری ڈر رہی ہوگی۔ دلّی کے اسٹیشن پر میرے بیٹھتے بیٹھتے گاڑی چھوٹ گئی۔ آپ تو چلتی گاڑی میں خوب ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں ذرا اُس کو اطمینان دلا دیجئے کہ گھبرائے نہیں میں یہاں بیٹھا ہوں ---- اور یا پھر مجھ ہی کو ہاتھ پکڑ کر کسی طرح اس درجے تک پہنچا دیجئے ...... مگر نا بھائی! ہم باز آئے ایسے جانے سے۔ تو بہ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ راستہ ہی میں روح فنا ہو جائے۔ اچھا پھر آپ خود ہی اس سے کہہ آیئے"

اس پر سب مسافر ہنسنے لگے۔ اُن میں سے ایک بولا:-

"واقعی آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آج کل تو یہ حالت ہے، کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں خوش خرم نظر آتا ہو۔ خوشی تو جیسے عنقا ہو گئی ہے۔ عجب زمانہ ہے!"

رستم نے ایک جھٹکے کے ساتھ سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور اپنے پاؤں کو پھیلا کر جوتوں سمیت جمشید کی گود میں رکھ کر بولا:-

"مگر جناب خطا کس کی ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ خوش نہیں ہیں تو قصور کس کا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ ساری خطا خود آپ کی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں۔ اصل میں انسان تو خود اپنی مسرت کا مختار ہے۔ ہر وقت مگن رہنا تو بالکل اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہیں تو کیا ہر وقت خوش نہیں رہ سکتے۔ لیکن آپ خود ہی نہیں چاہتے۔ آپ تو جیسے خوشی کو دھکا دے کر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں!"

جمشید نے محظوظ ہو کر پوچھا "یہ کیسے؟"

رستم —— "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تین چار چھوٹے موٹے تو اصول ہیں۔ کیا مجال کہ آدمی اُن پر عمل کرے اور خوش نہ رہے۔ مثلاً ایک یہی بات سے لو کہ قدرت کا صاف منشا یہ ہے کہ ایک مقررہ عمر پر پہنچ کر انسان کسی سے محبت کرے۔ تو اب قاعدے سے مناسب عمر پر پہنچ کر ہر شخص کو اس طرح شدت سے عشق کرنا چاہئے جیسے کسی لکڑی کے مکان میں آگ لگ جائے —— مگر میاں دنیا میں تو اب نرے کندۂ ناتراش لوگ پیدا ہونے لگے ہیں۔ اتنی عقل کسے ہے کہ ان نکات کو سمجھ سکے۔ پھر جناب دوسری بات یہ ہے کہ ہر تندرست جوان آدمی کا اخلاقی فرض یہ ہے کہ وہ شادی کرے۔ واللہ میں سچ کہتا ہوں کہ بغیر شادی کئے زندگی میں کوئی مزہ نہیں۔ بے کار غور و فکر کرنا حماقت ہے عمر، موقع اجازت دے تو پھٹ سے شادی کر لے۔ بس —— اچھا تیسری بات یہ ہے کہ جس وقت خوش و خرم ہو اور اپنی خوشی کو اور زیادہ بڑھانا چاہتے ہو تو بھائی اس سے بہتر کوئی ترکیب نہیں کہ ریفرشمنٹ روم میں پہنچ گئے اور ایک آدھ گلاس چڑھا لیا۔ زیادہ ہوشیار بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ پامال دستور اختیار کرنے میں بڑا مزہ ہے۔ بس معمولی آدمیوں کی طرح خوب سی چڑھالی اور موج میں آگئے۔"

جمشید —— "یار میں کیسے تمہاری باتوں کو مان لوں۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ انسان کو اپنی خوشی پر اختیار ہوتا ہے بھلا یہ بھی کوئی یقین آنے والی بات ہے۔ بھائی یہ دنیا تو ایسی جگہ ہے کہ محض معمولی سا ڈاڑھ کا درد یا ایک بد مزاج ساس کی زبان درازی سارے مزے کو کرکرا کرنے کے لئے کافی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ایسی حالت میں خاک آپ کو اپنی خوشی پر اختیار ہوگا۔ تم مانو یا نہ مانو میرا تو خیال ہے کہ ساری باتیں اتفاقات پر منحصر ہوتی ہیں۔ فرض کرو کہ خدانخواستہ اسی وقت ہمیں کوئی حادثہ پیش آجائے تو پھر تم دوسرا ہی راگ الاپنے لگو گے تمہاری ساری شیخی کہ "خوشی یوں حاصل ہوتی ہے اور اطمینان اس طرح حاصل ہوتا ہے" سب تشریف لے جائیگی۔"

دولہا میاں چین بجبیں ہو کر کہنے لگے۔

"استغفر اللہ! میں اور کسی حادثہ کی وجہ سے اپنے عقائد بدل دوں۔ مجھے بھی کوئی بچہ سمجھ لیا ہے تم نے۔ تمہیں اچھی طرح ابھی میرا تجربہ نہیں ہے۔ بھلا حادثہ کی بھی کوئی ہستی ہے کہ میں اُس سے ڈر کر اپنے [illegible] تبدیل کر دوں۔ توبہ کیجئے! —— خیر اب چھوڑو بھی۔ میری تو طبیعت اس بحث سے اکتا گئی۔ . . . . . اچھا۔ یہ ریل کی رفتار کیوں کم ہو گئی۔ کیا کوئی اسٹیشن آرہا ہے؟"

"ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید غازی آباد جنکشن ہے۔"

"غازی آباد جنکشن؟"

"ہاں۔ تمہیں اُترنا کہاں ہے؟"

"لاہور۔ کیوں؟"

"لاہور اُترنا ہے؟ ـــــــ بات تمہارے کی۔ تو دوست اطمینان سے مزے کرو یہ گاڑی تو کانپور جارہی ہے۔"

"جی ہاں! واللہ؟ ـــــــ یار ٹھیک بتاؤ۔ مذاق سے کیا فائدہ؟"

"مذاق کون مسخرہ کر رہا ہے؟ اسٹیشن آنے دو آپ ہی معلوم ہو جائے گا۔"

"دہلی کے اسٹیشن پر آپ اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی بجائے اس میں بیٹھ گئے۔ پیئے ہوئے تو تھے ہی ایسے میں کچھ سوجھتا تھوڑا ہی ہے۔"

رستم کا رنگ فق ہو گیا۔ ہنسی کے تمام آثار اک دم غائب ہو گئے۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ یا تو بیچارہ ایک منٹ پہلے مینا کی طرح چہک رہا تھا یا اب گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور ایک ایک کا منہ تکنے لگا۔

ارے یارو غضب ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ بھئی خدا کے لئے گاڑی رکواؤ۔ ہائے ہائے کوئی نہیں سنتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا اللہ اب کیا ہو گا۔ لوگو میں تو برباد ہو گیا۔ میری بیوی تو اُس گاڑی میں رہ گئی۔ ارے رے! بیٹھے دیکھ کیا رہے ہو جمشید! اللہ زنجیر کھینچ لو۔ میں تو کہیں کا نہ رہا (سر کے بال نوچتے ہوئے) اور وہ بیچاری وہاں بالکل اکیلی ہے۔ میں نرا گدھا ہوں گدھا! احمق، بالکل چغد ـــــ اب کیا کروں؟ ہائے میرے خدا!"

اُس نے انتہائی مایوسی کے انداز میں دھم سے اپنے جسم کو سیٹ پر گرا دیا۔

"بدقسمتی کی بھی کوئی حد ہے۔ میں بڑا بدقسمت آدمی ہوں! اللہ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ اُو۔ اُو۔ اُو" بچوں کی طرح رونے لگتا ہے۔

"خیر اب رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ تھوڑی دیر اور صبر کرو۔ غازی آباد اسٹیشن پر اُتر کر بیوی کو تار دے دینا اور وہیں سے اکسپریس میں بیٹھ کر واپس چلے جانا۔"

"اکسپریس سے چلا جاؤں؟ ـــــ ہائے ہائے میں تو لٹ گیا۔ بھائیو اکسپریس سے کیسے چلا جاؤں! میری جیب میں تو ایک پائی بھی نہیں ہے۔ سارا روپیہ پیسہ تو میری بیوی کے پاس ہے"

رفتہ رفتہ گاڑی کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں غازی آباد کا اسٹیشن آجاتا ہے۔

(ماخوذ)

ذوقی۔ بی۔ اے (علیگ)

غزل

آرزو ہے دل لگائیں اُس بتِ طنّاز سے
بجلیاں گرتی ہوں جس کی ہر ادائے ناز سے

نت نئے نغمے نکلتے ہیں یہاں ہر ساز سے
کاش تیرے کان واقف ہوں نوائے راز سے

جوششِ حسنِ ازل سے کائنات آرا ہُوا
ایک جلوہ سا چمک کر اُس جبینِ ناز سے

راز جوئی کو ہی غمخواری سمجھ بیٹھے ہیں دوست
ناک میں دم آگیا ہے ہمدم و دمساز سے

دِل تڑپ جاتا ہے جس دم یاد آتا ہے مجھے
عرضِ رازِ عشق میرا اُس بتِ طنّاز سے

انتہائے شوق سے وہ منّتیں کرنا مرا
اُس کا بن بن کر بگڑنا انتہائے ناز سے

سادگی سے پھر رقیبوں کو بنانا رازدار
شکوہ ہائے دوست کرنا دشمنِ غمّاز سے

وہ گیا۔ آخر ہوئی بزمِ مئے شعر و سخن
رونقِ مے خانہ تھی اُس رندِ شاہد باز سے

عشقِ لیلیٰ ہے مگر اب قیسِ دیوانہ نہیں
عشق نے سیکھے ہیں اب کچھ عقل کے انداز سے

حسنِ لیلیٰ ہے۔ مگر لیلےٰ کو یہ فرصت کہاں
دام میں عشّاق کو لائے فسونِ ناز سے

عشقِ عقل آرا حریفِ حسنِ بے پروا ہُوا
شاعری عاری ہوئی ذوقِ نیاز و ناز سے

آدمی تو خوب ہے۔ پر شعر سے نسبت نہیں
آج ہم ملنے گئے تھے آپ کے اعجاز سے

۱

بُرو، آ، آ، آ

کچھ اِس قسم کی آواز تھی جو میرے کانوں میں پڑی مگر میں کچھ نہ سمجھا۔

را، را، را، را

"میرے اللہ! میں نے نیم خوابی کی حالت میں کہا، "یہ شور تو میرے پردہ ہائے گوش کو پھاڑ دے گا"

را، را، را، را، را، را، را، را، را، را، ٹا، را، ررا، را۔

"بس، بس میری نیند کو غارت ......" میری زبان یکایک رُک گئی۔ میں کہاں تھا؟

ٹا، ررا، رارا، آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

"یہ یا تو کوئی نئی ایجاد ہے یا ...."

ٹُورا، ٹُورا، ٹُورا .... کان پھٹ گئے۔

"نہیں! یہ صورِ اسرافیل ہے" میں نے زور سے کہا تاکہ اپنی آواز ہی کو سُن سکوں،

۲

صور کی آخری صدا نے مجھے قبر سے یوں نکال پھینکا جیسے کانٹے کے ساتھ کوئی چھوٹی سی مچھلی اٹک کر ایک ہی جھٹکے کے ساتھ دریا سے باہر آ پڑے۔

میں نے اپنے سنگِ مزار کو دیکھا (جو در اصل ایک حقیر و بے حقیقت سی بات ہے اور میرے دل میں اس شخص کے معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی جس نے اُسے نصب کیا تھا) پھر میرے دیکھتے دیکھتے یہ سنگِ مزار اور ایک قدیم درخت اور سمندر کا نظارہ جو میرے سامنے تھا اس طرح غائب ہو گئے جیسے دھوئیں کا ایک مرغولہ ہوا میں مل جائے! اور اس کے بعد میرے آس پاس تمام ایک اژدہام تھا جسے کوئی انسان نہیں گن سکتا۔ قومیں، زبانیں، سلطنتیں، لوگ، ہر زمانے کے لوگ ایک وسیع و عریض پنڈال میں جس کی وسعت آسمان کی وسعت کی مثال تھی اکٹھے ہو رہے تھے اور اوپر ہمارے بالمقابل سفید بادل کے ایک نورانی تخت پر خدائے بزرگ و برتر جلوہ گر تھا اور اُس کے آس پاس اُس کے فرشتوں،

کی فوجیں تھیں۔ میں نے عزرائیل کو اُس کی درشتی سے اور میکائیل کو اُس کی تلوار سے اور اُس عظیم الشان فرشتے کو جس نے سوتوں کو جگایا تھا اس ترنم سے پہچانا جو ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔

۳

ایک پست قد کا آدمی جو میرے پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا "کس قدر مستعد اور آمادہ ہے، تم نے کتاب والے فرشتے کو دیکھا، تامل و توقف کا شائبہ تک اُس کی صورت سے نمایاں نہیں۔

وہ اپنی لمبی گردن اٹھا اٹھا کر اور جُھکا جُھکا کر اُن تمام روحوں کا جائزہ لے رہا تھا جو ہمارے ارد گرد جمع تھیں "ہر شخص حاضر ہے" اُس نے کہا "ہر شخص، اور اب دیکھیں گے کہ . . . .

"ابنِ سینا وہ ہے۔ اور پرے . . . . . . دیکھتے ہو، وہ بلند و بالا قد کا معتبر سا آدمی جو خدا سے آنکھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے وہ ایک نواب ہے۔ لیکن یہاں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔

" وہ دیکھو خسرو ناشرِ کتب۔ مَیں ہمیشہ مالکانِ مطابع کی سخن سازیوں پر حیران ہُوا کیا ہوں خسرو ہوشیار آدمی تھا مگر ٹھیرو آج اُس کی ہوشیاری بھی معلوم ہوئی جاتی ہے۔

"آہا میں بہت کچھ دیکھ سکوں گا۔ لوگوں کے حشر کا میں بہت سا لطف اُٹھا سکوں گا۔ میرا نام حرفِ س سے شروع ہوتا ہے اور وہ سب کو ردیف وار بلائیں گے"

اُس نے بر سبیلِ استعجاب اپنے دانتوں کے نیچے سے ہوا اندر کھینچتے ہوئے کہا۔

"دیکھا؟ بعض تاریخی ہستیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ ہارون الرشید ہے۔ آہ، زبردست حساب کتاب ہوگا اوہ! یہ خبیث مقنع ہے"

اُس نے دھیمی آواز سے کہا "اس چھوکرے کی طرف دیکھو، جو ہمارے سامنے ہے جس کے بدن پر بال ہی بال ہیں۔ یہ ابنِ شعیر ہے، اسے جانتے ہو اور وہ پرے . . . . "

میں نے اُس کی باتوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی کیونکہ میں خداوندِ جل و علیٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

۴

"بس" خدائے بزرگ و برتر نے کہا۔

کتاب والے فرشتے نے ہم پر ایک نظر ڈالی اور ایسا معلوم ہُوا جیسے اِس ایک لمحہ میں اُس نے سب کو گن لیا ہے۔ اور پھر کہنے لگا۔

"بس اے خدا، بس۔ یہ ایک بہت ہی چھوٹا سیارہ تھا"

علیم وحکیم خدا کی نگاہ نے ہم سب کا جائزہ لیا۔

"اب شروع کیا جائے۔" خدائے قدیر کا ارشاد ہوا۔

۵

فرشتہ رکتاب نے کتاب کھولی اور ایک نام پڑھا۔ اس نام میں الف ہی الف تھے اور اُس کی آواز کی صدائے بازگشت دیر تک فضا کے بُعد ہائے بعید سے آتی رہی۔ مگر اس نام کو میں ٹھیک طور پر نہ سمجھ سکا۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ عین اُس وقت وہ پست قد آدمی جو میرے پہلو میں کھڑا تھا بول اُٹھا "وہ کیا ہے"؟

معاً ایک چھوٹا سا سیہ رو شخص خدا تعالیٰ کے قدموں میں ایک ہوا آمیز بادل پر اُٹھا لیا گیا۔ اُس کی صورت سے سختی نمایاں تھی۔ اُس نے بدیسی قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے، اُس کے سر پر تاج تھا اور وہ تیوری چڑھائے اکڑ کر کھڑا تھا

خدا نے نیچے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اچھا"!

جواب سننے کی ہمیں اجازت تھی اور سچ یہ ہے کہ اس جگہ کی باتیں بھی سننے کے قابل تھیں۔

بونے نے کہا "میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں"

خدا نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو بتاؤ تم دنیا میں کیا کیا کرتے رہے۔

اس نے کہا "میں ایک بادشاہ تھا، ایک عظیم الشان بادشاہ، اور میں نفس پرست، مغرور اور ظالم تھا۔ میں نے بارہا آتش جنگ مشتعل کی میں نے ملکوں کے ملک تباہ کر دیئے، میں نے محلات تعمیر کئے اور انسانوں کے خون سے گارے اور چونے کا کام لیا۔ اے خدا میرے خلاف گواہی دینے والوں کو سن۔ جو تجھ سے انتقام کا مطالبہ کر رہے ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں گواہوں کو" اُس نے اپنے ہاتھ سے ہماری طرف اشارہ کیا۔ اور میری سب سے بڑی سیاہ کاری! میں نے ایک پیغمبر کو گرفتار کیا۔۔۔ تیرے ایک پیغمبر کو۔ اور چونکہ وہ میرے آگے سربسجود نہ ہوا میں نے اُسے چار دن اور چار راتیں عذاب میں مبتلا رکھا جس کے بعد وہ مر گیا۔ میں نے اسی پر بس نہ کی، اے خدا میں نے تیری بے ادبی کی۔ میں نے تیری عزت کا لحاظ نہ کیا۔۔۔۔ میں نے تیری بجائے اپنی پرستش کرائی۔ کوئی بدی نہ ہوگی جسے میں نے نہ کیا ہو۔ اور آخر کار اے خدا تو نے مجھے موت دی۔ میں میدان جنگ میں قتل ہوا اور اب تیرے سامنے کھڑا ہوں۔ جہنم کے اسفل السافلین ہی جگہ پانے کے لئے کھڑا ہوں۔ تیری عظمت وشوکت کے آگے میری مجال نہیں کہ جھوٹ بولوں یا کوئی عذر تراشوں۔ میں نے اپنے ظلم وجور کی کہانی ساری نوع انسان کے روبرو تجھ سے کہہ دی ہے"!

وہ چپ ہو گیا۔ میں اُسکے چہرے کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس سے ہیبت غرور اور وقار ٹپک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے شیطان کا وہ نقشہ آگیا جو انگریز شاعر ملٹن نے اپنی ایک نظم میں کھینچا ہے۔

یکایک خداوند آگے کی جانب جھکا اور اُس نے اس شخص کو پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا جیسے وہ اُسے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔ خدا کی ہتھیلی کے درمیان میں وہ ایک چھوٹے سے سیاہ دھبے کی مانند معلوم ہو رہا تھا؟"

خدا نے پوچھا "کیا اُس نے دنیا میں یہی کچھ کیا تھا۔

اعمال نگار فرشتے نے کتاب اپنے ہاتھ سے کھولی۔ اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "قریبًا قریبًا"

اب جو میں نے اس شخص کو دیکھا تو اُس کے چہرے پر ایک عجیب تبدیلی نمایاں تھی۔ وہ اعمال نگار فرشتے کی طرف عجیب اندیشناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اضطراب کی حالت میں اُس کا ایک ہاتھ منہ کی طرف اٹھ گیا تھا اُس سے عجیب و غریب حرکات سرزد ہونے لگیں اُس کے مقابلے کا تمام وقار خاک میں مل گیا۔

خداوند تعالیٰ نے کہا "پڑھو"

اور فرشتے نے نہایت احتیاط اور تفصیل کے ساتھ ظالم شخص کے تمام ظلم بیان کرنے شروع کئے۔ ہمارے لئے یہ بالکل ایک دماغی ضیافت تھی۔ . . . .

۶

ہر شخص ہنس رہا تھا۔ یہاں تک کہ خدا کے جس پیغمبر کو اُس نے عذاب دے دے کر ہلاک کیا تھا اُس کے چہرے پر بھی تبسم تھا۔ کیونکہ اُس کی شکل ہی کچھ ایسی لغو اور مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔

فرشتے نے مسکرا کر کہا اور اُس کے تبسم نے ہمارے دلوں میں سننے کے شوق کو دوچند کر دیا۔ " اور پھر ایک دن جب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکنے کے بعد اُس کے مزاج میں کچھ تیزی سی پیدا ہو گئی تھی وہ . . . . "

ظالم آدمی نے چلا کر کہا "اس کے متعلق کچھ نہ کہو . . . . . . اس کا کسی کو علم نہیں"، پھر چیخ چیخ کر کہنے لگا یہ واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ میں بُرا تھا . . . . یقینًا میں برا تھا۔ میں بہت ہی بُرا تھا مگر یہ حماقت مجھ سے نہیں ہوئی . . . . . . ایسی ادنیٰ درجہ کی حماقت . . . . "

فرشتہ پڑھتا گیا۔

ظالم آدمی نے کہا "اے خدا! ان لوگوں کو اس واقعہ کا علم نہ ہونے دے۔ میں اپنے کئے پر پشیمان ہو جاؤں گا، میں تجھ سے معافی مانگ لوں گا"

وہ خداوند کے ہاتھ پر ناچنے لگا اور رونے لگا۔ یکایک شرم اُس پر چھا گئی۔ وہ دہشت زدہ ہو کر دوڑا اور خداوند کے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے سرے پر پہنچ کر چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہو گیا، مگر خداوند نے جلدی سے اپنی کلائی کو موڑ کر اُسے روک لیا۔ پھر وہ ہاتھ اور انگوٹھے کے درمیان جو خلا ہے اُس کی طرف دوڑا لیکن انگوٹھا بند ہو گیا۔ فرشتہ اس تمام

عرصہ میں پڑھتا گیا ... پڑھتا گیا۔ ظالم انسان خداوند کے ہاتھ پر کبھی اِدھر کبھی اُدھر دوڑتا رہا اور آخرکار بھاگ کر خدا کی آستین میں گھس گیا۔

میرا خیال تھا کہ خداوند اُسے وہاں سے نکال دے گا۔ مگر اُس کا رحم و کرم بے پایاں ہے۔

اعمال نگار فرشتہ خاموش ہوگیا۔

خدا نے کہا "آگے"، اور قبل اس کے کہ فرشتہ اگلے آدمی کا نام پکارے خدا کی ہتھیلی پر پھٹے ہوئے میلے کپڑوں میں ایک شخص نظر آیا۔

۷

میرے ساتھی نے کہا "کیا خدا کی آستین میں دوزخ ہے؟"

میں نے پوچھا "اچھا یہاں دوزخ بھی ہے؟"

اُس نے فرشتوں کے پاؤں کے درمیان سے جھانک کر کہا "بظاہر اس کی کوئی خاص نشانی تو نظر نہیں آتی"

"ہش" ایک عورت نے تیوری چڑھا کر کہا "اس مقدس آدمی کی بات سنو"

۸

مقدس آدمی نے کہا "وہ زمین کا بادشاہ تھا مگر میں آسمانوں کے خدا کا نبی تھا۔ اور تمام لوگ تیری نشانیوں کو دیکھ کر حیران تھے۔ اے خدا میں تیری بہشت کی عظمت و شوکت سے واقف تھا۔ کوئی درد نہ تھا، کوئی مصیبت نہ تھی جو مجھ پر نہ پڑی ہو۔ چھریوں سے میرے بدن کو زخمی کیا گیا، میری انگلیوں میں کیل ٹھونکے گئے۔ میرے گوشت کے پرخچے اڑائے گئے اور یہ سب تیری عزت و شان کے لئے ہوا، اے خدا!"

خداوند نے تبسم کیا۔

۹

خداوند نے کہا "اب کہ تم مجھ کو اور اپنی نوع میں سے ایک دوسرے کو پہلے کی بہ نسبت بہتر طریق پر سمجھنے لگے ہو، تمہیں موقع دیا جاتا ہے کہ تم ایک مرتبہ اور زندگی بسر کرو اور اُس زندگی میں نیکی کو اپنا شعار بناؤ۔"

پھر اُس نے ہمیں ایک ایسی سرزمین میں ڈال دیا جو سورج کی بجائے شعری یمانی کے گرد گھومتی تھی جو تمام کرۂ فلک میں کل ستاروں سے زیادہ بڑا اور زیادہ روشن ہے۔

اس کے بعد خدا اور اُس کے فرشتوں نے دوسری طرف رخ کیا اور یکایک نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

ایک لمحہ کے بعد عرش بھی نظروں سے غائب ہوگیا۔

میرے آس پاس ایک وسیع خوبصورت سرزمین پھیلی ہوئی تھی، ایسی خوبصورت جیسی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور میرے ارد گرد پاک صاف روحیں نئے اور اجلے اجسام میں ملبوس چل پھر رہی تھیں۔

(ترجمہ بہ تصرف)

منصور احمد

نغمۂ دلبرانہ

میں ہوں ترے پہلو میں اے میرے تماشائی
میں ہوں تری آنکھوں میں دیکھ لے مرے شیدائی

نظروں میں ہے میری بھی زیبا تجھے یکتائی
گر تیری نگہ میں ہے یکتا مری زیبائی

اُلفت ہے مجھے تجھ سے اُلفت ہے تجھے مجھ سے
میں تیری تمنائی تو میرا تمنائی

اُلفت یہ مری تیری اک پھول ہے عصمت کا
اچھے سے مرے دلبر پیارے سے مرے بھائی

مایوسِ محبت کو بتلاؤں کہ میری بھی
تیری ہی محبت میں امید نہ بر آئی؛

اِس طرح محبت ہو مستور نری جیسے
دنیا کی نظر سے دُور اک لالۂ صحرائی

دشوار تھا محفل میں اظہار محبت کا
آنسو کی طرح اُلفت آنکھوں ہی میں بھر آئی

راتوں کو نہ رویا کر موتی نہ پرویا کر
اُلفت کی تمنا کب دنیا ہی میں بر آئی

طاقت کا تقاضا ہے بیداد کا غوغا ہے
ممکن نہیں دنیا میں مظلوم کی شنوائی

مجھ کو تو بتا دینا مجھ سے نہ چھپا لینا
کیا بات تھی وہ مجھ میں جو تجھ کو پسند آئی

جاتی رہیں مدت سے طفلی کی امنگیں سب
شوخی کی ادا سے ہے عاری مری برنائی

بیدار ہوئی جب سے اک خواب سا ہے گویا
وہ حُسن کی خود بینی وہ شوقِ خود آرائی

دنیا مری سوئی تھی یہ راگ ہے پھر کیسا؟
کس نے یہ مرے دل میں پھر آگ سی بھڑکائی؟

کون آ کے یہ خلوت میں بیٹھا ہے خموشی سے؟
معمورِ محبت ہے مجھ کو مری تنہائی!

جی اُٹھنے کو ہیں جی میں مردہ تھیں جو امیدیں
حیراں مجھے کرتی ہے اُلفت کی مسیحائی!

قدرت کے تماشے ہیں اُلفت کے کرشمے بھی
گویا ہے جو خاموشی خاموش ہے گویائی

ہم راز ہے تُو میرا دم ساز ہے تُو میرا
اچھے سے مرے دلبر پیارے سے مرے بھائی

بہار

عادت

ہر قائم شدہ دماغی کیفیت ایک ڈالی ہوئی عادت ہے، اور اس کیفیت کا قیام خیال کے مسلسل اعادوں پر منحصر ہے۔ مردہ دلی اور زندہ دلی، جوش اور اطمینان، حرص اور فیاضی، غرض کہ قلب کی یہ تمام کیفیات، عادات ہیں جنہیں ہم خود اپنے لئے منتخب کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ خود بخود ہم سے سرزد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ خیال کو مسلسل اپنے دماغ میں جگہ دینے سے وہ عادت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور انہیں عادتوں سے زندگی کی تعمیر شروع ہوتی ہے۔

یہ نفس انسانی کی فطرت میں ہے کہ وہ اپنے تجربات کے اعادہ سے علم حاصل کرتا ہے۔ وہ خیال جسے پہلے پہل دماغ میں لانا اور پھر اُس پر عمل کرنا ایک نہایت مشکل امر معلوم ہوتا ہے آخر کار بار بار دل میں لانے سے ایک فطرتی اور عادتی حالت بن جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک لڑکا کوئی فن سیکھنے لگتا ہے تو ابتدا میں اوزاروں کا صحیح استعمال تو کجا وہ اُن کو درست طریق پر پکڑ بھی نہیں سکتا، مگر کچھ دیر کے اعادہ اور مشق سے وہ انہیں نہایت آسانی اور خوبی سے چلا لیتا ہے۔ یہی دل کی کیفیت ہے۔ وہ باتیں جو اول اول ہمارے خیال میں بھی نہیں آتیں آخر جب اُن کی تعمیر کی جائے تو سیرت میں ایک فطرتی اور طبعی کیفیت بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

قلب کی عادات اور کیفیات کو تشکیل در تشکیل دینے کی یہی وہ قوت ہے جس میں انسان کی نجات کا راز پوشیدہ ہے، جو کامل آزادی کا ایک کھلا ہوا دروازہ ہے، اور جو اُسے اپنے نفس پر حاکم بناتی ہے۔ کیونکہ جس طرح انسان میں نقصان دہ عادتیں ڈال لینے کی قوت موجود ہے اُسی طرح اس میں یہ قوت بھی موجود ہے کہ وہ بہترین عادتوں کی تخلیق کر سکے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نیکی سے بدی اور ثواب سے گناہ کرنا زیادہ آسان ہے۔ اس عقیدہ کو قریبًا قریبًا ساری دنیا مانتی ہے اور اُسے مسلمات کا درجہ دیتی ہے۔ اور جہاں تک انسانیتِ عام کا تعلق ہے یہ سچ بھی ہے مگر یہ صرف ایک گزشتنی تجربہ کی طرح صحیح ہے اور ارتقائے انسانی کے ایک رفتنی جزو کی طرح صحیح ہے۔ اس کو کوئی استحکام نہیں، کیونکہ صداقتِ ابدی کی اصل فطرت یہ نہیں۔ نیکی سے بدی اس لئے آسان معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں کی عقلوں پر لاعلمی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور اشیا کی حقیقت اور زندگی کی روح اور اُس کے معانی اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ جب ایک بچہ لکھنا سیکھنے لگتا ہے تو قلم کو غلط طریق پر پکڑنا اُس کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ لکھنا

تو اُس کے لئے نہایت آسان ہوتا ہے۔ مگر صحیح طور پر قلم پکڑنا اور صحیح طور پر لکھنا سخت ہی مشکل ہوتا ہے اور یہ محض اس لئے ہے کہ بچہ لکھنے کے فن سے ناواقف ہے۔ پھر اُس کی مسلسل کوشش اور مشق سے یہ مشکل جاتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار قلم کو صحیح طریق پر استعمال کرنا اور درست طور پر لکھنا اُس کے لئے ایک معمولی اور آسان کام ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی غلط انداز اختیار کرنا مشکل اور بالکل غیر ضروری بھی معلوم ہونے لگتا ہے یہی کلیہ قلب اور زندگی کے امور میں بھی صادق آتا ہے۔ صحیح بات سوچنے اور صحیح بات پر عمل کرنے کے لئے بہت سی مشق اور بہت سی کوشش درکار ہے۔ مگر وہ وقت بھی آتا ہے جب صحیح بات سوچنا اور اُس پر عمل کرنا عادت بن جاتا ہے اور آسان ہو جاتا ہے اور غلط بات سوچنا اور اُس پر عمل کرنا مشکل اور بالکل اور غیر ضروری نظر آنے لگتا ہے۔

بالکل اس طرح جیسے ایک کاریگر مشق کے ساتھ اپنے فن میں مہارت حاصل کر لیتا ہے، ایک انسان مشق ہی کے ساتھ نیکی اور خوبی میں ماہر ہو سکتا ہے۔ یہ صرف نئی عادتیں اختیار کرنے کا معاملہ ہے اور اُس کو جس کے لئے صحیح خیالات آسان اور فطرت بن گئے ہیں اور غلط خیالات اور افعال مشکل ہو گئے ہیں خوبی کا بہترین جوہر اور علم روحانی کی اصل معلوم ہو گئی ہے۔

لوگوں کو گناہ اس لئے آسان معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی مزاولت سے اپنے اندر نقصان دہ اور گھناونی عادتیں پیدا کر لی ہیں۔ چور کے لئے جب اُسے موقع ملے چوری سے رُکنا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ وہ مدتوں طمع اور لالچ کے خیالات کو پرورش کرتا رہا ہے مگر یہ مشکل کسی دیانت دار آدمی کو پیش نہیں آتی کیونکہ اُس نے مدتیں امانت اور دیانت کے خیالات میں گزار دی ہیں۔ اور چوری کے غلط، بے فائدہ اور بے ثمر ہونے کو اُس کے روشن ضمیر نے سمجھ لیا ہے۔ اُس کے دل میں چوری کا خیال بھولے سے بھی نہیں آتا۔ اسی اصول پر تمام بدیاں اور تمام نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غصہ اور بے صبری ہزاروں لوگوں کی فطرت بن چکا ہے، اسی لئے کہ وہ غصہ اور بے صبری کے خیالات اور اعمال کو پیہم دہراتے رہے ہیں اور ہر مرتبہ دہرانے سے اُن کی یہ عادت زیادہ مستحکم اور زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ صبر و ضبط بھی اسی طریقے سے طبیعت میں راسخ ہو سکتا ہے...... پہلے کوشش کے ساتھ صبر و ضبط کے خیال کو اپنے دماغ میں لاؤ، پھر مسلسل اُس پر غور کرو، اسی خیال میں بس جاؤ، یہاں تک کہ یہ تمہاری فطرت ثانی بن جائے اور غصہ اور بے صبری ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں۔ یہی طریقہ ہے جس سے ہر غلط خیال قلب سے دور کیا جا سکتا ہے، یہی طریقہ ہے جس سے ہر ناروا فعل کو تباہ کیا جا سکتا ہے، اور یہی طریقہ ہے جس سے ہر گناہ پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔

(ایلن)

منصور احمد

محفلِ ادب

یونیورسٹی کا فرض

پروفیسر الفریڈ زمرن Alfred Zimmern اپنے مضمون "یونیورسٹیاں اور بین الاقوامی تحریک" میں لکھتے ہیں:-

(یونیورسٹیاں دو مقاصد کے لئے ہیں جن میں سے پہلا مقصد تہذیبِ قومی ہے) میں کسی بین الاقوامی یونیورسٹی پر ایمان نہیں رکھتا۔ ایک معنی میں تو تمام بڑی یونیورسٹیاں بین الاقوامی ہیں کیونکہ وہاں مختلف قوموں کے طالبعلم پڑھتے ہیں۔ لیکن دراصل یونیورسٹی وہ تعلیم گاہ ہے جہاں انگریز صحیح معنوں میں اور زیادہ انگریز بن جائے۔ ایک جرمن زیادہ جرمن بن جائے۔ جہاں ادب اور فنونِ لطیفہ جو اُس قوم کی تہذیب میں بہترین ہوں پھلتے پھولتے ہیں۔ (دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ "قومیت" کی پرورش گاہیں ہیں اور اُس "شخصیت" کی جو قومیت کے اظہار سے پیدا ہوتی ہے)۔ قومیت" کے صرف یہی معنی ہیں کہ ہر شخصیت کو مکمل ترین فروغ دیا جائے۔ تاریخ کے سب سے بڑے شاعر اور آرٹسٹ بین الاقوامی اشخاص نہ تھے جو قومیت سے علیحدہ اور بلند تر ہوتے بلکہ وہ لوگ تھے جن کی شخصیت سے اُن کی اپنی قومیت اور اپنے ملک کے مخصوص جوہر کا اظہار ہوتا تھا۔ بے رنگ قومیت ہی تہذیب کا عنصر وقت پیدا کرتا ہے۔ اگر سب لوگ ایک سے ہوتے، اگر شیکسپیئر کا سمجھنا ایک فرانسیسی کے لئے بھی ایسا ہی آسان ہوتا جیسا ایک انگریز کے لئے تو کتنی آسانی ہوتی۔ اسی طرح اگر ہم سب بے جان ہوتے تو کتنی سہولت ہوتی! کوشش کی کمی سے تمام مسائل طے ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے یونیورسٹیوں کا مقصدِ اول۔ قومیت کی مکمل ترین اور عمدہ ترین تربیت کے لئے ایک ذریعہ ہونا۔ اور جس قدر زیادہ ہم قومیت کو اپنی مخصوص تہذیب کا ہم معنی سمجھیں گے اُسی قدر لوگ اس کے لئے کم جنگ و جدل کریں گے اور وہ غیر سیاسی سمجھی جائے گی۔ قومی شخصیت کا ارتقا ادب اور موسیقی اور فنونِ لطیفہ میں ہوتا ہے نہ کہ تجارتی اعداد و شمار کی ترقی اور جھنڈے ہلانے میں!

{یونیورسٹی کا دوسرا بڑا کام یہ ہے کہ وہ مل جل کر تمام شعبوں میں تلاشِ حق کرے اور اسی سلسلہ میں اُن بین الاقوامی مسائل کے متعلق تلاشِ حق کرے جو ہمارے لئے اس قدر پریشان کن ہیں۔ لیکن اس کی تلاش میں ہمیں صرف عالمِ خارجی ہی پر نظر نہ ڈالنی چاہئے بلکہ بالخصوص اس عالمِ داخلی پر جو انسانی سوچ کی دنیا ہے ہمیں سائنس کے ضبط اور حق پرستی کو نفسیات اور مختلف قوموں کے طبائع، سیرت اور فلسفۂ زندگی کے مطالعہ میں استعمال کرنا چاہئے ہمیں کبھی عقلِ سلیم سے خوف زدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہی چیز دراصل انسان اور بہائم میں مابہ الامتیاز رہے} بعض نام نہاد فلسفیوں کی تعلیم ہے،

کہ ہیجان ہی سب سے زیادہ اہم چیز ہے لیکن عقل ہیجان سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے کیونکہ ہیجان بھی اس میں شامل ہے ۔۔۔۔ جذبات جو عقل کے تابع نہیں ہوتے بہت آسانی سے تباہی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی امید کو عقل انسانی کی کوشش اور استقلال سے وابستہ رکھنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا بحیثیت طالب علموں کے یہ کام ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں جو گزشتہ نسل حل نہیں کر سکی۔ ہم زیادہ امیدوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ باوجود ہر قسم کی مشکلات کے جنگ نے بہت کچھ کوڑا کرکٹ دور کر دیا ہے اور لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ دنیا کے نصف لوگ ایسے ہیں جن کی عادتیں جنگ سے پہلے پختہ ہو چکی ہیں اور وہ اب نہیں بدل سکتیں۔ لیکن ہمارے نوجوان طلبا اتنے نو عمر ہیں اور اتنے پختہ عمر بھی کہ یہ سمجھ سکیں کہ مختلف نسلوں اور تہذیبوں کے امتزاج اور ربط سے نہایت مہتم بالشان مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور یہ یقین رکھیں کہ انسان ہی کی وجہ سے وہ پیدا ہوئے ہیں اور وہی اُن کو حل کر سکتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ وہ اُس قوت سے منسلک رہیں جو انسانی بھی ہے اور الٰہی بھی۔ یعنی قوتِ عقل جب وہ محبت اور ہمدردی کے دوش بدوش کام کرے۔)

”تعلیم و تربیت“

ستارۂ صبح

(۱)

عجیب کیف سے لبریز ہے طلوعِ سحر
غریقِ نورِ ازل کائنات کا منظر

فضائے ارض و سما میں عجیب مستی ہے
شراب میکدۂ خلد سے برستی ہے

تو ایک کاسۂ زریں ہے اے ستارۂ صبح
فروغِ بادۂ تسکیں ہے اے ستارۂ صبح

تو جلوہ گاہِ بہارِ جمالِ یزداں ہے
تو بارگاہِ کریم و رحیم و رحماں ہے

یہیں سے صبحِ تجلیٰ ظہور کرتی ہے
شبِ گناہ کو فردوسِ نور کرتی ہے

یہیں سے لذتِ ایماں نصیب ہوتی ہے
یہیں سے مستیٔ عرفاں نصیب ہوتی ہے

یہیں سے قلب پہ ہوتی ہے بارشِ انوار
یہیں سے روح بھی ہوتی ہے محرمِ اسرار

یہ حسن روح کو ایسا گداز کرتا ہے
خدا سے بندے کو سرگرمِ راز کرتا ہے

(۲)

غریقِ ظلمتِ طوفانِ بحرِ عصیاں تھا
رہینِ کفر تھا محرومِ نورِ ایماں تھا

شبابِ توبہ شکن کی طلسم کاری تھی
کہ دل پہ مستیٔ خوابِ گناہ طاری تھی

وہ مستیاں کہ ہر اک شے سے مے برستی تھی
غریقِ بادۂ رنگیں خدا کی ہستی تھی

شہیدِ خواب کو بیدار کر دیا تو نے
فروغِ مطلعِ انوار کر دیا تو نے

تو ایک جامِ مسرت ہے اے ستارۂ صبح
پیامِ روحِ محبت ہے اے ستارۂ صبح

ترے پیام کی تائید کر رہا ہوں میں
وفا کے عہد کی تجدید کر رہا ہوں میں

غریقِ قعرِ مذلت تھا سربلند ہوں میں
کہ بارگاہِ ازل میں نیازمند ہوں میں

خوشا نصیب سحر خیز ہو گیا میں بھی
تجلیات سے لبریز ہو گیا میں بھی

اثرؔ صہبائی — "نور جہاں"

بھیک

ایک بڑے شہر کے قریب شاہراہ پر ایک بیمار بوڑھا چلا جا رہا تھا اُس کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ دبلے پتلے پیر ٹھوکریں کھا کھا کر، لڑکھڑا لڑکھڑا کر بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے یہ اپنی خوشی سے نہ چل رہا ہو۔ بلکہ کسی کے حکم کا بندہ ہو۔ لباس تار تار تھا، کچھ چیتھڑے بدن پر لٹک رہے تھے، سر کھلا ہوا اور سینہ پر جھکا ہوا، بدن کی طاقت جواب دے رہی تھی۔

راہ میں ایک پتھر تھا، اُس پر بیٹھ گیا۔ آگے کو جھکا، کہنی کا سہارا لیا، اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ اُس کی سوکھی، ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کے بیچ میں سے آنسو بہنا شروع ہوئے اور خشک زمین پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ یہ اپنے گئے دن یاد کر رہا تھا۔

اُسے یاد آ رہا تھا کہ کبھی میں بھی تندرست تھا، مالدار تھا۔ پھر کیسے تندرستی ہاتھ سے گئی دوسروں پر، اچھے برے دوستوں پر، کیسے اپنی دولت لٹائی؛ اور اب کھانے کو روٹی کا ایک ٹکڑا نہیں۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ دشمنوں سے پہلے دوستوں نے۔ کیا اب یہ نوبت بھی آئے گی، یہ ذلت بھی سہنی پڑے گی کہ ہاتھ پھیلاؤں، بھیک مانگوں یہ سوچتا تھا اور اُس کے دل میں کبھی تلخی پیدا ہوتی تھی کبھی شرم لیکن آنسو تھے کہ بہہ بہہ کر زمین پر ٹپکے جا رہے تھے۔

یکایک ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے نام لے کر اُسے پکارا۔ اُس نے اپنا ماندہ سر اُٹھایا اور سامنے دیکھا تو ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔

اجنبی کا چہرہ نہایت متین اور باوقار تھا لیکن اُس میں سختی اور درشتی ذرا نہ تھی۔ آنکھیں بہت چمکتی تو نہ تھیں لیکن صاف تھیں نظر گہری جاتی تھی مگر اُس میں عیاری نہ تھی۔

تونے اپنی دولت اوروں کو دے ڈالی اُس نے نہایت نرم آواز سے کہا "کیوں اب اپنی خیرات پر پچھتاتا ہے؟"
"نہیں میں نہیں پچھتاتا" بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "چاہے اس وقت بھوک سے میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے، میں نہیں پچھتاتا۔ بالکل نہیں پچھتاتا"

اجنبی بولا "اچھا اگر دنیا میں حاجت مند ہی نہ ہوتے جو تیرے سامنے دستِ سوال دراز کرتے، کسی کو اگر تیری خیرات کی ضرورت ہی نہ ہوتی، تو پھر تو کیسے یہ خیرات کرتا اور نیکی کماتا؟"

بڈھے نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا۔

"تو پھر غریب بھکاری، تو بھی اس وقت اتنا غرور نہ کر۔ اٹھ اور ہاتھ پھیلا۔ دوسرے نیک آدمیوں کو بھی موقع دے کہ وہ عمل سے اپنی نیکی کا ثبوت دیں"

بڈھا اُٹھا، اِدھر اُدھر دیکھا ۔ ۔ ۔ اجنبی غائب ہو چکا تھا لیکن دُور فاصلہ پر ایک راہگیر دکھائی دیا۔

بڈھا اُس کی جانب بڑھا اور اپنا ہاتھ اُس کی طرف پھیلایا۔ راہگیر نے نہایت خشونت سے آنکھیں پھیر لیں اور اُسے کچھ نہ دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور راہگیر گزرا اور اُس نے غریب بڈھے کو کچھ بھیک دی۔

بھیک کے پیسے سے بڈھے نے روٹی خریدی اور بھیک کا یہ ٹکڑا کیسا مزے کا تھا! اُس کے دل پر شرم کی تکلیف بالکل نہ تھی بلکہ اس کے برعکس اُس پر ایک عجیب طرح کی خاموش اور پرسکون مسرت طاری ہو چکی تھی۔

ترجعنیو ۔۔۔۔۔ "جامعہ"

اندھی لڑکی

اندھی لڑکی نے ماں کی انگلی چھوڑ دی اور باغ میں ایک جگہ بیٹھ گئی! پھر اِدھر اُدھر کان لگا کر اُس نے یہ اطمینان کر کے کہ کوئی سن تو نہیں رہا اپنے ہاتھ دعائیہ انداز میں اُٹھائے، اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔

"میرے اللہ میاں! امی جان کہتی ہیں کہ تم نے سورج بنایا ہے، جو اپنی روشنی سے ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے، چاند اور ستارے بنائے ہیں جو اندھیری راتوں میں دن کی طرح اجالا کر دیتے ہیں!

"امی جان کہتی ہیں کہ تم نے طرح طرح کے رنگارنگ پھول کھلائے ہیں، جو اپنی رنگ اور خوشبو سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں طراوت، اور دل میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں!

"امی جان، یہ بھی کہتی ہیں کہ تم نے بڑے بڑے پہاڑ، دریا، سمندر اور جنگل بنائے ہیں جن کو دیکھ کر تمہاری قدرت یاد آتی ہے!

میرے اللہ میاں! تم نے جو مجھے ان چیزوں کے دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں دی ہیں تو میں ان (ا ک دو ر)

اور اُن میں سے کسی چیز کو دیکھنا نہیں چاہتی مگر میرا دل چاہتا تھا کہ کم سے کم اپنی امی جان کو

تبصرہ

حفظ العلوم کے نام سے اردو زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا لاہور میں مرتب ہو رہی ہے۔ اور اس عظیم الشان کام کو صرف ایک شخص نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ ہماری مراد مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سے ہے جو نہایت خاموش کام کرنے والے آدمی ہیں۔ حفظ العلوم ابھی نامکمل حالت میں ہے مگر جتنا مواد جمع ہو چکا ہے اس کے مسودات کی جلدیں اتنی ہیں کہ شاید چھ بڑی بڑی الماریوں میں سمائیں۔ ہم نے ان مسودات کو بذات خود دیکھا ہے جہاں ان میں عمدہ اور پُر از معلومات مضامین موجود ہیں وہاں بہت سی غیر ضروری اور ادنیٰ درجہ کی چیزیں بھی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب موصوف ہمیں یقین دلاتے ہیں اشاعت کے وقت تمام مضامین پر ایک بورڈ نظر ثانی کریگا اور اس طرح رطب و یابس الگ الگ ہو جائیں گے۔ ہمیں خوشی ہے کہ زبان اردو میں انسائیکلوپیڈیا کی طرف بھی پنجاب ہی نے سب سے پہلے قدم اُٹھایا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب علمی و عملی امداد کے مستحق ہیں۔ مولوی صاحب کا دفتر محلہ حفظ العلوم، انارکلی لاہور میں واقع ہے۔

سعد زا غلول پاشا۔ مرحوم مصری رہنما کی مختصر سوانح عمری ہے واقعات ولولہ انگیز اور دلچسپ ہیں اور زبان صاف اور سلیس ہے۔ اخیر میں مرحوم کے اقوال بھی درج ہیں آرٹ کاغذ کے سرورق پر سعد زا غلول پاشا کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ حجم ۶۴ صفحے اور قیمت چھ آنے ہے۔ تاریخی کتب خانہ لاہور سے طلب فرمائیے۔

گُلِ صد برگ۔ مولانا محمد یوسف صاحب جعفری رنجور کی رباعیات کا مجموعہ ہے جن میں سے عموماً حکمت و موعظت اور اصلاح و تہذیب کے متعلق ہیں۔ اوضاع و اطوارِ زمانہ اور نام نہاد رہنماؤں کی مخالفت کی گئی ہے قیمت چھ آنے مقرر ہے۔ ملنے کا پتہ۔ محمد حسان صاحب جعفری گلزار باغ پٹنہ

انتخابِ غالب۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے خطوط، لطائف، اشعار اور نقلوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس کو انہوں نے خود مرتب کیا تھا اور جو اب تک طبع نہیں ہوا۔ محمد عبد الرزاق صاحب ایچ سی ایس مددگار صدر محاسب سرکار عالی حکومتِ آصفیہ نے بہ تحشیہ و مقدمہ شائع کیا ہے۔ قیمت تین آنے ہے حسن الدین صاحب مکان نمبر ۶۱۰ ۳ عبد الرزاق کا باغ۔ حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

تشریح الاوزان۔ ایک نہایت ہی مفید تالیف ہے جس میں عربی فارسی ڈاکٹری ویدک یونانی ہندی وغیرہ اوزان اور پیمانوں کو یک جا جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک جلد ہر شخص کے پاس موجود رہنی چاہیے۔ ملنے کا پتہ:۔ ایس، اے احمد اینڈ کمپنی۔ جامع مسجد۔ جبل پور (ممالکِ متوسط)